رجسٹرڈ نمبر اے ۷۸۱ جولائی سنہ ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہوچکے ہین، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں۔ اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصے میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعلق متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھران معجزات کی تفصیل ہے جو روایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان ۃ، تقطیع خورد صہ و ۃ، حصہ سوم تقطیع کلان سے، للعہ، تقطیع خورد صہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلان عہ، و سے، تقطیع خورد عہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ، للعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

[illegible]

جولائی ۱۹۳۸ء تا دسمبر ۱۹۳۸ء

مُرتبہ

سید سلیمان، ندوی،

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۴۲

جولائی تا دسمبر ۱۹۳۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین

جلد ۴۲

جولائی تا دسمبر ۱۹۳۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۴۲	ماہ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۸ء	عدد ۱

مضامین

فِی الآخِرَۃِ حَسَنَۃ، کہ کر دونوں کی بھلائیوں کا طلبگار رہی، ملکی آزادی کی پوری جدوجہد کے ساتھ اسکو اپنے دین وملت کے ساتھ بھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبت ہی، اوراسی کی خاطر وہ ہر کام کرتا ہے، اگر واقعی طلبگار آزادی مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں تو اُن کو اٹھ کر اپنا خاکہ اسی طرح پیش کرنا چاہئے جس طرح کانگرسی وزارتیں کر رہی ہیں، اور جیسے یہ آزاد حکومتیں اپنی سیاسی تجویزوں کو عمل میں لا رہی ہیں، آزاد مذہبی مسلمان بھی اپنے خاکہ کو مسلمانوں کے لئے عمل میں لانے کی کوشش کریں، بلکہ کیا اچھا ہو کہ اسلامی صوبوں کی وزارتیں دارالقضاء اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں اور ان کو عمل میں لائیں، تاکہ اس باب میں غیر اسلامی صوبے بھی اُن کے نقش قدم پر چل سکیں،

انگریزی خواں علما کی ضرورت روز بروز جیسی بڑھ رہی ہے وہ تو معلوم ہے، لیکن مشکل یہ ہو کہ علما انگریزی خواں ہونے کے بعد علما نہیں رہتے، ایک گریجوایٹ ڈاکٹر پی ایچ ڈی عالم و فاضل مشرقی کو جو بحمد اللہ پرانی عربی درسگاہ کے سند یافتہ بھی ہیں ہیٹ اور انگریزی لباس پر ٹوکا تو جواب ارشاد ہوا کہ اس کے بغیر رعب نہیں بیٹھتا، پوچھنے کو جی چاہا کہ آپ کی فرنگیت کا یا آپ کی علمیت کا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ہماری ہی مرعوبیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے عالم انگریزی پڑھ کر عالم نہیں رہتے بلکہ اس نسبت کو اپنے لئے تحقیر اور اپنے حق میں توہین سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ یہ اعزاز، یہ تنخواہ اور یہ بلند کرسی اسی کے بدولت پا رہے ہیں،

بہرحال بات کہنی کچھ تھی، اور کہہ کچھ گئی، ایک اسلامی ریاست کو تین ایسے انگریزی داں علماء کی ضرورت ہے جو تبلیغ و اصلاح کا کام کر سکیں، تنخواہ ستر روپیے ملے گی، اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو دلی ولولہ کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکیں جنھوں نے یہ کام کیا ہو یا ان میں کرنے کی اہلیت ہو، وہ درخواستیں ہمارے پاس بھیج دیں،

مقالات

اسلامی نظام تعلیم

از مولینا سید ریاست علی ندوی

(۶)

حلقۂ درس

اساتذہ کا ورود حلقۂ درس میں

اسلامی عہد کے درس کے حلقوں (کلاسس) کا نظارہ ذیل کے بیان سے ہوگا جسے قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ وطلبہ کے آداب میں بیان کیا ہے، اساتذہ درس کے حلقہ میں جانے کے لئے اہتمام کرتے تھے، جیسے حلقہ میں صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر آتے تھے، امام مالک کا یہ معمول تھا کہ وہ جب حلقہ میں جانیکا تہیہ فرماتے تو پہلے غسل کرتے پھر اچھے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، اس کے بعد درس کے حلقہ میں تشریف لیجاتے،

اساتذہ روانگی سی پہلے خیر و برکت حاصل کرنے اور ضلالت اور گمراہی سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دعاے ماثورہ پڑھتے تھے اللھم انی اعوذبک ان اضل او اضل او ازل او ازل او اظلم او اظلم او اجھل او یجھل علی (ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۲۰۸)

پھر ذکر الٰہی کرتے ہوے درس کی مجلس میں آتے، اور مجلس کے حاضرین کو سلام کرتے، یہاں پہنچکر اگر کوئی مکروہ وقت نہ ہوتا، تو دو رکعتین نماز پڑھتے اور نماز کے بعد خشوع وخضوع سے توفیق خداوندی حاصل کرنے اور لغزشوں سے بچنے کی دعا کرتے اس کے بعد قبلہ کی طرف منہ کرکے مجلس کیسامنے بیٹھ جاتے،

اساتذہ کا طریق نشست، اساتذہ درس کے حلقہ میں جیسا کہ اوپر گذرا کسی اونچے مقام کرسی یا منبر پر بیٹھتے تھے، بعض لوگ جو مسجد کے صحن میں درس دیتے تھے، وہ کسی نیچی دیوار پر یا کسی مینار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے

سے تھے، اور بیٹھنے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرتے تھے، جو اہل علم کی نشست کے وقار کے خلاف ہو،

غیر سنجیدہ حرکتوں سے اجتناب

حلقہ میں غیر سنجیدہ حرکتوں سے باز رہتے تھے، ہنسی مذاق یا مزاح نہ کرتے تھے[۱]

سالم بن جنادہ حضرت وکیع بن جراح متوفی ۱۹۷ھ کے متعلق کہتے ہیں:-

"میں وکیع کی معیت میں سات سال تک بیٹھا، لیکن میں نے انھیں نہ کبھی تھوکتے دیکھا، نہ کسی کنکری سے کھیلتے ہوئے پایا، وہ جس نشست سے بیٹھتے، پھر پہلو نہ بدلتے تھے، وہ ہمیشہ قبلہ رو ہو کر بیٹھا کرتے تھے"[۲]

آغاز درس

درس کا آغاز کسی خوش الحان قاری کی تلاوت قرآن سے کیا جاتا تھا، اس کے بعد "مستملی" و نقیب" اہل مجلس کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے، اس کے بعد سب سے پہلے شیوخ بسملہ پڑھکر صلوٰۃ اور سلام بھیجتے، پھر وہ اور تمام حاضرین دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے، اس کے بعد استعاذہ، بسملہ اور حمد و صلوٰۃ نئے سرے سے پڑھکر درس کی تقریر جاری کرتے تھے[۳]

درس و افہام و تفہیم کا طریقہ

درس میں آواز نہ زیادہ بلند ہوتی، اور نہ زیادہ پست، بلکہ اتنی ہوتی کہ مجلس کے حاضرین اُسے آسانی سے سن سکیں، اور آواز مجلس کے باہر نہ جانے پائے، مسائل کو ذہن نشین کرانے کے لئے عموماً جملوں کو تین مرتبہ دہراتے تھے، درس کے درمیان جہاں مسلسل بیان کی ضرورت ہوتی، تقریر مسلسل جاری رکھتے، جہاں امتیاز پیدا کرنا ہوتا، تو ٹھہر جاتے، اور جب گفتگو منقطع کرنے کی ضرورت ہوتی، منقطع کر دیتے، اثنائے تقریر میں اگر اسلام کے خلاف کوئی شبہہ وارد ہوتا، تو اسے بیان کرتے، مگر یہ پابندی رکھتے، کہ اس کا جواب بھی اسی مجلس میں شبہہ پیش کرنے کے بعد ہی بیان کر دیں، اور اگر جواب دینے کا موقع نہ ہوتا تو شبہہ کی تفصیل اور دلیل بیان کرنے کے بجائے صرف اشارہ کرکے تقریر ختم کر دیتے، اور اسکی تفصیل اور جواب کو دوسرے دن کے لئے اٹھا رکھتے تھے،

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۳۱، ۳۲، [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۲۸۳، [۳] تذکرۃ السامع ص ۳۴، ۳۵،

درس کی تقریر نہ اتنی طویل ہوتی، کہ غیر ضروری باتیں چھڑ جائیں، اور نہ اس قدر مختصر، کہ طالبوں کی تشفی نہ ہو سکے[۵]، اساتذہ درس کے اثنا میں طالب علموں سے حسن تلطف سے پیش آتے تھے، مسائل کو ان کی سمجھ کے مطابق آسان کر کے بیان کرتے تھے، اور مسائل کی تمثیلات سے تشریح کرتے تھے[۲]، اور لوگوں کے سوالوں کا جواب علٰحدہ علٰحدہ دیتے تھے، اگر استاذ کوئی مسئلہ کسی کو سمجھاتا، اور گفتگو کے درمیان کوئی دوسرا طالب علم کوئی شبہہ پیش کرتا، تو گفتگو چھوڑ کر شبہہ پیش کرنے والے کو تسلی دیتے، کہ پہلے وہ اس شخص کی گفتگو ختم کر لیں تو اس کے شبہہ کو دور کریں گے، ارزیع کہتے ہیں کہ امام شافعی کا بھی یہی طرز عمل تھا[۳]، اور اگر کوئی شخص غیر ضروری رد وکد کرتا، تو اسے تنبیہ کیجاتی تھی[۴]، جو لڑکے کچھ کہنا چاہتے، اور مفہوم ادا نہ کر سکتے تو استاد ان کی مدد کرتا، اور خاص توجہ سے ان کا مافی الضمیر معلوم کر کے ان کی تشفی کرتا[۵]،

آزمائشی سوالات اور اثنائے درس میں طلبہ کی استعداد کا امتحان

اساتذہ درس کے درمیان طالب علموں سے آزمائشی سوالات کرتے تھے، اگر جواب مشکل ہوتا تو طلبہ کو ایک ایک ہفتہ تک کی مہلت دیجاتی تھی، کہ اس درمیان میں تیار ہو کر اس سوال کو حل کریں[۶]،

کبھی دوسرے طریقوں سے طالب علموں کی استعداد کا امتحان لیا جاتا تھا، ابن ابی حاتم یہ واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ وہ ایک جماعت کے ساتھ مشہور محدث محمد بن مصعب عرقسانی کے یہاں حدیث سننے کے لئے پہونچے، شیخ نے مکان سے برآمد ہو کر کہا ابھی ایک شعر زبان پر آگیا ہے، اگر تم میں سے کوئی بتا دے، کہ یہ کس کا شعر ہے تو میں تین حدیثیں سناؤں گا، اس کے بعد شیخ نے وہ شعر پڑھا، ایک عراقی طالب علم نے آگے بڑھ کر اس شاعر کا نام بتایا، شیخ نے

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۳۶ تا ۳۹، [۲] ص ۵۱، ۵۲، [۳] ص ۴۰، [۴] ص ۴۱، [۵] ص ۴۲، [۶] ص ۵۳،

اسکی تصدیق کی، اور پوچھا اس کے بعد کونسا شعر ہے، طالب علم نے اس کے بعد کا دوسرا شعر سنایا، شیخ یہ سن کر خوش ہوئے، اور شعر و ادب میں امتحان لینے کے بعد حسب وعدہ ۶ حدیثیں انھیں سنائیں[1] نیز طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، اساتذہ ان میں سے بھی کبھی کوئی چیز کسی طالب علم سے امتحان کے طور پر پوچھ لیا کرتے، اور صحیح جوابوں پر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے[2]

اگر کبھی طالب علم کے جواب سے خوشی ہوتی، اور اسکی کوئی ادا پسند آجاتی، تو اساتذہ طالبعلمون کو انعام بھی دیتے تھے، ابو عبید کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد کے پاس امام شافعی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاضر تھے، امام محمد نے ان سے کوئی سوال کیا، امام شافعی نے اسکا جواب دیا، اور جب امام محمدؒ نے اس جواب کی تصدیق فرمائی، تو امام شافعی نے اسے لکھ لیا، امام محمد کو امام شافعی کا یہ شوق علم پسند آیا، اور خوش ہو کر سو درہم عطا کئے، اور فرمایا کہ تم پابندی سے آیا کرو، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے ایک اونٹ کے بوجھ کی مقدار میں لکھا ہے[3]

پردیسی طلبہ پر شفقت اساتذہ اپنے درس کے حلقہ میں پردیسی طلبہ پر خاص شفقت کی نظر کرتے تھے، مجلس میں ان سے رعب دور کرنے اور ان کی دلدہی کے لئے ان سے مسلسل گفتگو کرتے اور رفتہ رفتہ وہ اجنبی طالب علم اپنے استاذ کی شفقت کے سایہ میں دوسرے ہم جماعت دوستون سے گھل مل جاتے تھے،[4] اور اساتذہ کو حلقہ کے ہر طالب علم کے نام النسب، وطن اور ضروری حالات سے باخبر رہنے کی تلقین کیجاتی تھی،[5]

حلقۂ درس میں معاصر علما کی شرکت اور اساتذہ کا برتاؤ انکے ساتھ جیسا کہ اوپر گذر چکا، درس کے حلقہ میں شاگردون کے علاوہ استاد کے ہمعصر علما بھی کبھی شرکت کرتے تھے، اور انھیں حق حاصل تھا، کہ وہ استاذ کی تقریر پر اپنے علم اور ادراک کے مطابق اعتراضات کرین، یا کسی مسئلہ میں استاذ کی رائے سے

۱؎ مختصر جامع بیان العلم ص۵۸ ۲؎ تذکرة السامع ص ۵۱، ۴۵، ۳؎ مفتاح السعادة جلد ۲ ص۱۰۹ ۴؎ تذکرة السامع ص۴۶ ۵؎ ص۶۱

اتفاق نہ ہو تو دلائل سے اس کا رد کریں،

اساتذہ بڑی خوشی سے اپنے درس کے حلقہ میں ان معاصرین کا استقبال کرتے، اوران کے شبہوں اوراعتراضوں کے جوابات دیتے تھے، جب استاذ کسی عالم یا فقیہ کو اپنے حلقہ میں آتے دیکھتا، تو اس کی آمد کے انتظار میں اپنی تقریر روک دیتا تھا، جب وہ آکر بیٹھ جاتا، تو اس مسلسل تقریر کے پچھلے حصہ کے ضروری جزوں کو نئے سرے سے اجمال کے ساتھ بیان کرکے پھر اپنی تقریر آگے جاری کرتا، اگر آنے والا کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب دیتا، اور اگر اس کا جواب اس کے علم میں نہ ہوتا، تو کج بحثی کرنے کے بجائے بلا تکلف اپنی لاعلمی ظاہر کرتا، اور آنے والا اس مسئلہ پر جو کچھ بیان کرنا چاہتا، بیان کرتا، معلوں کا "لاادری" (میں نہیں جانتا) "ولا اعلم" (مجھے معلوم نہیں) کہنا انکی کم علمی کے بجائے عالی ظرفی پر محمول کیا جاتا تھا[۱]،

اگر ان مجلسوں میں ایک سے زیادہ اہل علم جمع ہوتے، تو ایک دوسرے کے علم کا احترام کرتے تھے، امام اوزاعی سے ابو محمد سعید بن عبدالعزیز کی موجودگی میں اگر کوئی سوال کیا جاتا تھا تو فرماتے کہ "ابو محمد سے پوچھو"[۲]

ترتیب حلقہ استاذ کی بلند کرسی کے دائیں بائیں اگر ضرورت ہوتی، تو مستملی اور معید کھڑے رہتے سامنے کی نشست پر آگے ممتاز علماء بیٹھتے، ان کے پیچھے اور دائیں بائیں شاگرد بیٹھتے تھے، ورنہ اگر موقع ہوتا، تو طالب علم عموماً ایک ہی رخ پر بیٹھتے تھے، تاکہ استاذ کی توجہ ایک سمت پر مبذول رہے[۳]،

قرأت کی باری جب حلقہ میں کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، تو قرأت کی باری اس طالب علم کی ہوتی تھی، جو درجہ میں پہلے آتا تھا، خواہ آنے والا اس مدرسہ کا طالبعلم بھی نہ ہو، اگر دو طالب علم

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۲۴ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۲۰۳ [۳] تذکرۃ السامع ص ۱۳۱، ۱۵۰، ۱۵۱،

ساتھ آتے تو ان میں قرعہ ڈال کر فیصلہ کیا جاتا تھا، پہلے آنے والے کا یہ حق اخلاقی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، اگر وہ کسی ضرورت سے حلقہ سے اٹھ جانے پر مجبور ہوتا، تو اس کا حق زائل نہ ہوتا تھا، وہ واپس آکر پھر اپنی قرأت جاری کرتا تھا،

البتہ اگر کوئی خاص وقت حلقہ کے مستقل طلبہ کے لئے مقرر کر دیا جاتا تو اس میں اجنبیوں کو یہ اجازت حاصل نہ ہوتی تھی،[1]

آداب درس | طالب علموں کے لئے درس کے حلقہ میں شریک ہونے کیلئے چند لوازم تھے، جن کی پابندی کرائی جاتی تھی، جیسے حلقہ میں استاذ سے پہلے حاضر ہو جائیں، کیونکہ شاگردوں کو استادوں کے آنے کا انتظار کرنا چاہئے، نہ کہ استادوں کو لڑکوں کے آنے کا منتظر بنایا جائے۔

حلقہ میں اچھے، صاف ستھرے اور سنجیدہ لباس پہن کر آئیں، شیخ ابو عمرو بن صلاح اس طالب علم کو حلقہ میں بیٹھنے سے روک دیتے تھے، جو عمامہ کے بغیر ٹوپی پہن کر آتا تھا،

طالب علم اپنی کتابیں حلقہ میں کسی اونچی چیز جیسے رحل پر رکھیں ورنہ ہاتھوں میں لئے رہیں،

کسی طالب علم سے اگر کوئی خلاف ادب بات سرزد ہوتی، تو سوائے استاد کے کسی دوسرے کو ٹوکنے کی اجازت نہ تھی،

پھر حلقۂ درس میں وہ تمام آداب برتے جاتے تھے، جو معاشرتی مجلسوں میں ملحوظ رکھے جاتے تھے، مثلاً جب حلقہ میں پہونچتے، تو بلند آواز سے حاضرین کو سلام کرتے، حاضرین ایک دوسرے سے احترام سے پیش آتے تھے، ایک دوسرے کی تعظیم کرنے میں سبقت کرتے تھے، کسی کے آگے یا دو آدمی کے بیچ میں بیٹھنے سے احتراز کرتے تھے، جب کوئی حلقہ میں آتا، تو خندہ جبینی سے اس کا استقبال کرتے، کسی دوسرے کی قرأت کے درمیان اُسے ٹوکتے نہ تھے، اگر درس کے اثناء میں کسی سے گفتگو کرنی ہوتی تو

[1] تذکرۃ السامع ص ۹۰

استاذ سے اجازت لینے تھے، کسی طالب علم سے کوئی بات ادب کے خلاف سرزد ہوتی، تو صرف استاد اور مرتب اسے ٹوکتے، طالب علم ایک دوسرے کو ادب نہ سکھاتے، جو لوگ مجلس میں دیر سے پہونچتے، وہ آخر میں بیٹھ رہتے، اگر کوئی اٹھ کر جاتا تو اس کی جگہ پر قبضہ نہ کرتے اسے خالی چھوڑ دیتے، سن رسیدہ اور افضل طالب علموں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے، اور انھیں موقع دیتے کہ وہ استادوں کے قریب بیٹھیں، تاکہ ان کے سوال و جواب سے دوسروں کو فائدہ پہونچے، بلکہ ایسے شاگردوں کو استاذ خود آگے بلا لیتے تھے، مثلاً امام احمد بن حنبل، شیخ ابو عاصم ضحاک بن مخلد کے درس کے حلقہ میں شریک ہوتے تھے، ایک مرتبہ وہ حلقہ میں دیر سے آئے تو جگہ پُر ہو چکی تھی، شیخ نے انھیں دیکھ کر آگے بلایا، لیکن انھوں نے لوگوں کی گردنیں پھاند کر جانے میں تامل کیا، تو شیخ نے حلقہ میں وسعت پیدا کرا کر ان کے لئے راستہ بنوایا، اور وہ اس سے ہو کر شیخ کے قریب جا کر بیٹھے، درس کے شروع اور خاتمہ دونوں پر حمد و صلوٰۃ کے علاوہ شیخ اور کتاب کے مصنف کے لئے دعاے خیر کرتے تھے، اور شیخ درس کے خاتمہ پر چند پر نصائح کلمے طالب علموں سے کہتا تھا[۱]

خاتمۂ درس | قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں کو درس کے خاتمہ پر یہ دعاے ماثورہ سبحانک اللھم بحمدک ولا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک فاغفرلی انہ لا یغفر الذنوب الا انت پڑھنے کی ہدایت کی ہے، اور بعض اساتذہ اپنے درس کا خاتمہ زہد و اخلاق کے چند پند و نصائح پر کرتے تھے، قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ درس ختم کر کے تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تاکہ طلبہ تہذیب اور شائستگی سے ان کے سامنے حلقہ سے نکلیں، اور باہر نکلنے میں باہم کشمکش نہ ہو، اس کے علاوہ جو لوگ پیدل جانے والے ہوں وہ چلے جائیں تاکہ یہ بد نمائی نہ ہو کہ استاد سواری پر واپس جائے اور نادار طلبہ اور اس کے ہمعصر علما پیدل روانہ ہوں، اور جب حلقۂ درس خالی ہو جائے، تو استاذ اٹھے

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۹۳ و ۹۶، و ۱۰۴ وغیرہ،

جگہ سے اوٹھے، اور یہ دعا پڑھ کر روانہ ہوجائے،

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ[۱]

(۷)

طریقۂ تعلیم و درس نصاب

اسلامی مدرسوں اور درس کے حلقوں میں بڑے طلبہ کو نہ صرف علوم کے انتخاب کا اختیار حاصل تھا، بلکہ انھیں اپنے استادوں کے انتخاب کی بھی آزادی حاصل تھی، وہ جس استاذ کو پسند کرتے اس کے درس کے حلقہ میں شریک ہوکر تعلیم جاری رکھتے تھے،

اساتذہ کا انتخاب اساتذہ کے انتخاب میں انھیں چند امور کا مشورہ دیا جاتا تھا مثلاً ان کا فرض تھا کہ وہ خود وقتِ نظر سے مختلف استادوں کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لئے کسی کو منتخب کریں اس انتخاب میں اہل علم دوستوں اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کریں، اساتذہ کی علمی استعداد کے علاوہ ان کے زہد، تقویٰ، اور اخلاق پر بھی نظر ڈالی جاتی تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ کن کن مشائخ کے حلقۂ درس سے فیضیاب ہوئے ہیں، اس لئے اساتذہ کے ذاتی کمالات کے علاوہ ان کے شیوخ کی منزلت سے بھی ان کی منزلت ہوتی تھی،

استاذ کے انتخاب کے بعد کم سے کم دو مہینے اس کے درس میں شریک ہونا ضروری قرار دیا گیا تھا تاکہ اس اثنا میں اپنی تشفی کے متعلق صحیح اندازہ ہوسکے، اگر طبیعت کو سیری نہ ہوتی، تو پھر اس حلقہ کو چھوڑ دیتے تھے لیکن دو ماہ سے پہلے چھوڑنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ اس سے کم مدت میں کسی استاذ کے متعلق صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے[۲]

نوعمر طالب علموں کے لئے ان کے والدین اس فرض کو انجام دیتے تھے، اور اس مسئلہ میں

اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے مشورہ کرتے تھے، احمد بن سلمہ جو امام مسلم کے ساتھیوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کے لئے اپنے بعض دوستوں کو صلاح و مشورہ کی خاطر کھانے پر مدعو کیا، کھانے کے بعد اس مسئلہ پر مشورہ کیا اور اسکے بعد انہیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا[۱]،

• تعلیم کے ماہرین نے اساتذہ کے انتخاب کے مسئلہ میں اس کی ممانعت کی ہے، کہ صرف کسی استاذ کی غیر معمولی شہرت سن کر اس کی طرف رجوع کیا جائے، اکثر غیر معروف معلمین اور اساتذہ بڑی جانفشانی سے درس دیتے ہیں، اور ان کے حلقہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا امکان ہوتا ہے[۲]

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے | بچوں کی تعلیم قرآن مجید کے درس سے شروع کراتے تھے، پہلے بچپن میں اسے پڑھا کر زبانی یاد کراتے، پھر قرآنی علوم طلبہ کے ذہن نشین کراتے تھے، اسکے بعد دوسرے فنون کی تعلیم دیتے تھے، قاضی ابن الجماعہ لکھتے ہیں:۔

"تعلیم کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز سے کرنا چاہئے، پہلے اُسے حفظ کیا جائے، پھر اسکی تفسیر اور دوسرے متعلق علوم میں مہارت پیدا کیجائے کیونکہ علم قرآن ہی تمام علوم کی بنیاد ہے، اور اُسے تمام علوم پر فضیلت و اہمیت حاصل ہے[۳]"

ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ جو مختلف علوم میں بحر زخار تھے، فرماتے ہیں:۔

"مجھے میرے والد نے اس وقت تک حدیث پڑھنے کی اجازت نہیں دی، جب تک میں نے قرآن مجید کو فضل بن شاذان سے ختم نہ کر لیا[۴]"

ابن خلکان کا بیان ہے کہ

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۱،
[۲] تذکرۃ السامع ص ۸۵۔۸۶، و تعلیم المتعلم ص ۲۱ تا ۲۲، [۳] تذکرۃ السامع ص ۱۱۲، ۲۱۳،
[۴] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۲۸،

"رئیس ابو علی ابن سینا دس سال کی عمر میں علم قرآن کا ماہر ہو چکا تھا" [۱]

ہندوستان کے علماء کے سوانح میں بھی اس کی تصریح ملتی ہے، کہ یہاں بھی پہلے قرآن مجید پڑھاتے، اس کے بعد دوسرے علوم شروع کراتے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اوّل از قرآن مجید بسابقۂ تعلیم فرمودند سبق بسبق ایشان می نوشتند، ومن میخواندم" [۲]

ابتداءً بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع اور اسے ختم کرائے بغیر کسی دوسرے علم کے شروع نہ کرنے کا رواج تھا، مگر آگے چل کر اس طرز عمل میں کسی قدر تبدیلی پیدا ہوئی، تعلیم کی ابتدا تو قرآن مجید ہی سے کراتے، لیکن بعض ملکوں میں اس کے ساتھ دوسرے علوم بھی شروع کرا دیتے تھے، ابن خلدون نے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کو بیان کیا ہے، جسے مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے اپنے مقدمہ التربیۃ الاستقلالیہ میں نقل کیا ہے، اسکا اقتباس ذیل میں پیش ہے، اس سے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کا فرق ظاہر ہوگا، لکھتا ہے:۔

"اہل مغرب بچوں کو ابتدا میں صرف قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے، اور اس کے ساتھ کسی دوسرے علم مثلاً حدیث، فقہ، اور شعر وغیرہ کو نہیں ملاتے تھے، بربر بھی انہی کے مقلد تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اور لوگوں سے زیادہ قرآن مجید کے حافظ ہوتے ہیں"

اہل اندلس کا طریقہ یہ تھا، کہ قرآن پاک کیساتھ شعر، انشا پردازی، قواعد عربیت اور تجوید خط کی بھی تعلیم دیتے تھے، اور تجوید خط کا سب سے زیادہ لحاظ رکھتے تھے،

اہل افریقہ بھی اگرچہ قرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ حدیث اور بعض دوسرے علوم کی تعلیم ملا دیتے تھے، لیکن قرآن مجید اور اس کے وجوہ قرأت کے ساتھ ان کو سب سے زیادہ اعتنا

---

[۱] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۱۹۱ [۲] اخبار الاخیار ص ۲۹۱،

تھا، اور تجوید خط ایک ضمنی چیز تھی، انھوں نے یہ طریقۂ تعلیم اہلِ اندلس سے سیکھا تھا، اس لئے یہ اہلِ اندلس کے طریقۂ تعلیم سے زیادہ مشابہ تھے،

اہلِ مشرق بھی قرآن مجید کے ساتھ اور علوم کی تعلیم دیتے تھے، لیکن تجوید خط کے ساتھ ان کو خاص اعتنا رتھا، اس کے الگ قواعد مقرر تھے، الگ معلم ہوتے تھے، مستقل طور پر اور صنعتوں کی طرح اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، اور مکاتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسکی تکمیل کیجاتی تھی،

طریقۂ تعلیم کے اس اختلاف کے نتائج بھی مختلف ہوتے تھے، مثلاً اہلِ مغرب اور اہلِ افریقہ نے چونکہ اپنی تمام تر توجہ قرآن پاک کی طرف مبذول کردی تھی، اس لئے ان میں کسی علم کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا، کیونکہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے، کہ اس کے بیان کے اسلوب کا تتبع انسانی قدرت سے باہر ہے، اس لئے ان میں اس تعلیم سے عربیت کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا،

البتہ اہلِ افریقہ نے چونکہ اس کے ساتھ اور علوم بھی ملائے تھے، اس لئے ان میں انشا پردازی کا ملکہ کسی قدر پیدا ہوجاتا تھا،

لیکن اہلِ اندلس نے چونکہ تعلیم قرآن کے ساتھ شعر، انشا پردازی اور عربیت کی تعلیم کو بھی ملالیا تھا، اس لئے ان میں ادب اور لٹریچر کا نہایت عمدہ ملکہ پیدا ہوجاتا تھا"[1]

ہندوستان میں بھی پہلے قرآن مجید پڑھاتے، پھر لکھنا سکھاتے، اس کے بعد ہر فن کی مختصر کتابیں مثلاً کافیہ، لب الالباب، ارشاد وغیرہ پڑھاتے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے

[1] مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیۃ بحوالۂ مقدمۂ ابن خلدون ص ۶۱۶-۶۱۷، ابن خلدون کی بعض عبارتوں کے ترجمے بھی مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیہ سے منقول ہیں،

اپنے تحصیل علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اوّل از قرآن مجید تسابقۃ تعلیم فرمودند بسبق در سبق ایشان می نوشتند، و من می خواندم از قرآن ہمیں مقدار تعلیم کردہ ام، بعدازاں باثر تربیت و شفقت ایشان چنان قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم۔ وہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشان می گذرانیدم در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم"

"و در خط و سواد چنانچہ معلمان صبیانی اطفال را در مکتبہا یاد وہند مفید نہ شدند، فقیر را تا فاو قاف بر طریقۂ اطفال مفید شدہ نویسانیدہ باشند، بعدازاں بطریق اجمال در اندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعیین کنیم، در روغ نگفتہ باشم، قدرت کتابت و سلیقۂ انشاء پیدا شد"

پھر ابتدائی تعلیم کی تفصیل بیان کرکے لکھتے ہیں:۔

"می فرمودند توئیک مختصر از ہر علم بخوان ترا بسندیدہ است بعدازاں انشاء اللہ چنان ابواب برکت و سعادت بر تو کشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روے نماید"[۱]

ہر فن کی اہم کتابوں کو زبانی یاد کرنا قرآن مجید کی تعلیم کے بعد دوسرے علوم شروع کرائے جاتے تھے، اور سب سے پہلے اہم علوم حدیث، اصول، صرف و نحو کے اہم مسائل اور مبادیات طلبہ کو حفظ کرا دیئے جاتے تھے، اور اس کے ساتھ علم قرآن میں بصیرت پیدا کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا،[۲]

معیاری کتابوں کے حفظ کیلئے سلاطین اسلام کے انعامات علوم کے مبادی کے حفظ کرنے کا طریقہ بڑی پابندی سے رائج تھا، اور طالب العلم کی تعلیمی بنیاد کی استواری کے لئے یہ بیحد ضروری سمجھا جاتا تھا، اسی وجہ سے سلاطین اور امراء نے طلبہ کی ہمت بڑھانے اور شوق دلانے کے لئے مختلف معیاری کتابوں کے

۱؎ اخبار الاخیار ص ۲۹۰، ۲۹۱، ۲؎ تذکرۃ السامع ص ۱۱۳

برزبان کرنے کے لئے مستقل گرانقدر انعامات مقرر کر دیئے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ ان کتابون کے برزبان کرنے میں سبقت کرتے تھے، چنانچہ مصر کے بعض سلاطین نے امام محمد کی مشہور تصنیفات پر جو فقہ حنفی کی بنیادی کتابین ہیں گرانقدر انعامات مقرر کئے تھے،[۱]

حفظ کا طریقہ | اساتذہ، طالب علموں کو حفظ کرنے کے طریقے بتاتے تھے، زرنوجی طلبہ کو ہدایت کرتا ہے، کہ

"طالب علم کو چاہئے کہ وہ دل میں سبق کے بار بار دہرانے کا شمار کرتا جائے، آج کا سبق برزبان کر لینے کے بعد کل کے سبق کو پانچ مرتبہ، پرسوں کے سبق کو چار مرتبہ، اترسون کا تین مرتبہ، اس سے پہلے کا دو اور اس سے بھی پہلے کا ایک مرتبہ پابندی سے دہرائے یہ طریقہ برزبان رکھنے کا سب سے بہتر ہے"[۲]

حفظ اخبار و سیر | طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، ان میں صحابہ، تابعین، خلفاء، ائمہ اسلام، صالحین اور مشہور فقہاء کے نام اور ان کے مختصر حالات و سوانح بھی تھے، یہ انھیں املا کرا کر یاد کرائے جاتے تھے، تاکہ وہ علم اور مذہب کے ستونوں سے باخبر رہیں، لیکن ان اکابر کی ایک دوسرے پر باہمی فضیلت وغیرہ اختلافی مسئلوں پر مدرسہ میں بحث اور مناظرہ کی اجازت نہ تھی،[۳]

حفظ کتب | چنانچہ اسلامی مدرسون کے طالب علم مختلف علوم و فنون کی چیزیں بہ کثرت حفظ کرتے تھے ابن خلکان ابو علی بن سینا کے متعلق لکھتا ہے :-

"اس نے اصول دین، ہندوستانی حساب اور جبر و مقابلہ کی چند چیزیں حفظ کین"[۴]

علامہ ذہبی فقیہ یونینی کے متعلق لکھتے ہین کہ انھون نے طالب علمی کے زمانہ میں پہلے قرآن یاد کیا، پھر لکھنا سیکھا، پھر حمیدی کی الجمع بین الصحیحین یاد کی، پھر چار مہینے میں صحیح مسلم برزبان کی اور ان

[۱] الدرر الکامنہ ابن حجر [۲] تعلیم المتعلم ص ۴۸ [۳] تذکرۃ السامع ص ۵۰ [۴] وفیات الاعیان جلد ا ص ۱۹۱

کے جلد یاد کر لینے کی مثال یہ ہے، کہ انھوں نے سورۂ انعام صرف ایک دن میں یاد کیا، اور حریری کے تین مقامات ایک دن کے صرف بعض حصوں میں[1] امام بخاری نے ۱۱ سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل شروع کی، اور ابن مبارک کی کتابیں بچپن ہی میں یاد کرلیں[2]،

ابوبکر بن انباری نحوی کے متعلق ان کے شاگرد ابو علی قالی کا بیان ہے، کہ کہا جاتا ہے، کہ انھیں تین لاکھ اشعار صرف ایسے یاد تھے، جو قرآن مجید کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے تھے[3]،

سیوطی ابن قتیبہ کے صاحبزادے ابو جعفر احمد قاضی مصر متوفی ۳۲۲ھ کے متعلق لکھتا ہے، کہ

"یہ علم اور حفظ والوں میں سے تھے، انھوں نے مصر میں اپنے والد کی تمام کتابیں اپنے حفظ سے تلامذہ کو پڑھ کر سنائیں، ان کے ساتھ کوئی کتاب نہ تھی، اور ابن قتیبہ کی کتابیں تعداد میں اکیس تھیں[4]"،

ہندوستان کے اہل علم میں حفظ کا رواج، ہندوستان کے اہل علم میں بھی کتابیں حفظ کر لینے کا رواج تھا، شیخ عثمان ابن داؤد ملتانی متوفی ۷۳۶ھ کے متعلق سیر الاولیار کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں ہے،

"انھیں فقہ میں ہدایہ اصول میں بزدوی، اور قوت القلوب کی اور احیاء العلوم غزالی سلوک وتصوف میں برزبان یاد تھیں[5]"

بابا داؤد کشمیری متوفی ۱۰۹۷ھ کو مشکوٰۃ برزبان یاد تھی، اسی نسبت سے مشکوٰتی مشہور ہوئے، تذکرۂ علمائے ہند میں ہے،،

"حافظ مشکوٰۃ المصابیح بود، بدین وجہ اورا مشکوٰتی، می گفتند[6]"

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۲۲، [2] ، جلد ۲ ص ۱۲۴، [3] ، جلد ۳ ص ۵۰، [4] حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۵۶
[5] نزہۃ الخواطر ص ۹۰، [6] تذکرہ علمائے ہند ص ۶۰

محدثین کا حفظ حدیث | علم حدیث کے طالب علم غیر معمولی طور پر حدیثیں برزبان کرتے تھے، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ

"میں نے ہر وہ چیز برزبان کرلی، جو ہشیم سے ان کی زندگی میں سنی تھی"[۱]

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ میں مکہ جا رہا تھا، راستہ میں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان کی روایتیں ایک دوسری سند سے میں نے حاصل کی تھیں، جو دو جزوں میں لکھی ہوئی تھیں، میں نے خیال کیا کہ یہ دونوں جزء ساتھ موجود ہیں، انھیں شیخ سے پڑھ لوں، چنانچہ میں نے ان سے استدعا کی، اور وہ سنانے پر آمادہ ہوگئے، اب میں اپنے جزء نکالتا ہوں، تو سادے صفحات تھے، میں انہی کو ہاتھ میں لیکر سننے لگا، اور شیخ اپنی حدیثیں سناتے گئے، اتفاق سے ان کی نظر سادے صفحوں پر پڑگئی، اور انھوں نے برہمی سے کہا تمھیں شرم نہیں آتی میں نے کہا، ابھی جو حدیثیں آپ نے روایت کیں، وہ مجھے یاد ہوگئیں، انھیں یقین نہیں آیا، اور خیال ہوا کہ وہ پہلے سے یاد ہوں گی، میں نے کہا دوسری روایتیں سنائیے، میں سنا دونگا، چنانچہ انھوں نے چالیس روایتیں سنائیں، اور ان کے سوال پر میں نے سب انھیں اسی وقت دہرا دیں کہیں ایک حرف کی بھی غلطی نہیں ہوئی[۲]

داؤد بن یحییٰ حافظ ابوعبداللہ محمد بن علی قرطمہ کے متعلق کہتے ہیں :-

"لوگ حفظ میں ابوزرعہ اور ابوحاتم کا نام لیتے ہیں، واللہ میں نے قرطمہ سے زیادہ کسی کو حافظ نہیں پایا، میں ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا، انھوں نے کہا یہ کتابیں رکھی ہیں، ان میں سے کوئی اٹھالو، اور میں پوری زبانی پڑھ دوں، میں نے کتاب الاشربہ اٹھائی، اور انھوں نے اوّل سے آخر تک اُسے سنا ڈالا"[۳]

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۵ [۲] رر جلد ۲ ص ۲۰۹ [۳] رر ص ۳۰۹

امام شعبی فرماتے ہیں کہ "مجھ سے جب کسی شخص نے حدیث بیان کی، تو اس کو میں نے حفظ کر لیا، میں جو کچھ سنتا ہوں اُسے حفظ کر لیتا ہوں"[ا]۔

امام عجلی سے پوچھا گیا کہ کیا ان کے پاس حدیثوں کے مجموعہ کی کوئی کتاب موجود ہے؟ تو انھوں نے فرمایا "میرا سفینہ میرا سینہ ہی ہے" وہ بصرہ میں اپنے وقت کے حدیث کے سب سے بڑے حافظ تھے[۲]

اسباق میں طلبہ کی ذہنی استعداد کا لحاظ

مبتدیوں کو اتنا سبق دیا جاتا جتنا وہ یاد کر سکتے تھے، زرنوجی اپنے مشائخ کا یہ قول نقل کرتا ہے، کہ "مبتدیوں کو بس اسقدر سبق دینا چاہئے، جسے وہ دو مرتبہ کے اعادہ سے یاد کر لیں[۳]"۔

اس کے بعد جیسے جیسے طالب علم کی استعداد بڑھتی اسباق تدریجی طور پر بڑھاتے جاتے تھے، کسی طالب علم کو اس وقت تک کوئی چیز لکھنے کی اجازت نہ تھی، جب تک وہ اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لے، جب نئے طلبہ حلقہ میں آتے، تو شیخ ان کی ذہنی استعداد کا امتحان لیتا، ماہرین تعلیم نے اسکی ہدایت کی ہے[۴]

علوم کی تعلیم میں یہ بھی ضروری سمجھا جاتا تھا کہ ایک فن میں مہارت حاصل کرنے کے بعد دوسرے کو شروع کیا جائے، امام غزالی اور ابن خلدون نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے[۵]،

طرز تعلیم

علامہ شبلی علیہ الرحمہ اسلامی نظام تعلیم کے دور اول میں طرز تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"اُس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا، جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے، یعنی املا جس کو اردو میں لکچر دینا کہتے ہیں، استاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا، اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا، طالب علم جو ہمیشہ دوات و قلم لیکر بیٹھتے تھے، ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے، اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار

[ا] طبقات الشافعیہ سبکی جلد ا ص ۲۲۴ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۳۱ [۳] تعلیم المتعلم ص ۴۰ و تذکرۃ السامع ص ۵۲ [۴]
[۵] احیاء العلوم جلد ا ص ۴۴،

ہو جاتی تھی، اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی، امالی ابن درید اور ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں، جب معمول سے زیادہ طلبہ حلقۂ درس میں جمع ہوتے تھے تو استاد کے سامنے دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے، جو دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے، یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے، یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، ابو بشر متی جو بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا، اس کے لکچر میں سینکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے، جن میں فارابی بھی تھا، اور اس نے کئی سو صفحے خود نقل کئے تھے۔[۱]

طلبہ املا و سماع کے وقت پورے طور پر متوجہ رہتے تھے، یہانتک کہ اگر وہ کسی مسئلہ میں لگ جاتے تو بھی توجہ ادھر سے نہ ہٹتی، امام دارقطنی کی طالب علمی کے زمانہ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ وہ اپنی کم سنی کے زمانہ میں اسمٰعیل صفّار کی مجلس میں حاضر تھے، صفّار حدیثیں سناتے جاتے، اور سماع میں شریک ہونے کے باوجود کوئی دوسری چیز لکھتے جاتے تھے، یہ دیکھ کر ایک ساتھی نے جھنجلا کر کہا تم لکھنے میں مصروف ہو تمہارا سماع جائز نہ ہوگا، دارقطنی کو بھی طیش آیا اور انھوں نے کہا کہ املا کیلئے میری سمجھ تمہاری سمجھ سے مختلف ہے، کیا تمھیں یاد ہے کہ شیخ نے کس قدر املا کرایا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا، تو دارقطنی نے تفصیل بیان کرنی شروع کی کہ اٹھارہ حدیثیں لکھا چکے ہیں، پہلی حدیث عن فلاں عن فلان تھی، اور اس کا متن یہ اور یہ تھا، دوسری حدیث عن فلان عن فلان ہے، اور اس کا متن یہ اور یہ ہے، اسی طریقہ سے اس وقت کی لکھائی ہوئی کل حدیثیں زبانی سنا دیں، یہ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی۔[۲]

جب درس کے حلقہ میں مقرر کتابیں پڑھانے کا دستور ہوا، تو اس کے دو طریقے رائج تھے، بعض مرتبہ اساتذہ کتابوں کی قرأت کرتے تھے، اور شاگرد انہیں سنتے تھے، اور بعض حلقوں میں

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۵۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۰۰،

استاذ کے سامنے کتابوں کی قرأت شاگرد کرتے تھے، اور استاذ انھیں سنتا، اور حسب ضرورت غلطی کے موقعوں پر ان کی تصحیح کرتا، اور مشکل مقاموں پر شبہے دور کرتا،

سندین | ان مختلف طریقوں سے حاصل کئے ہوئے علم کی سندوں میں اعتبار اور استناد کے لحاظ سے درجے اور امتیاز قائم تھے، اور اسی لحاظ سے سندین دیجاتی تھیں، اور ان سندوں کی مختلف قسمیں تھین، مثلاً ایک قسم کی سند اصطلاحاً "اجازۃ" کہلاتی تھی، یعنی شیوخ اپنے کسی شاگرد کو کسی کتاب کا کچھ حصہ پڑھا دیتے، اور اس کے باقی حصوں کے پڑھنے کی اجازت اپنے کسی ایسے شاگرد کو دیتے، جسے وہ پہلے پڑھا کر سند دے چکے ہوتے، یا اس طالب علم کو خود بغیر کچھ پڑھائے ہوئے اپنے شاگردون کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیکر اپنے کسی شاگرد سے اپنی کتاب کے پڑھنے کی اجازت دیدیتے تھے، اب وہ طالب علم پہلے فارغ التحصیل شاگرد سے اس کتاب کی "اجازت" کے طریق پر سند قرأت لیتا، جیسے امام شافعی کے سامنے ان کے ایک شاگرد زعفرانی نے کتاب الام بجز کتاب الصلوٰۃ والمناسک کے پوری پڑھی، اور کتاب الصلوٰۃ اور کتاب المناسک خود امام شافعی نے ان کے سامنے پڑھ دین، اس کے بعد امام شافعی بغداد پہونچے، یہان ایک دوسرے اہل علم کرابیسی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے کتاب الام کی کتابیں (ابواب) پڑھنی چاہئیں، لیکن امام شافعی نے ان سے فرمایا، کہ میں زعفرانی کو کتابین دیچکا ہون، ان سے حاصل کر لو، میں تمھین ان سے پڑھنے کی سند اجازۃ دیتا ہون[1]۔

طریق سماع واجازہ و قرأت کے فرقوں کا اندازہ حافظ ابن المفضل کے ذیل کے بیان سے ہوگا، وہ فرماتے ہیں،

"میں نے سلفی سے پوری صحیح بطریق اجازہ بذریعہ ابومکتوم ابن ابی ذرسنی، اور ہمارے شیخ ابو

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ا ص ۲۵۰

عبید احمد بن زیادۃ اللہ غفاری نے مکہ میں ابو مکتوم سے سنا تھا، تو میں نے ان سے اکثر حصہ سن لیا، اور بقیہ حصہ کی انھوں نے اجازت دیدی، ابو مکتوم کے واسطے سے سب سے آخر میں جس نے روایت کی ہے، وہ ابوالحسن علی بن حمید بن عمار انصاری ہیں، انھوں نے بطریق اجازہ حاصل کیا تھا اور میں نے پوری کتاب اپنے استاذ ابو طالب صالح بن سند سے پڑھی جنھوں نے اس کو طرطوسی سے اور طرطوسی نے ابوالولید باجی سے سنا تھا[1]۔

کتابوں کی سند و اجازہ میں یہ ضروری تھا کہ شیخ اپنے شیوخ کے واسطوں سے اپنی قرأت وسماع کا سلسلہ اس کتاب کے مصنف تک پہونچائے، ورنہ وہ سند لائق اعتبار نہ سمجھی جاتی تھی ایسی سندیں آج بھی عربی مدرسوں میں رائج ہین،

نصاب تعلیم، اسلامی نظام تعلیم میں علوم قرآن، تفسیر، حدیث، اصول، اصول فقہ وکلام اور مناظرہ وغیرہ کی تحصیل مدرسہ کے ہر طالب علم کے لئے لازمی تھی، اور طالب علمون کے اسباق میں اسی ترتیب بالا سے انھیں پہلے اور پیچھے جگہ دیجاتی تھی، ان کے علاوہ دیگر علوم حساب ہیئت، طب، نجوم اور زراعت وغیرہ کی تحصیل اختیاری قرار دی گئی تھی، جس طالب علم کو جس علم سے مناسبت ہوتی، وہ اسکی طرف رجوع کرتا تھا، اور اسی لئے ان علوم کی تحصیل مذہبی اصطلاح میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، فرض کفایہ سمجھی جاتی تھی[2]، اس کے ساتھ مختلف علوم و فنون کے معلم اس کا لحاظ رکھتے تھے، کہ وہ طالب علموں کے دلوں میں کسی خاص فن کی طرف سے حقارت کا جذبہ پیدا نہ کریں، مثلاً فقہ کا معلم علم لغت کی برائیاں نہ کرتا، یا تفسیر اور حدیث کی تعلیم دینے والا علم فقہ کو ہلکا کرکے نہ دکھاتا تھا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۰۶،

[2] تذکرۃ السامع ص ۳۵، ۳۶

تعلیم کے طریقہ میں یہ بات لائق ذکر ہے کہ علوم وفنون کی تعلیم میں اساتذہ اصل مطمح نظر اپنے فن کے اصل قواعد اور اصول طالب علموں کو اس طرح ذہن نشین کرا دیتے تھے، کہ انھیں فن میں حقیقی بصیرت حاصل ہو اور وہ خود سے ان کے دوسرے مسائل ان پر قیاس کر سکیں[۱]،

طلبہ کے روزانہ کے اسباق کی ایک مثال

طالب علموں کے ذمہ روزانہ بہت سے اسباق رہتے تھے، علامہ ذہبی نے امام نووی کے روزانہ کے اسباق کی فہرست حسب ذیل درج کی ہے، وہ یہ ہے،

(۱) الوسیط (۲) الوسیط (دو سبق)، (۳) کتاب المہذب (۴) الجمع بین الصحیحین حمیدی (۵) صحیح مسلم (۶) کتاب اللمع ابن جنی، (۷) اصلاح منطق، (۸) تصریف (۹) اصول (۱۰) اسماء رجال، (۱۱) اصول دین،

امام نووی ان گیارہوں سبقوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اور ان کے تمام متعلقات مشکلات کی شرح عبارت کی توضیح اور لغتوں کے معنی وغیرہ روزانہ لکھتے بھی تھے،

بقدر استطاعت اسباق میں کمی کرنا،

اگر تعلیم کا بوجھ کسی پر زیادہ ہو جاتا تھا، تو وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس میں کمی کر دیتا تھا، چنانچہ امام نووی کو ان اسباق کی موجودگی میں طب پڑھنے کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے کتاب قانون خریدی، مگر وہ اس بوجھ کو سنبھال نہ سکے، اور علم طب کی تحصیل کا ارادہ ترک کرکے وہ کتاب فروخت کر ڈالی[۲]، (باقی)

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۵۸، ۱۰۱، [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۵۱۔

آخری سلاطین مغلیہ کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ایم اے، رفیق دار المصنفین

اورنگ زیب کی روح قفسِ عنصری سے پرواز ہوتے ہی تاریخِ ہند کا رُخ بدل گیا، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کے لئے عالمگیر ہی کا دل و دماغ چاہئے تھا، مگر حکومت بدلنے کے ساتھ زمانہ بدلا، اور تاریخ بھی بدل گئی، تختِ طاؤس وہی تھا، لیکن اس کے پردں کی خوشنمائی جاتی رہی تھی، تیموری دربار وہی تھا لیکن اس کی رونق مٹ چکی تھی، اربابِ عقل و دانش بھی موجود تھے، مگر ان کی جودت، فطانت اور سیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا، دیوانِ خاص کے کنگوروں سے حسرت و یاس برسنے لگی، دیوانِ عام کی دیواروں پر افسردگی چھا گئی اور قلعہ معلی سوگوار ہو گیا، معلوم نہیں یہ کارکنانِ قضا و قدر کی مصلحت تھی، یا عالمگیر کی اولادوں کے اعمال کی پاداش، تیموری سلطنت اوجِ کمال پر تھی، اس کے زوال کو روکنے کے لئے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی، مگر وہ قوت باقی نہ تھی، فطرت سرگرم ہوئی، اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم، بابل اور نینوا کا ہو چکا تھا،

عالمگیر کی دور رس نگاہیں اس نتیجہ تک پہونچ گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لائق جانشین چھوڑنے کے لئے جس قدر مضطرب اور بے چین رہا، کوئی اور تیموری حکمران نہ ہوا تھا، وہ ان کو نہ صرف میدانِ جنگ میں فنونِ سپہ گری بتاتا[1]، بلکہ دربار میں رموزِ حکمرانی، اور قلعہ معلی کے اندر لکھنے پڑھنے کی تعلیم

[1] وقائع عالمگیری مرتبہ نبی احمد سندیلوی صنا

دلاتا تھا، بلکہ ان کو اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے، اور بولنے چالنے کے آداب خود سکھاتا تھا،[1] مگر قدرت کو شاید منظور نہ تھا، کہ اسکی عظیم الشان سلطنت کے بار گراں کو اٹھانے کے لئے کوئی لائق جانشین پیدا ہو بہرحال یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا، کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے ایام طفلی میں حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی، اور آگے چل کر قرأت و تجوید کا ماہر ثابت ہوا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ جب وہ قرآن پاک پڑھتا تو سامعین بہت محظوظ ہوتے تھے، علم حدیث سے وہ خاص دلچسپی رکھتا تھا، اور اس کو اسمیں اتنا درک تھا، کہ علماے حدیث اس کو سردار محدثین کے لقب سے یاد کرتے تھے، فقہی مسائل بلا تکلف قرآن و حدیث سے استنباط کرتا تھا، اس کے زمانہ میں جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے آگے لفظ "وصی" کے اضافہ کے سلسلہ میں جو جھگڑا پیدا ہوا، اسمیں علماء و فقہاء سے اس نے خود مناظرہ کیا،[2] حدیث، فقہ، تفسیر و سلوک کی کتابیں برابر مطالعہ میں رکھتا تھا، مصنف مذکور کا بیان ہے کہ عربی زبان میں "عرب عربا"، اور فارسی و ترکی زبانوں میں بہترین اہل زبان کے "ہم پلہ" تھا، فن خوشنویسی میں بقول مصنف ہذا "یکتاے زمانہ" تھا، اور مختلف قسم کے خطوط میں کمال حاصل کیا تھا،[3] خلاصۃ التواریخ کا مصنف بھی اس کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے،

"و آن منتخب صحیفہ لیل و نہار باقتضاے سعادت فطری و میامن ترتیب حضرت خلد مکان از طلوع صبح تمیز از خار شرائف نفسانی و کمالات انسانی نمودہ و آن برگزیدہ روزگار ایام شباب بنیز صرف علم تحصیل نمودہ، علم با عمل قرین ساخت سلامت و فصاحت تکلم عربی و ترکی و فارسی زیبائی و در اقسام تحریر خطوط مرتبہ استادی در سائی اکثر شب بیاد نوافل و تقدیم وظائف و قرآت قرآن مجید و مطالعہ کتب حدیث و تفسیر و فقہ و سلوک

---

[1] عالمگیر نے شاہزادہ محمد سلطان بہادر کو جو شب و روز کا نظام اوقات لکھ بھیجا تھا، وہ رقعات عالمگیر مرتبہ نجیب اشرف ندوی صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ ہو، [2] خافی خان جلد دوم صفحہ ۶۱۳، [3] مآثر عالمگیری ذکر اولاد ذکور،

زندہ می داشتند،.........[1]"

یا تو عالمگیری دربار کے زوال کے باعث یا شاہ عالمی عہد کے اختصار کے سبب سے دربار میں وہ فضا قائم نہ ہو سکی، جو اس کے اسلاف کے زمانہ میں تھی، اس لئے اس کا دربار علم و ہنر کی تابانی اور شعر و شاعری کی زمزمہ سنجی سے خالی رہا، گذشتہ عہد میں ایران سے علم و ادب کا جو سرچشمہ پھوٹا تھا وہ یکایک خشک ہو گیا، بلند پایہ شعراء اور قابلِ قدر فضلاء ناپید ہو گئے، قابلِ ذکر شعراء میں صرف عبدالقادر بیدل اور نعمت خان عالی باقیات صالحات میں رہ گئے تھے، مرزا بیدل بہادر شاہ کے ایام شاہزادگی میں اس کے متوسلین میں ضرور تھے، لیکن درباری قصیدہ خوانی کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے شہزادہ معظم نے ایک بار قصیدہ کہنے کی فرمائش کی، تو دل برداشتہ ہو کر ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے، اور بقیہ عمر فقر و توکل میں بسر کی،[2]

نعمت خان عالی کا ذکر گذشتہ مضامین میں آچکا ہے، بہادر شاہ نے اپنے زمانہ میں اسکو دانشمند خان کے خطاب سے سرفراز کیا، دانشمند خاں اس عہد کی منظوم تاریخ "شاہ نامہ" لکھ رہا تھا، کہ خود اس کی زندگی کا ورق الٹ گیا،[3]

دربار کے دوسرے نامور شاعر یہ تھے،

میرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خان المتخلص بہ واضح خان اعظم شاہجہانی کا تیسرا

---

[1] خلاصۃ التواریخ از سجان رائے، قلمی نسخہ دارالمصنفین، [2] مآثر الکرام ص ۱۴۸ دیوان کے علاوہ مرزا بیدل کی تصنیفات یہ ہیں، ۱۔ محیط اعظم، ۲۔ طلسم حیرت، ۳۔ گلگشت حقیقت، ۴۔ طور معرفت، ۵۔ عرفان، ۶۔ بیاض، ۷۔ نکات، ۸۔ رقعات، ۹۔ چہار عنصر [3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۳۷ نعمت خان عالی کی تصنیفات یہ ہیں، ۱۔ بہادر شاہ نامہ، ۲۔ وقائع حیدر آباد، ۳۔ رقعات نعمت خان، ۴۔ حسن و عشق، ۵۔ قصائد و قطعہ ہاو ہجو ہا، ۶۔ ایک اخلاقی مثنوی (انڈیا آفس لائبریری، مخطوطات فارسی ص ۹۰۳) (دیکھو ص ۲۸)

لڑکا تھا، اورنگزیب کے زمانہ میں ارادت خان کا خطاب پایا، سنہ ۱۱۰۰ھ میں چاکنہ کی فوجداری پر مامور ہوا، پھر سنہ ۱۱۰۰ھ میں اورنگ آباد کی فوجداری اور اس کے بعد گلبرگہ کی قلعہ داری پر مقرر ہوا، شاہ عالم کے زمانہ میں منصب چہار ہزاری سے سرفراز ہوا، علم و فضل میں ممتاز تھا، صاحب ماثر الامراء کا بیان ہے:-

"مذاق تصوف داشت، و در شعر بسیار نازک خیال بود، و واضح تخلص می کرد، صاحب دیوان است"[۵۱]

انتخاب کلیات واضح (موجودہ انڈیا آفس لائبریری) میں چھ مثنویاں بھی ہیں جن میں صوفیانہ خیالات و مسائل منظوم کئے گئے ہیں[۵۲]، تاریخ ارادت خان کے نام سے ایک تاریخ بھی لکھی جو عالمگیر کی وفات سے لیکر فرخ سیر کے عہد کے واقعات تک پر مشتمل ہے[۵۳]،

میرزا سید حسین خالص، عالمگیر کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آیا، امتیاز خان کے

---

۵۱ ماثر الامراء جلد اول ص ۲۰۵، اسکے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

رشک فرمائے دلم نیست بجز عیش حباب ۔۔۔ یافت یک پیرہن ہستی و آن ہم کفن است

عارف از و پر است ولی او نمی شود ۔۔۔ آئینہ رونما شود و رو نمی شود

ز مقراض فنا نور است شمع زندگانی را ۔۔۔ بود آب دم شمشیر صندل سرگرانی را

چہ الفت است بزلف تو بیقراران را ۔۔۔ بلے سیاہ پسند است سوگواران را

موج وحشت کند محروم از ساحل مرا ۔۔۔ در طپیدن رفت از کف دامن قاتل مرا

گلۂ صاف بہ از عفو غبار آلود است ۔۔۔ ہست دوزخ گنہی کہ بمدارا بخشد

بہار وقف صبا گل بکام گلچیں باد ۔۔۔ کہ ما بہ کنج قفس طرح آشیاں کردیم

۵۲ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ جلد اول ص ۹۰۵، ۵۳ ایتھ جلد ہفتم، ص ۵۴۲ تا ص ۵۴۴

خطاب سے سرفراز ہوا، بہادر شاہ کے زمانہ میں میرآخور پادشاہی کے عہدہ پر مامور ہوا، ایران واپس جارہا تھا کہ راستہ میں سندھ کے پاس کسی نے قتل کردیا، تاریخ وفات "آہ آہ امتیاز خان" سے نکلتی ہے، ایک دیوان یادگار چھوڑا، جس میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں، ایک مثنوی بھی اس کے نام سے منسوب ہے،[۵۱]

قزلباش خان امید، اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان کا رہنے والا تھا، بہادر شاہ کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور اس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا، قزلباش خاں کا خطاب اور یک ہزاری منصب شاہی دربار سے ملا، چنانچہ خود کہتا ہے،

ہمچو بلبل ہمیشہ نالایم،

این بود منصب ہزاری ما

ایک فارسی دیوان چھوڑا،[۵۲] ریختہ میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا، فن موسیقی کا بھی ماہر تھا،[۵۳]

بندرابن داس بہادر شاہی مصنف خلاصۃ التواریخ کے علاوہ جگ جیون داس ولد منوہر داس بھی بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین میں تھا، گجرات کا باشندہ تھا، ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ

[۵۱] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ ۱ سپرنگر ص ۱۵۰، ۱۴۱، ۱۲۱، ۱۱۱ [۵۲] انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ جلد اول ص ۷۲۲ [۵۳] اسپرنگر ص ۱۵۳ اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

روشن شود بہ پیش تو چوں شمع سوز من | یک شب اگر تو ہم نشینی بروز من
خوشا وقتے کہ می بالید از جاناں بردوشم | برنگ ماہ نو ہر شام پر می گشت آغوشم
گشت روگردان زبس آبادی از ویرانہ ام | چون کمان حلقہ بیرون شد درون خانہ ام
خدا ناکردہ اندوہت چرا از دوستاں باشد | شنیدم کلفتے داری نصیب دشمناں باشد

مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۲۱ اس کے ریختہ کے اشعار تذکرہ گلزار ابراہیم از میرزا علی متخلص بہ لطف میں ملاحظہ ہو،

نے لاہور کے دربار میں باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر مامور کیا، ۱۱۲۰ھ میں اوس نے منتخب التواریخ لکھ کر بارگاہ شاہی میں پیش کی، جس کے صلہ میں خطاب و خلعت اور انعام سے سرفراز ہوا[۵]

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے اقبال کا آفتاب اور بھی تیزی سے ڈھلنے لگا، تاریک بادلوں کے اندر سے کبھی کبھی امید کی شعاعیں نکلتی بھی تھیں، توان میں نور کے بجائے ظلمت ہی نظر آتی تھی، تیموری دربار کا شیرازہ بکھر گیا، تدبر و سیاست میں انتشار آگیا، بیرونی فتوحات کی جگہ اب صرف خانہ جنگیاں رہ گئی تھیں، میدان جنگ میں خون آشامیوں کے بعد دربار قائم بھی ہوا، تو اس میں نہ اسلاف کی روایات تھیں، نہ ان کی متانت اور نہ ان کا وقار، بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ تخت نشین ہوا، گو اس کی حکومت کی مدت صرف دس مہینے رہی، لیکن اسکی بوالہوسی اور ہوسناکی نے شاہی دربار کی عزت و ناموس کو ایسا صدمہ پہونچایا، کہ آئندہ تمام تیموری سلاطین کی حکومت محض تذلیل و تضحیک کی داستان بن کر رہ گئی، اس خانہ بربادی اور طوائف الملوکی میں علم و فضل کی مسند دربار میں بچھتی، تو کیونکر؟ محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر میں اسلاف کی علم پروری اور ادب نوازی کا خمیر موجود ضرور تھا، مگر ان کی شمع سحر میں ان کے اسلاف کے آفتاب نصف النہار کی ضوفشانی کہاں سے آتی، حکومت محض شام غریبان بن کر رہ گئی تھی، اس میں علما و فضلا، کی بہار کہاں پیدا ہوتی،

فرخ سیر کی مدت حکومت سات سال رہی، اور یہ مغلیہ خاندان کا وہ زمانہ ہے، جب شاہی دربار میں مدبروں اور ہوشمندوں کا ایک قابل قدر اجتماع ہو گیا تھا، نظام الملک آصفجاہ کی سیاست، امیر الامرا سید حسین علی خان کی فراست، قطب الملک عبد اللہ کی فرزانگی اور میر جملہ کی مردانگی اگر ایک ساتھ متحد ہو جاتیں، تو کیا عجب تھا، کہ ایک بار پھر اکبری دبدبہ اور شاہجہانی

شوکت کی جھلک نظر آجاتی لیکن دربار کی ریشہ دوانیوں اور آپس کی فتنہ انگیزیوں نے تباہی اور بربادی کی چنگاریوں کو اس طرح مشتعل کیا، کہ سلطنت محض خاکستر ہو کر رہ گئی،

فرخ سیر کا ذوق علم و فضل سے عاری رہا، لیکن اس کے درباری امرا، تدبر و فراست کیساتھ علم و ادب میں بھی ممتاز تھے، چنانچہ نظام الملک آصفجاہ ایک اعلیٰ مدبر ہونے کے علاوہ ادیب اور شاعر بھی تھا، خافی خاں اس کے بارے میں لکھتا ہے :۔

"از علوم عقلی و نقلی کہ سرمایۂ حاصل زندگانی و کلید فتح ابواب ترقی دنیوی و نجات اُخروی است، بہرہ حاصل نمودہ و در ربط کلام نظم و نثر دست تام دارد و شاکر تخلص می نماید، چنانچہ دو سہ بیت از زادۂ طبع آن بزرگ نژاد نگاشتہ می آید"۔

چوں گل بہ بوئے وصل گریبان دریدنی است   آہے ز سوز سینہ بریاں کشیدنی است

زنہار دل بہ نقش و نگار جہاں مبند   رنگے کہ دیدۂ ز رُخ گل پریدنی است

شاکر برنگ برق درین عرصۂ خیال   دامن ز خویش پر زدہ رہ دویدنی است[۱]

آصف جاہ کے بارے میں مآثر الکرام میں ہے :۔

"نواب طبع موزونی داشت و دیوانے ضخیم از نتائج طبعش فراہم آمدہ"[۲]

امیر الامرا، سید حسین علی خان کے بیان میں صاحب مآثر الکرام رقمطراز ہیں :۔

"امیر الامرا خوش ذہن بود، و شعر خوب می فہمید و در فن تاریخ دانی منفرد می زیست و ارباب کمال را فراوان دوست می داشت و بعد نماز صبح اذن بود کہ صاحب کمال درآیند، و تا یک پاس روز با اینہا صحبت می داشت و تاکید بود کہ درآن وقت دیوانیان و متصدیاں حاضر نہ شوند، ..... میر عبد الجلیل مرحوم تعریف خوش فہمی امیر الامرا بسیاری کرد"[۳]

---

۱ خافی خاں ص ۷۴۲، ۲ مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۸۱، ۳ ر ص ۱۱۱،

آصفجاہ اور امیر الامرا، دونوں علامہ سید عبد الجلیل واسطی بلگرامی کو بہت محبوب اور عزیز رکھتے تھے، علامۂ موصوف فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور بھاشا کے فاضل اجل تھے، اور اپنے ذاتی تقدس، اوصاف عالیہ اور علمی کمالات کے لحاظ سے اب تک عزت و وقعت سے یاد کئے جاتے ہیں، امیر الامرا سید حسین علی خان سے ان کے تعلقات کا حال صاحب مآثر الکرام کے الفاظ میں ملاحظہ ہو،

"امیر الامرا سید حسین علی کہ بایشان الفتے خاص داشت واکثر در مجالس خود برملا می گفت کہ میر عبد الجلیل درین عصر نظیر ندارند ولوازم احترام فوق الحد بتقدیم می رسانید"[1]

علامۂ موصوف آصفجاہ کے حضور میں نواب امین الدولہ کی وساطت سے پیش کئے گئے تو

"نواب (آصفجاہ) اعزاز واکرام فراوان بعمل آورد و برابر خود بے فاصلہ جا داد و چوں نسخۂ قصیدہ از نظر گذشت، شمع را نزدیک طلبیدہ اشارہ بانشاد قصیدہ کرد، ہر یک بیت را بفہم درآوردہ بتوجہ تمام اصغا نمود وجواہر تحسین افشاند بعد استماع قصیدہ صلۂ نقد وخلعت واسپ تکلیف فرمود، علامہ مرحوم موافق ضابطہ قدیم خود نپذیرفتند"[2]

علامۂ موصوف کو بھی ان دونوں سے بڑی شیفتگی تھی، آصفجاہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا اس میں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

نظام ملت و ملک افتخار اہل کرم	قوام دین و دول آفتاب مجد و علا
چو او ندیدہ امیری مہذب الاخلاق	بعینک مہ و مہر این سپہر پشت دوتا
مثال روح مصور بود بپاکی ذات	نشان عقل مجسم بود بہ فہم و ذکا
صفائی آئینہ رائے او بود چندان	کہ می نماید از و آنچہ رو دہد فردا
کرم ز دست گہر بار او بود ممنون	ظفر بہ تیغ چمن کار او بود شیدا

[1] مآثر الکرام دفتر ثانی ص۲۶۳، [2] ایضاً ص۱۸۲

ہزار شکر کہ زو مسند وزارت یافت
ہمان کہ یافت تن از دعا ذراز دم عیسےٰ

ملائک از پے آمین این دعا شدہ اند
برنگ نرگس و گل چشم و گوش فوق سما

ہمیشہ ہر دو ز ہم شاد و کامران باشند
وی از وزارت و از وی وزارت اعلیٰ[۵۱]

امیر الامرا کے قتل سے علامہ موصوف نے سینہ فگار ہو کر جو خونچکان ماتم کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

آثار کربلاست عیان از جبین ہند
ز دجوش خون آل نبی از زمین ہند

شد ماتم حسین علی تازہ در جہان
سادات گشتہ اند مصیبت نشین ہند

نیلی است زین معاملہ پیراہن عرب
وز خون گریہ سرخ شد است آستین ہند

گیتی چرا سیاہ نگردد ز دود غم
خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند

ہند این چنین مصیبت عظمیٰ ندیدہ است
دیدیم داستان شہور و سنین ہند

از داغ دل زدند چراغان اشک جوش
این است نوبہار گل آتشین ہند

ماہی در آب می طپد و مرغ در ہوا
از شیون عظیم امیر مہین ہند

ہند از شہادتش تن بے روح گشتہ است
یعنی کہ بود او نفس و اپسین ہند[۵۲]

فرخ سیر کے درباری امرا میں مرزا عبد المعالی عالی وزارت خان بھی شعر و شاعری میں طبع آزمائی کرتا تھا گرامی تخلص رکھتا تھا، مآثر الامرا میں ہے،

"وزارت خان متخلص بہ گرامی بحسنات شگرف سرآمد اوان بود، طبع موزون داشت صاحب دیوان است این شعر از و مشہور،

تا قافلہ سالار جنون فال سفر زد
دیوانۂ ما دامن صحرا بکمر زد[۵۳]

محمد شاہ
محمد شاہی عہد میں سادات کے قتل کے بعد خانہ جنگیوں کی کمی نسبتہً ضرور رہی، لیکن اس

۵۱ مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۸۲، ۵۲ ص ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۵۳ مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۲۷۶،

کے طویل زمانہ میں وہ تمام سامان ایک ایک کرکے جمع ہونا شروع ہو گئے، جو ایک عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے لئے ضروری ہیں، دربار میں اکبری الوالعزمی کے بجائے شیشہ و پیمانہ کی بدمستی تھی، شاہجہانی شوکت وحشمت کی جگہ حسرت و یاس کی تصویر تھی، اور عالمگیری جاہ و جلال کی جگہ بے بسی اور بیکسی کا عبرتناک منظر تھا، بادشاہ وقت اپنے امراء اور درباریوں کے ہاتھ میں ایک بے جان آلۂ کار رہگیا تھا، خود غرض امراء میں نہ نیت کی پاکیزگی تھی، نہ مقصد کی یکجہتی رہی سہی قوت نادر خان کی خون ریزی، مرہٹوں کی غارتگری اور روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی، تیموریوں کی عظیم الشان حکومت کی بساط اب الٹنے کو تھی، صدیوں کا لگایا ہوا چمن ہمیشہ کے لئے ویران ہونے کو تھا، اور ایک پر شکوہ تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھرنے والا تھا،

سلطنت کا دبدبہ اور حکومت کی شوکت تو جا ہی رہی تھی، مغلیہ سلاطین اپنی زبان بھی کھو بیٹھے، دربار اور بازار میں فارسی کے بجائے اب ہندوستانی زبان کا اثر و اقتدار تھا، ایک حکمران قوم سے جب دولت گئی، حشمت گئی، اور زبان بھی گئی تو پھر اس کے مٹنے میں کیا دیر تھی، صرف وقت کا انتظار تھا،

محمد شاہ نے فارسی زبان کے بجائے ہندوستانی زبان میں اپنے علمی ذوق کا اظہار کیا، بارہ ماسہ اور بکٹ کہانی دو تصانیف اس کے نام کے ساتھ منسوب ہیں، اس نے ہندوستانی زبان میں طبع آزمائی بھی کی ہے، اشعار ملاحظہ ہوں،

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی ۔۔۔ دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ گزری کا

کھول کر بند قبا دل کے تئیں غارت کیا ۔۔۔ کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا

خوف سے مار کے یاراں اسے لرزاں کرو ۔۔۔ زلف کا نام نہ لو اور پریشاں نہ کرو

مندرجۂ بالا اشعار کی زبان کتنی صاف ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی زبان دکن سے

شاہجہان آباد آگئی تھی، دلی دکنی دکن سے دہلی آئے، تو ان کی شاعری کا غلغلہ ہر طرف پھیل گیا، محفلوں میں ان ہی کی غزلوں کا چرچا ہوتا، ارباب نشاط ان ہی کی غزلیں گاتے، سنتے اور سر دھنتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کے کہنہ مشق اساتذہ بھی ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے، چنانچہ قزلباش خاں امید، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا علی قلی خان ندیم اور مرزا مرتضیٰ قلی فراق جیسے باکمال فارسی شعرا نے بھی ریختہ میں اشعار موزوں کئے ہیں[۵]، یہی نہیں بلکہ تھوڑے دنوں کے اندر درباروں، مجلسوں اور بازاروں میں فیضی، نظیری، عرفی، طالب، قدسی، صائب اور کلیم کی جگہ مظہر، سودا، میر، درد، اثر، ذوق، مومن اور غالب کی زمزمہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں کا چرچا ہو گیا، شعرا کی تمام جولانیاں ہندوستانی زبان میں ہونے لگیں، مگر شراب وہی رہی صرف شیشہ د ساغر بدل گیا،

محمد شاہ کا عہد اس لحاظ سے نہایت ممتاز تھا کہ اس میں بڑے بڑے ارباب فضل و کمال مجتمع تھے۔ فارسی شعرا میں قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان داؤد، علی قلی خان ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خان فراق، میر شمس الدین فقیر، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، فائز، شہرت، صابر، مخلص، ریختہ گوئی میں نواب عمدۃ الملک نواب عنایت خان راسخ، نواب محمد شاکر خاں شاکر، خان عالیشان جعفر علی خان، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ حاتم، میر ضاحک، میاں عبد الحئی تاباں، جعفر زٹلی، مرزا مظہر جانجاناں، اور ہندی شعرا میں اعظم خان دیوی کوی، صورت مسر وغیرہ موجود تھے، یہاں پر ہم صرف ان شعراء کا ذکر کریں گے، جن کا تعلق براہ راست محمد شاہ سے رہا،

انجام، امیر خاں نام اور نواب عمدۃ الملک خطاب تھا، عمدۃ الملک نواب امیر خاں عالمگیری کا بیٹا تھا، شعر و شاعری اور لطیفہ گوئی میں نہایت ستھرا مذاق رکھتا تھا، محمد شاہ کے نہایت محبوب

---

[۵] ان کی ریختہ گوئی کی مثال گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف میں ملاحظہ ہو،

ہم جلیسوں میں تھا، تذکرہ گلزار ابراہیم میں نواب موصوف کا ذکر اس طرح ہے،

اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآر ہوئی تھی کہ رشک تھا ان سب ارکان دولت کو اور اعیان مملکت کو حسد تھا، لطیفہ گوئی کی طرف ان کی طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف گردش چشم کے سمجھنے میں زمانے کے استاد تھے، اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد، موجد ناز و انداز کی تہ داریوں کے، اور اختراع کرنے والے چتون کی جادو کاریوں کے. گانے میں دخل ایسا تھا کہ استا اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور نادبید کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے، بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا، کہ ایک دم کی جدائی ان کی جہان پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی"[۱]

۱۱۵۶ھ میں شاہی دربار کی سازشوں سے قتل ہوا، فارسی اور ہندوستانی دونوں میں اشعار کہتا تھا[۲] اس کا دربار شعرا کا مسکن بنا ہوا تھا، بذلہ سنجیوں کی محفلیں برابر گرم رہتی تھیں، زمانہ کے تمام باکمال ارباب سخن اس کے یہاں جمع ہوتے، نواب عنایت خان راسخ اور نواب محمد شاکر خان شاکر، پانی پت سے آکر شریک بزم ہوتے تھے، شرف الدین مضمون، خواجہ ناصر عندلیب شاہ حاتم، میر ضاحک او ہندی زبان کے شعرا میں انند گھن، دیوی کوی، اور صورت مسر بھی نواب

---

[۱] گلزار ابراہیم (انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد) ص ۱۴۱ تذکرہ میر حسن میں ہے،:

"نواب امیر خان از امرائے عظام و ظرفائے عالی مقام نواب عمدۃ الملک خوش طبع و شیرین کلام از مقربان درگاہ فردوس آرام گاہ بود، لطائف و ظرائف او مشہور و معروف است (ص ۴۵ مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ)

[۲] ریختہ کے اشعار گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں،

موصوف کی علم پرور صحبتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، میر محمد شاکر ناجی نواب کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے[۵۱]، بندرا بن خوشگو نے سفینہ خوشگو اور تذکرۃ المعاصرین لکھ کر اس کی سرکار میں پیش کین، اس نے پوری قدر دانی کی، اور دو روپیہ روزینہ وظیفہ مقرر کیا[۵۲]،

خان عالیشان جعفر علی خان، مرزا مومن بیگ کا لڑکا تھا، ذہین، ذکی اور طباع شاعر تھا، محمد شاہ نے سہ ہزاری منصب پر فائز کیا، محمد شاہ کی فرمایش پر "مثنوی حقہ" لکھنی شروع کی، لیکن نامکمل رہ گئی، میاں حاتم نے اس کو پورا کیا[۵۳]

شہرت شیخ حسین شیرازی عربی النسل تھا، لیکن ایران میں نشو و نما پائی، عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آیا، محمد اعظم کا طبیب مقرر ہوا، فرخ سیر نے حکیم الممالک کا خطاب دیا، محمد شاہ کے عہد میں چار ہزاری منصب سے سرفرازی حاصل ہوئی[۵۴] ۱۱۴۹ھ میں وفات پائی، پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان چھوڑا[۵۵]،

مصطفےٰ قلی خان یکرنگ تذکرۂ میرحسن میں ہے،

"در گلشن بہار سخن آب و رنگ و در چمن گلزار معانی بلبل خوش آہنگ مصطفےٰ قلی خان المتخلص بہ یکرنگ مرد عمدہ بود، در عہد فردوس آرامگاہ نبیرۂ خان جہان لودھی در سلک ملازمان پادشاہی منسلک بود[۵۶]"

رائے انندرام مخلص، مخزن الغرائب میں مخلص کا حال اس طرح درج ہے،

"وی از اعیان چھتریان است بہ صیغۂ وکالت نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خان بہادر

---

۵۱ گل رعنا صفحہ ۱۰۱، ۵۲ معارف نمبر ۲ جلد ۳ صفحہ ۹۱، ۵۳ تذکرۂ میرحسن ص ۴۷، ۵۴ مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۰۱، ۵۵ اسپرنگر ص ۱۵۶، بوڈلین لائبریری میں اس کا دیوان موجود ہے، اشعار کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۰۲ پر ملاحظہ ہوں، ۵۶ تذکرۂ میرحسن ص ۲۱۷،

و نورالدین خان گوپاموی کہ ناظم صوبہ ارکاٹ دکن بودہ، درحضور محمد شاہ بادشاہ شرف اندوزی داشت بسبب جانی وفربہی از مجرائے بادشاہ باز ماندہ...... در شعر تلمذ از مرزا بیدل داشت، بعدازان اشعار خودرا از نظر خان آرزو گذرانیدہ، خانہ اش در شاہجہان آباد مسکن فضلا و شعراء بود [۱]

آنندرام مخلص نے تذکرہ کے نام سے ایک تاریخی کتاب بھی لکھی ہے جسمیں نادرشاہ کے حملہ کے چشمدید واقعات ہیں (الیٹ جلد ہشتم ص ۷۶)

لال رام، باپ کا نام رائے دولہ رام تھا، اس کا دادا، رائے کنجمن، عالمگیری ملازموں میں تھا، لال رام محمد شاہ کی سرکار میں نوکر تھا، ۱۱۴۸ھ میں تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھکر دربار شاہی میں تحفہ پیش کی، [۲]

محمد شاہ کا علمی کارنامہ علم ہیئت سے متعلق ہے، یہ کارنامہ اس کے درباری ہندو امیر راجہ جے سنگھ کچھواہا کے حسن ذوق، اور مساعیٔ جمیلہ سے تکمیل کو پہونچا، جے سنگھ عالمگیر اور اس کے جانشینوں کے عہد میں فوجی خدمت کے لئے ممتاز تھا، محمد شاہ کے عہد میں آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، جے سنگھ ایک کامیاب فوجی افسر اور باوقار حاکم ہونیکے علاوہ علم وہنر کا بھی سرپرست تھا، عربی علوم و فنون میں خاص دستگاہ رکھتا تھا، علم ہیئت سے اس کو بڑی دلچسپی تھی،

[۱] مخزن الغرائب قلمی نسخہ، دار المصنفین اعظم گڈھ، اسکے ریختہ کے اشعار تذکرہ میر حسن اور گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں، [۲] معارف نمبر ۲ جلد ۴ محمد شاہ کی علم نوازی کا پتہ اس سے بھی چلے گا، کہ ایک بار اس نے نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خان کو مرزا مظہر جانجاناں کے پاس بھیجکر کہلا بھیجا، کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا ہے اس میں جو کچھ چاہئے، قبول فرمائیے، لیکن مرزا صاحب کے استغنا کا یہ حال تھا کہ ہنس کر فرمایا، "قل متاع الدنیا قلیل" خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ

اس نے الغ بیگ کی زیچ جدید، ملا چاند اکبری کی تسہیلات اور ملا فرید شاہجہانی کی زیچ شاہجہانی کے اصول پر زیچ محمد شاہی ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، اس فن سے محمد شاہ کی دلچسپی اور شغف کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس کے حکم سے مسلمان، برہمن اور فرنگی علماے ہیئت جمع کئے گئے، اور ۱۱۳۷ھ میں دلی میں ایک جدید رصد خانہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا، میرزا خیر اللہ مہندس اس کا مہتمم تھا، اس رصد خانے میں بعض آلات ایسے تھے، جو سمرقند کے الغ بیگی رصد خانے میں استعمال کئے جا چکے تھے، اور بعض خود راجہ مذکور کے ایجاد کئے ہوئے تھے،

راجہ نے اس غرض سے کہ رصد خانے کی تمام تحقیقات صحیح ہوں اور ان کی تصدیق ہوتی جائے، دلی کے رصد خانہ کے نمونے پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد خانے بنوائے ان رصد خانوں میں ہندو، مسلمان، اور فرنگی علماے ہیئت نے سات برس تک کام کیا، یہی نہیں بلکہ کچھ لوگ پادری مینوئل کی معیت میں یورپ گئے، اور وہاں سے جو معلومات اور تحقیقات حاصل ہوئیں، ان کا مقابلہ یہاں کے اصولوں سے کیا گیا، پھر ان تحقیقاتوں سے زیچ محمد شاہی تیار کی گئی، جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اول در معرفت سنین، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت رفتار سیارات و ثوابت[۲] اس سلسلہ میں راجہ مذکور نے مزید قابل قدر خدمت یہ انجام دی، کہ عربی زبان کی مستند علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کرایا اور اس پر ہزاروں روپیے صرف کئے[۳]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸) میں آئی ہے وہ کہتی ہے کہ فقیر اسکی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، (گل رعنا ص ۱۲۳)

[۱] ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا مضمون "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی" (معارف نمبر ۵ ص ۳۲۹) [۲] ایضاً نیز دیکھو فہرست مشرقی کتبخانہ، پٹنہ، جلد یازدہم ص ۶۹ [۳] ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا مضمون ہذا،

محمد شاہ کے بعد مغلیہ سلطنت کی مدت کہنے کو تو ایک سو دس برس اور رہی، لیکن دلی کی حکومت بقول آزاد ایک "ٹوٹی پھوٹی ہوئی درگاہ" تھی، جس کے پانچ اور سجادہ نشین ہوئے، احمد شاہ[۱] کی وفات پر شہنشاہ عالمگیر کے وارثوں کے قبضہ میں دوآبہ اور ستلج کے چند ضلعے رہ گئے تھے، گجرات مرہٹوں کی پامالی میں تھا، بنگال، بہار اور اڑیسہ علی وردی خان کے جانشینوں کے تصرف میں تھے، اودھ میں صفدر جنگ کا پرچم لہرا رہا تھا، وسط دوآب میں بنگش حکمرانی کر رہے تھے، روہیلکھنڈ روہیلوں کے قبضہ میں تھا، پنجاب احمد شاہ درانی کو دیدیا گیا تھا، دکن میں نظام کی اولاد جھگڑ رہی تھی، ان کے علاوہ دوسرے چھوٹے چھوٹے خود مختار اپنے قدم جما رہی تھیں، ایسی حالت میں جب کہ تیموری سلاطین تو نام کے شہنشاہ رہ گئے تھے تو علم و فضل کی سرپرستی کہاں سے کر سکتے تھے،

عالمگیر ثانی[۲] کے المناک قتل کے بعد شاہ عالم بادشاہ ہوا تو پہلے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار رہا، پھر مرہٹوں کے ہاتھ لال قلعہ کے اندر ایک معزز قیدی بنا اور اس کے بعد غلام قادر کی سفاکیوں سے تیموری سلطنت کے فرمانروا کا جو انجام ہوا، وہ ارباب بصیرت کے لئے عبرت کا مقام ہے،

---

۱ اشرف علی فغاں احمد شاہ کے کوکہ تھے بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے، اسلئے احمد شاہ نے انکو ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب دیا تھا، (گلشن ہند از مرزا علی لطف ص ۱۴۱)، ۲ کہا جاتا ہے کہ عالمگیر ثانی نظام الدین اولیاء کے مزار مقدس پر پہونچکر اپنی بادشاہت کے لئے دعا کیا کرتا تھا، جب تخت کا مالک بنا تو منقبت میں یہ اشعار کہے،

جو ہوئے خادم نظام الدین کا دل سے ای عزیز
اس کے تئیں ہوتا ہے تاج خسروی جگ میں نصیب

خادمی کی تھی عزیز الدین نے باصدق و یقین
تاج شاہی ہند کا مجھ کو دیا ہے عنقریب

مرض دل افگار کا میرے وہ صحت بخش ہے
بے غذا و بے دعا و بے دوا و بے طبیب

بس پریشاں حال ہے اب خلق میں محبوب حق
فضل کر تقصیر وار دں پر ہو تم حق کے حبیب

اسی قلعہ معلی کے اندر جس کے مکینوں کی غضب آلود نگاہوں سے ہزاروں سرکش کانپ اُٹھتے تھے، خود ان کی ایک اولاد ایک ظالم سرکش کے پنجوں میں گرفتار تھی، اسی پر جلال دربار کا ایک اورنگ نشیں جس کے اسلاف کی صولت و دبدبہ کے سامنے بڑے بڑے ارباب ثروت و حشمت سر عجز و نیاز جھکاتے تھے، ایک ستم ایجاد اور باغی [illegible] تھا [illegible] بیت کے [illegible] دانش [illegible] سمجھتے تھے، ان کا ایک فرزند [illegible] بے حس [illegible] سینہ پر [illegible] روہیلہ سوار تھا، مال و دولت کی تلاش [illegible] حرم کی [illegible] کھود [illegible] تھیں، نازنینان حرم کے پھول سے رخسار طمانچوں سے سرخ کئے جا رہے تھے [illegible] دیدۂ تر سے خون کی نہریں رواں تھیں، آہ و بکا کے شور سے قلعہ معلی کے در و دیوار گونج رہے تھے، عین اسی حالت میں ایک ظالم "جفا جو اور کینہ پرور" روہیلہ نے

نکالی شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے

(اقبال)

شاہ عالم کو موت نہیں آئی، وہ پھر بادشاہ بنایا گیا لیکن وہ بادشاہ نہ تھا، دنیا کے لئے عبرت کا درس تھا، اس نے اپنی بےکسی کا ماتم خود کیا ہے،

چہ حادثہ بر خاست پئے خواری ما | داد بر باد سر و برگ جہانداری ما
آفتاب فلک رفعت شاہی بودم | بردر شام زوال آہ سیہ کاری ما
چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد | کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما
داد افغان بچہ شوکت شاہی بر باد | کیست جز ذات خدا او کہ کند یاری ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزائش این بود | چیست امید کہ بخشد گنہ گاری ما

کردہ سی سال نظارت کہ مرا داد بہ ہند | زود تر یافت تلافی ستمگاری ما
نازنینان پری چہرہ کہ ہم بزم بدند | نیست جز گل مبارک بہ پرستاری ما
حق طفلاں کہ زسی سال غذا ہم کردہ | کردہ تاراج نمودند سبکباری ما
عہد و پیمان عیاں داد دو نمودند | مجدیان خوب نمودند وفاداری ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ پروردیم | عاقبت گشت بچہ پے خونخواری ما
قوم افغان و مغلیہ ہمہ باہمی وزند | بستہ گشتند بجوز گرفتاری ما
این گدا زادۂ ہمدان کہ بدو رشتہ زد | بانی جور و ستم شد بہ دل فگاری ما
گل محمد کہ زمردان بہ شرارت کم نیست | چہ قدر کرد و کالت پے آزاری ما
نامراد[۱] و سلیمان و بدل بیگ لعین | ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاری ما
شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من | زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما
مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من است | ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند | چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما
راجہ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر | حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواری ما
نازنینان پری چہرہ کہ ہمدم بودند | نیست جز مغل مبارک بہ پرستاری ما

گرچہ[۲] ما از فلک امروز حوادث دیدیم
باز فردا بدہ ایزد سر سرداری ما

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاہ عالم سخن گوئی میں کافی مہارت رکھتا تھا، اس کا تخلص آفتاب

۱؎ ایک دوسرے نسخہ میں نامراد کے بجاے اللہ یار لکھا ہے،
۲؎ " " " " گرچہ ماکے بجاے آفتاب ہے،

تھا، فارسی اور ہندوستانی دونوں زبان میں اشعار موزوں کیا کرتا تھا، محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ وہ بڑا مشتاق شاعر تھا، جس کے چار دیوان اردو میں موجود ہیں[1] لیکن انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ایک ہی جلد ہے[2] برٹش میوزیم، بوڈلین[3] اور اسپرنگر کی فہرست میں بھی ایک ہی کا ذکر ہے[4] انڈیا آفس لائبریری کے دیوان میں شاہ موصوف کی ایک مثنوی موسوم بہ "منظوم اقدس" بھی شامل ہے جس میں شاہ چین مظفر شاہ کا قصہ ہے، مولوی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ شاہ عالم نے نثر میں چار جلدوں میں ایک قصہ بھی لکھا ہے، جس سے ہر زمانہ کے ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ آدمیوں کا طرز معاشرت معلوم ہوتا ہے، اس کا نام شاہ عالم کا قصہ ہے[5]

شاہ عالم نے اپنے عہد کے تمام ممتاز شعراء مثلاً، سودا، میر، درد، نصیر، انشاء، آزاد، ممنون، احسان، قاسم اور فراق سے کچھ نہ کچھ ضرور واسطہ رکھا، جہاں دہلی کے تمام شعراء جمع ہو کر اپنی جولانی طبع دکھاتے تھے، وہاں شاہ عالم اپنی غزلیں بھیجتا تھا، سودا کو اپنا کلام دکھاتا تھا[6] خواجہ میر درد کے یہاں محفل سماع میں شرکت کرنے کے لئے کئی بار گیا، ایک بار پانوں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکا، ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ صاحب اس کے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا کہ یہ امر فقیر کی محفل کے آداب کے خلاف ہے، شاہ عالم نے عذر کیا، اور معافی چاہی، خواجہ صاحب نے فرمایا اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی[7] سید انشاء اللہ خان انشاء کو خاص طور سے بہت محبوب رکھتا تھا، ان کی ایک لمحہ کی جدائی اسکو گوارا نہ ہوتی تھی[8] مگر عبرت کا مقام یہ ہے کہ جس کے اسلاف ایک ایک شعر کے صلہ میں شعراء کا منہ زر و جواہر سے بھرتے تھے، اور ان کو سونے چاندی

---

[1] آب حیات صفحہ ۳، [2] ملاحظہ ہو انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ جلد صفحہ ۹۳، [3] ″ صفحہ ۶۲، [4] ″ صفحہ ۳۱، [5] تاریخ ہندوستان جلد دہم صفحہ ۳۱۱، [6] آب حیات صفحہ ۲۲۲، [7] گل رعنا صفحہ ۱۳۳، [8] ″ صفحہ ۱۷، [9] آب حیات صفحہ ۲۴۱،

میں تلواتے تھے، آج ان کے وارث کے پاس اتنا بھی نہ تھا، کہ اپنے محبوب شاعر کے بچوں کے لئے دو دو کھجوریں لیجانے کے لئے کچھ رقم دیتا[1]

شاہ عالم کی اردو شاعری کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

کیجئے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا
ہم تو بندے اس کے ہوں وہ یار ہو اغیار کا

خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سو اُس نے آہ
ہو جیو یارب بھلا اس چشم آتشبار کا

عاشقوں کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سو پکار
کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا

خون ہو دیگا گلوں کو دیکھنا ہرگز صبا
نام مت لینا چمن میں اس بت خونخوار کا

کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے
یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا

دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب
کوئی بھی جا نبر ہوا بیمار اس آزار کا

صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ
ڈھونڈھ جا کر ہر طرف نقش قدم دلدار کا

اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا

صبح تو جام سے گزرتی ہے،
شب دل آرام سے گزرتی ہے،

عاقبت کی خبر خدا جانے،
اب تو آرام سے گزرتی ہے،

وله

تصور ترا جس کو اے یار ہوگا
اوسے غیر سے کیا سروکار ہوگا،

مرا لخت دل اشک میں ڈھونڈنا
اسی قافلہ میں وہ سالار ہوگا،

دیا دل تو ہے آفتاب اوسکو لیکن
خدا جانے کیا عاقبت کار ہوگا،

---

[1] آب حیات صفحہ ۲۴۶،

ولہ

چھیڑنے کا تو مزہ یہ ہے کہو اور سنو
بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

ولہ

آئے جو خواب میں بھی وہ یوسف لقا تو ہم
اسے آفتاب دولتِ دیدار سمجھئے

جوں شمع تا سحر شبِ فرقت میں آفتاب
بے اختیار مجھ کو رلاتی ہے چاندنی

تری اس مانگ سے کیا معنی دو نخواہ ہے پیدا
شبِ معراج کی اس خط سے گویا راہ ہے پیدا

مدت سے اشتیاق ہے پیارے جو آئیے
بٹھلا رواق چشم میں سیر یہ دکھائیے

(باقی)

لہ یہ اشعار تذکرۂ گلزار ابراہیم (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) تذکرۂ ہندی مصنفہ مصحفی اور گلشن بیخار سے لئے گئے ہیں،

فن عروض کی جدید تشکیل

از

پروفیسر عبد المجید صاحب ایم اے، پٹنہ کالج

فن عروض جس شکل میں بزرگوں سے ہم تک پہنچا ہے وہ میرے خیال ناقص میں طلبہ کے لئے نہ صرف مشکل ہی ہے بلکہ اس کا ایک معتد بہ حصہ غیر ضروری بھی ہے، میں نے اس فن کو پڑھانے میں اکثر محسوس کیا کہ اس کی موجودہ شکل میں بہت کچھ ترمیم اور تنسیخ کی ضرورت ہے اور اگر تھوڑی توجہ سے اس کام کو کیا جائے تو یہ ضروری فن طلبہ کے لئے اس قدر خوفناک نہ رہے، جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، اس ضرورت کو غالبًا موجودہ دور کے اکثر اساتذہ اور مصنفینِ فن نے محسوس کیا ہے اور انھوں نے اس کی کوشش بھی کی ہے کہ اس فن کو کسی قدر آسان بنائیں، لیکن یہ کوشش صرف اسی قدر ہوئی کہ بعض غیر مستعمل بحریں ترک کردیں، یا صرف کثیر الاستعمال زحافات کا ذکر کیا باقی کو چھوڑ دیا، غرض تسہیلِ فن میں کوئی اصولی کوشش نہیں کی گئی ہے، میری ناچیز کوشش جو آپ کے سامنے ہے ایک اصولی کوشش ہے اور باوجودیکہ اس صورت میں یہ فن بہت مختصر اور سہل ہوگیا ہے لیکن عروض کے اجزاء، بحور، زحافات وغیرہ تمامہا اس میں شامل ہیں،

عروض کی اس جدید تشکیل کا اصول یہ رکھا ہے کہ مختلف چیزیں جو کسی ایک عام قاعدہ کے تحت آسکتی ہیں، انھیں اس قاعدہ کے ماتحت لاکر سہولت اور اختصار پیدا کیا جائے، آپ دیکھیں گے کہ بحریں افاعیل سے بنتی ہیں اور افاعیل صرف آٹھ ہیں اس لئے اصلی بحریں صرف آٹھ ہی ہونی چاہئیں، نہ کہ انیس ۱۹، مفرد بحریں درحقیقت سات ہی ہیں، بقیہ بارہ ۱۲ بحریں

ان ہی سات بحروں سے مرکب ہوتی ہیں، اس لئے میں نے سات بحریں مفرد اور اصلی قرار دیں اور بارہ بحریں ان ہی کے تحت میں لاکر مرکب قرار دیں، چنانچہ طالب العلم کو اب بجاے انیس[19] بحروں کے صرف آٹھ بحروں کے نام اوران کے ارکان یاد کرنے پڑیں گے، مرکب بحروں کے نام اور ارکان اُن ہی سے یاد ہو جائیں گے،

اسی طرح کثیر التعداد زحافات ایسے ہیں جن کا عمل ایک ہی ہے، مثلاً کسی متحرک حرف کو ساکن کرنا، اب یہ عمل اگر مفعولاتُ میں ہوتا ہے تو اس کا نام وقف ہے اور مُتَفَاعلن میں ہوتا ہے تو اس کا نام اضمار اور مفاعلتُن میں ہوتا ہے تو اس کا نام عقب ہے، میں نے ان تینوں مختلف ناموں کے بجاے ایک کام کیلئے ایک ہی نام قرار دیا، اس طرح مفرد زحافات جو ستائیس تھے پندرہ[15] رہ گئے، اور مرکب زحافات جو سولہ[16] تھے وہ مفرد زحافات میں شامل ہوگئے، غرض زحافات کی مجموعی تعداد جو تینتالیس[43] تھی اب صرف پندرہ[15] رہ گئی،

اس صورت میں ہر اوسط درجہ کا طالب العلم اس فن کو حافظہ پر غیر ضروری بار ڈالے بغیر چند دنوں میں حاصل کر سکتا ہے، ممکن ہے کہ میری کوشش میں بعض خامیاں یا فروگذاشتیں ہوں لیکن اگر اربابِ فن میرے اصول سے اتفاق کریں تو مزید اصلاح اور ترمیم ہوسکتی ہے، میں تمام اہلِ فن سے متوقع ہوں کہ اس ناچیز کوشش پر نظرِ توجہ ڈالیں گے اور اپنے خیالات سے مجھے سرفراز فرمائیں گے،

"عبد المجید، پٹنہ کالج"

سالم بحور کے ناموں میں تخفیف

انیس بحروں میں سات بحریں مفرد ہیں، بقیہ بارہ[12] بحریں ان ہی مفرد بحروں سے مرکب ہوئی ہیں، اوران کے نام الگ الگ رکھدیئے گئے ہیں، اس وجہ سے انیس بحروں کے نام یاد کرنے پڑتے ہیں، اگر مرکب بحروں کے نام بھی مرکب رکھدیئے جائیں

تو صرف سات مفرد اور ایک مرکب بحر یعنی آٹھ بحروں کے نام یاد کرنے پڑیں گے، ان کی صورت یہ ہوگی،

(۱) **بحر ہزج**، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مثمن سالم،

(۲) **بحر رجز**، مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن، 〃

(۳) **بحر رمل**، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، 〃

(۴) **بحر متقارب**، فعولن، فعولن، فعولن، فعولن، 〃

(۵) **بحر کامل**، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن متفاعلن، 〃

(۶) **بحر وافر**، مفاعلتن، مفاعلتن، مفاعلتن، مفاعلتن، 〃

(۷) **بحر متدارک**، فاعلن، فاعلن، فاعلن، فاعلن،

(۸) **رجز مرکب**، مفعولات اور مستفعلن کی ترکیب سے جو بحریں بنی ہیں انکا نیا نام رجز مرکب رکھا گیا،

(الف) مستفعلن، مفعولاتُ، مستفعلن، مفعولاتُ، مثمن (اس بحر کا نام منسرح تھا)

(ب) مفعولاتُ مستفعلن، مفعولاتُ، مستفعلن، 〃 (اس بحر کا نام مقتضب تھا)

(ج) مستفعلن، مستفعلن، مفعولاتُ، (مسدس) (اس بحر کا نام سریع تھا)

(۹) **ہزج، رمل یا رمل ہزج**،

(الف) مفاعیلن، فاعلاتن، مفاعیلن، فاعلاتن، مثمن، (اس بحر کا نام مضارع تھا)،

(ب) مفاعیلن، مفاعیلن، فاعلاتن، مسدس (اس بحر کا نام قریب تھا)

(ج) فاعلاتن۔ مفاعیلن، مفاعیلن، مسدس (اس بحر کا نام مشاکل تھا)

(۱۰) **رمل رجز** (الف) فاعلاتن، فاعلاتن، مستفعلن، مسدس (اس بحر کا نام جدید تھا)

یا رجز۔ رمل (ب) فاعلاتن، مستفعلن، فاعلاتن، مسدس، (اس بحر کا نام خفیف تھا)

(ج) مستفعلن، فاعلاتن، مستفعلن، فاعلاتن، مثمن، (اس بحر کا نام مجتث تھا)

(۱۱) رجز۔ متدارک، مستفعلن، فاعلن، مستفعلن فاعلن (اس بحر کا نام بسیط تھا)

(۱۲) متقارب۔ ہزج، فعولن، مفاعیلن، فعولن، مفاعیلن، مثمن (اس بحر کا نام طویل تھا)

(۱۳) رمل۔ متدارک، فاعلاتن، فاعلن، فاعلاتن، فاعلن، مثمن (اس بحر کا نام مدید تھا)

مفرد زحافات | کئی کئی زحافات مختلف ارکان پر ایک ہی عمل کرتے ہیں، لیکن نام سب کے جدا جدا ہیں، ہم نے اس قسم کے واحد العمل زحافات کو یکجا کرکے ایک کے لئے صرف ایک نام قرار دیا ہے اور ستائیس زحافات کو صرف پندرہ زحافات میں جمع کر دیا ہے، اب طالب العلم کو صرف ان ہی پندرہ زحافات کو یاد کر لینے سے کل زحافات پر عبور ہو جائے گا،

۱۔ اسکان، کسی حرف کو ساکن کرنا جیسے مفعولات سے مفعولاتْ، متفاعلن سے متْفاعلن، مستفعلن، مفاعلتن سے مفاعلْتن، مفاعیلن (مسکن) } وقف[1]۔ اضمار[2] اور عصب[3] کی جگہ صرف ایک نیا نام اسکان رکھا گیا،

۲۔ خرم، کسی رکن کے پہلے حرف کو گرا دینا، جیسے مفاعیلن سے فاعیلن۔ مفعولن سے فعولن، فعولن سے عولن فعْلن، مفاعلتن سے فاعلتن۔ مفتعلن، (اخرم) } خرم[4]، ثلم[5] اور عضب[6] کی جگہ صرف ایک نام خرم رکھ دیا گیا،

۳۔ خبن، کسی رکن کے دوسرے حرف کو گرا دینا جیسے فاعلن سے فعلن، فاعلاتن سے فعلاتن، مستفعلن سے متفعلن، مفاعلن، مفعولاتُ سے معولاتُ، فعولاتُ، متفاعلن سے مفاعلن، (مخبون) } خبن[7] و وقص[8] کی جگہ ایک زحاف صرف خبن رکھ دیا گیا،

---

[1] وقف، مفعولات کی ت کو ساکن کرنا [2] اضمار، متفاعلن کی ت کو ساکن کرنا [3] مفاعلتن کی ت کو ساکن کرنا [4] خرم پہلے وتد مجموع کے پہلے حرف کو گرا دینا جیسے مفاعیلن سے فاعیلن۔ مفعولن [5] ثلم۔ فعولن سے پہلے حرف کو گرا دینا [6] عضب۔ مفاعلتن سے پہلے حرف کو گرا دینا [7] خبن، دوسرے حرف ساکن کو گرا دینا [8] وقص، دوسرے حرف متحرک کو گرا دینا،

۴۔ **طی**، کسی رکن کے چوتھے حرف کو گرا دینا جیسے مستفعلن سے مُستَعِلُن = مفتعِلُن، مفعولات سے مَفعُلات۔ فاعلاتُ، مفاعلتن سے مفاعِلتُن، مفاعلن، (مطوی) — طی[1] اور عقل[2] کی جگہ صرف ایک ہی زحاف طی رکھدیا گیا،

۵۔ **قبض**، کسی رکن کے پانچویں حرف کو گرا دینا، جیسے مفاعیلن سے مفاعلن، فعولن سے فعولُ، (مقبوض) — قبض[3] اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی،

۶۔ **کف**، کسی رکن کے ساتویں حرف کو گرا دینا جیسے مفاعیلن سے مفاعیلُ، فاعلاتن سے فاعلاتُ، مستفعلن سے مستفعلُ، مفعولاتُ سے مفعولا، فعولن، (مکفوف) — کف[4] و کسف[5] کو ملاکر صرف ایک نام کف رکھدیا گیا،

۷۔ **حذف**، کسی کے اول یا آخری سبب خفیف کو گرا دینا، جیسے مفعولاتُ سے عولاتُ۔ مفعولُ۔ فعولن سے فعو فَعُل، مفاعیلن سے مفاعی، فعولن۔ (محذوف) — یہاں رفع[6] اور حذف[7] کو ملاکر صرف ایک نام حذف رکھدیا گیا،

۸۔ **صلم**، کسی رکن کے آخری وتد کو گرا دینا جیسے مفعولاتُ سے مفعوٗ فِعلُن، فاعلن سے فا، فَعْ، مستفعلن سے مستفْ، فِعلُن، متفاعلن سے متفا، فَعِلُن (اصلم) — صلم[8] و حذذ[9] کو ملاکر صرف ایک نام صلم رکھدیا گیا،

۹۔ **جبت**۔ مفاعیلن کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا، مفاعیلن سے مفا، فَعُل (مجبوب) — جبت[10] اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی،

---

[1] طی۔ چوتھے حرف ساکن کو گرا دینا، [2] عقل، چوتھے حرف متحرک کو گرا دینا [3] قبض، پانچویں حرف ساکن کو گرا دینا [4] کف، ساتویں حرف ساکن کو گرا دینا، [5] کسف، مفعولات کی "ت" (ساتویں حرف متحرک) کو گرا دینا، [6] رفع۔ پہلے سبب خفیف کو گرا دینا، [7] حذف، آخری سبب خفیف کو گرا دینا [8] صلم، مفعولاتُ (یعنی آخر رکن سے) وتد مفروق کو گرا دینا، [9] حذذ۔ آخر رکن کے وتد مجموع کو گرا دینا، [10] جبت مفاعیلن کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا،

۱۰- **جدع** ۔ مفعولاتُ کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا اور ت کو ساکن کرنا، مفعولاتُ ، لاتْ ، فاعْ (مجدوع)

جدع[1]

۱۱- **قطع** ، رکن کے آخری حرف کو گرا دینا اور اس کے قبل کے حرف کو ساکن کرنا ، جیسے مفاعیلن سے مفاعیلْ ، فاعلاتن سے فاعلاتْ یا فاعلان ، فعولن سے فعولْ ، فاعلن سے فاعل ، فعلُن ، مستفعلن سے مستفعِل ، مفعولن ، متفاعلن سے متفاعِل ، فعِلاتن ، (مقطوع)

قصر[2] و قطع[3] کو ملا کر صرف ایک نام قطع رکھدیا گیا،

۱۲- **تسبیغ** ۔ کسی رکن کے نون (ن) کے قبل الف بڑھانا جیسے مستفعلن سے مستفعلان ، فاعلن سے فاعلان ، متفاعلن سے متفاعلان ، مفاعیلن سے مفاعیلان ، فعولن فعولان ، فاعلاتن سے فاعلاتان ، (مسبّغ)

اذالہ[4] و تسبیغ[5] دونوں کو ملا کر صرف ایک نام تسبیغ رکھدیا گیا

۱۳- **ترفیل** ، رکن کے آخر میں ایک سبب خفیف بڑھانا ، جیسے متفاعلن سے متفاعلن ، تن ، متفاعلاتن ، مستفعلن سے مستفعلن ، تن ، مستفعلاتُن ، فاعلن سے فاعلن ، تن ، فاعلاتن ، (مرفل)

ترفیل[6] اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

۱۴- **تشعیث** ، فاعلاتن کو مفعولن بنانا ، (مشعث)

تشعیث[7] اسمیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

۱۵- **نحر** ۔ مفعولاتُ اور فاعلاتن سے فعْ بنانا ، (منحور)

یہاں دو زحافوں نحر[8] و سلخ[9] کو ملا کر ایک نام نحر رکھدیا گیا،

---

[1] جدع ، مفعولاتُ کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا اور ت کو ساکن کر دینا [2] قصر ، رکن کے آخری سبب سے حرف ساکن کو گرا دینا اور اس کے قبل ساکن کر دینا ، [3] قطع ، رکن کے آخری وتد مجموع سے آخر حرف کو گرا کر اس کے قبل کے حرف کو ساکن کرنا ، [4] اذالہ ، کسی رکن کے آخری وتد مجموع میں الف بڑھانا ، [5] تسبیغ ، رکن کے آخری سبب خفیف میں الف بڑھانا ، [6] ترفیل ، آخری وتد مجموع پر ایک سبب خفیف بڑھانا ، [7] تشعیث ، وتد مجموع کے پہلے یا دوسرے متحرک حرف کو گرا دینا ، فاعلاتن سے فالاتن یا فاعاتن ہو کر مفعولن کے برابر ہو گیا ، [8] نحر ، مفعولاتُ کے دونوں سبب خفیف کو اور ت کو گرا دینا ، فع ، [9] سلخ ۔ فاعلاتن سے فع بنانا ،

مرکب زحافات مرکب زحافات تعداد میں سولہ ہیں، اور ہر ایک کا نام علیحدہ ہے، میرے خیال ناقص میں ان مرکبات کے خاص ناموں کے بجائے اگر ان کو ان مفرد زحافوں سے موسوم کیا جائے جن سے ان کی ترکیب ہوئی ہے تو ان خاص سولہ ناموں کی بالکل ضرورت نہیں رہے گی، مثال کے طور پر خرب کو پیش کرتا ہوں جو کف اور خرم سے مرکب ہے، اب جس بحر میں یہ زحاف ہو اسکو اخرب نہ کیا جائے بلکہ اس کو مکفوف اخرم سے موسوم کیا جائے، (کف وخرم کی تعریف مفرد زحافات میں معلوم ہو چکی ہے) اس طرح سولہ ناموں کی تخفیف ہو جائے گی، اور صرف ان ہی زحافوں کی تکرار ہوگی جن کا ذکر میں نے مفردات میں کیا ہے،

۱۔ **خرب**۔ کف وخرم کا ایک جگہ جمع ہونا، جیسے مفاعیلن سے فاعیلُ، مفعولُ،	اس زحاف کو خرب نہیں کہینگے، بلکہ جس بحر میں یہ زحاف ہو اس کو مکفوف اخرم کہیں گے،
۲ و ۳۔ **شتر**، قبض وخرم کا مفاعیلن میں جمع ہونا، ثرم۔ قبض وخرم کا، فعولن میں جمع ہونا، مفاعیلن سے فاعلن اور فعولن سے عولُ، فعلُ ہوا،	اس کا نام مقبوض اخرم ہوگا،
۴۔ **بتر**[ا]۔ حذف وقطع کا فاعلاتن وفعولن میں جمع ہونا یا خرم وجب کا مفاعیلن میں جمع ہونا، فاعلاتن سے فاعلُ، فعلن، مفاعیلن سے فا، فع اور فعولن سے فع،	اس کا نام محذوف مقطوع ہوگا (فاعلاتن اور فعولن میں) یا اخرم مجبوب ہوگا، (مفاعیلن میں)
۵۔ **شکل**۔ خبن اور کف کا جمع ہونا جیسے فاعلاتن سے فعلاتُ،	اس کا نام مخبون مکفوف ہوگا،

[ا] فاعلاتن اور فعولن میں حذف وقطع کے جمع ہونے کو اور مفاعیلن میں خرم اور جب کے جمع ہونے کو بتر کہتے ہیں، یعنی بتر کی دو تعریفیں ہیں،

۶- **قصم**، عصب و خرم کا جمع ہونا، جیسے مفاعلتن سے فاعلتن، مفعولن،	اس کا نام اخرم مسکن ہونا، (عصب کا نام میں نے مفرد زحافات میں اسکان رکھا ہے)
۷- **ہتم**، حذف و قصر کا جمع ہونا جیسے مفاعیلن سے مفاع، فعولْ،	اس کا نام محذوف مقطوع ہوگا (مفرد زحاف میں میں نے قصر کو قطع کے تحت میں کر دیا ہے)
۸- **زلل**، خرم و ہتم کا جمع ہونا جیسے مفاعیلن سے فاعْ،	محذوف مقطوع اخرم اس کا نام ہوگا، (ہتم چونکہ خود ایک مرکب زحاف ہے، اس لئے اس کے تین مفرد نام ہوئے)
۹- **نقص**، عصب اور کف کا جمع ہونا جیسے مفاعلتن سے مفاعلتُ، مفاعیلُ	اس کا نام مسکن مکفوف ہوگا، (عصب کا نیا نام خود زحاف میں اسکان رکھا گیا ہے)
۱۰- **خلع**۔ خبن و قطع کا جمع ہونا جیسے مستفعلن سے متفعلْ، فعولن،	اس کا نام مخبون مقطوع ہوگا،
۱۱- **عقص**۔ خرم و نقص کا جمع ہونا جیسے مفاعلتن سے فاعلتْ، مفعول،	اس کا نام اخرم مسکن مکفوف ہوگا، (چونکہ نقص خود ایک مرکب زحاف ہے، اس لئے اس کا نام تین مفرد زحافوں پر مشتمل ہے)
۱۲- **خبل**، خبن و طی کا جمع ہونا جیسے مفعولاتُ سے معلاتُ، فعلاتُ،	اس کا نام مخبون مطوی ہوگا،
۱۳- **خزل**، اضمار و طی کا جمع ہونا، جیسے متفاعلن سے متفعلن، مفتعلن،	مسکن مطوی (مسکن، مضمر کی جگہ ہے)
۱۴- **جمم**۔ خرم و عقل کا جمع ہونا جیسے	اخرم مسطوری، (عقل کی جگہ طی ہے)

مفاعلتن سے فاعلتن و فاعلن،

۱۵- ربیع - خبن و بتر کا جمع ہونا جیسے فاعلاتن سے فعل	مجنون محذوف مقطوع (دیکھو بتر کی تعریف)
۱۶- قطف. عصب و حذف کا جمع ہونا جیسے مفاعلتن سے مفاعل، فعولن	مسکن محذوف،

چند نئی کتابیں

دلی کا سنبھالا - از خواجہ محمد شفیع دہلوی (مرحوم) دہلی کے ایام عروج کی مرقع نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے، جواب نابود ہے، انداز بیان ایسا موثر ہے کہ دل بے اختیار ہوجاتا ہے، قیمت عہ

لطائف غالب، مسنر ایم اے شاہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخی بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے، قیمت ۳ ر

سبد چین، مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں ان کے وہ فارسی قطعات، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں جو ان کی کلیات میں موجود نہیں، ۱۲

ذکر غالب، مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند ترین سوانح عمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں، اور جو طلبہ کے لئے خاص طور سے بہت مفید ہے، قیمت ۸ ر

قرآن کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا (از عبد الواحد سندھی) استاذ مدرسہ جامعہ بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدنظر رکھکر تیار کی گئی ہے مسلمان بچوں کے لئے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی، قیمت: ۶ ر

دلی - بچوں کے لئے دلی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ تیار کی گئی ہے، بلاک کی ۶ تصاویر دو نقشے، قیمت ۴ ر

تلخیص و تبصرہ

سیرت کا مولد

ڈاکٹر اوسوالڈ شوارز (Oswald Schwarz) پروفیسر ویانا یونیورسٹی کا ایک پرمغز مقالہ "سیرت کا مولد" (The Birthplace of Character) کے عنوان سے ہبرٹ جرنل بابت اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے، مضمون کی اہمیت کا تقاضا ہے، کہ ناظرین کے غور و فکر کے لئے اس کا پورا ترجمہ پیش کر دیا جائے:-

جدید علم النفس کے اہم ترین انکشافات میں سے ایک انکشاف یہ ہے کہ ہماری راحت و مسرت نیز ہمارے تمام مصائب، مشکلات، مسائل، اور غیر معمولی کیفیات جو زندگی میں آگے چل کر پیش آتی ہیں، انکی بنیادیں تقریباً ہمیشہ ہمارے بچپن کے ابتدائی چند سالوں میں رکھی جاتی ہیں،

یہی وہ نظریہ ہے جسے اس مقالہ میں ثابت کرنا ہے،

(۱)

یہ صحیح ہے کہ چونکہ ہم اپنے والدین کے وجود مادی کا حاصل ہیں، اس لئے ان کی بعض کیفیات و خصوصیات ورثہ میں پاتے ہیں، لیکن اہل سائنس اور اُن سے زیادہ عامی لوگ توارث کی اہمیت میں بہت زیادہ مبالغہ کرتے آئے ہیں،

ایک ناتجربہ کار شخص مشکل اس انتہائی دقت کو یقین کرے گا، جو یہ متعین کرنے میں پیش

آتی ہے، کہ آیا کوئی مخصوص کیفیت موروثی ہوسکتی ہے، یا کسی خاص صورت میں یہ ورثہ میں حاصل کی گئی ہے، کیونکہ ابھی تک ہمیں انتقال پذیر کیفیات کی کوئی فہرست معلوم نہیں ہوسکی ہے، لیکن تجربہ سکھاتا ہے کہ کسی کیفیت کو موروثی قرار دینے میں بہت احتیاط کرنی چاہئے، کیونکہ مزید تجربہ سے اکثر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک خصلت جو بظاہر موروثی معلوم ہوتی ہے، وہ گرد وپیش کے حالات کا ردِ عمل ہے، یہ بات خصوصیت کے ساتھ ہر قسم کے جذبات کی نسبت صحیح ہے، اصلی (موروثی) اور ثانوی (ماحولی) خصائل کے درمیان امتیاز کرنے کا واحد قابلِ اعتماد طریقہ یہ ہے، کہ احتیاط ومحنت کیساتھ ان تمام خصوصیات کی تفتیش وتحقیق کیجائے، جو قبل اس کے کہ بچہ میں اپنے ماحول کا اثر متعین طور پر قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہوسکے ظاہر ہو جاتی ہیں،

حسب ذیل وہ معدودے چند خصوصیات ہیں جن کو اکثر ماہرین علم النفس بالاتفاق اصلی خیال کرتے ہیں،:۔

۱۔ حرکت پذیری (Mobility) دو ماہ اور اس سے زیادہ عمر کے بچوں میں دیکھا گیا ہے، کہ ایک بچہ دوسرے بچہ کے مقابلہ میں تین سو گنا زیادہ حرکت خود بخود بلا تحریک غیر کرتا ہے، پس پھرتی اور سستی کے درمیان وسعت بہت زیادہ ہے،

۲۔ قوتِ رفتار (Tempo or Speed) ایک بچہ اپنی جسمانی حرکتوں نیز اپنی دماغی سرگرمیوں میں خلقی طور پر سست یا پھرتیلا ہوسکتا ہے،

۳۔ قوت واہمہ (Phantasy) یہ چیز ان متعدد اور مختلف طریقوں میں ظاہر ہوتی ہے، جو بچہ معمولی کھیل کی چیزوں کے استعمال کرنے میں خود اپنے جی سے اختیار کرتا ہے، اسکی جانچ ۶ ماہ سے آٹھ ماہ تک کی ابتدائی عمر میں بھی ہوسکتی ہے، اور اسکی زیادتی صفر سے ساٹھ درجہ تک ہوتی ہے،

۴۔ استقلال (Perseverance) اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے، کہ بچہ کتنی دیر تک ایک قسم کے کھلونے سے از خود کھیل جاری رکھ سکتا ہے،

۵۔ قوتِ اختراع (Initiative.) اپنے کھلونے کو سلیقہ کے ساتھ استعمال کرنیکی قابلیت، اسکی جانچ چھ مہینے کی عمر سے ہو سکتی ہے،

۶۔ صحبت پسندی (Sociability) اس لحاظ سے بچّوں کی تین قسمیں چھ مہینے کی عمر سے واضح طور پر نظر آتی ہیں، جب وہ یکجا ہوں گے، تو ایک بچہ دوسرے بچہ کی طرف بڑھیگا یا اس کے کھلونے چھینے گا، دوسرا بچہ ان پیش قدمیوں یا حملوں کو چپ چاپ بغیر کسی مزاحمت کے گوارا کرے گا، تیسری قسم کا بچہ اپنے ہی کھلونوں سے کھیلنے میں مگن رہتا ہے، اور دوسرے بچّوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا،

۷۔ ذکاوت (Intelligence) بلاشبہ موروثی چیز ہے، جوں جوں بچہ بڑھتا ہے، ذکاوت ترقی کرتی جاتی ہے، لیکن اس کے امکانی حدود توارث سے متعین ہو چکے ہیں، چنانچہ تعلیم یا زندگی کے تجربات سے ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی،

۸۔ مخصوص اوصاف (Specil endowments.) مثلاً موسیقی، ریاضیات، نقشہ کشی، فنی اور صنعتی مہارت، اور مختلف زبانوں کے لئے طبیعت کی خاص مناسبت، اس چیز کو انتقال پذیر سمجھنا چاہئے،

خلقی خصائل کی یہ وہ مختصر فہرست ہے، جسے تجربی نفسیات نے حددرجہ احتیاط کیساتھ گذشتہ چند سالوں میں مرتب کیا ہے، ان تحقیقات کی سائنٹفک قدر و قیمت کو کم کرکے دکھلائے بغیر یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا، کہ عملی نقطۂ نظر سے اس فہرست کی قیمت اُن مشکلات و مسائل کے سامنے بہت کم رہ جاتی ہے، جو فرض کیجئے کہ چودہ ۱۴ سال کے ایک ایسے لڑکے کے معاملہ میں

پیش آتے ہیں، جو کاہل سست یا آمادۂ پے کار ہے، یا جس میں ایجاد و اختراع یا استقلال وغیرہ کی کمی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر پسندیدہ یا ناپسندیدہ خصلت خلقی بھی ہو سکتی ہے، اور اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ کی چودہ۱۴ سال کی زندگی میں پیدا ہو گئی ہو، اگرچہ گذشتہ تیس سالوں میں تحلیلی نفسیات (Analytic psychology) نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے، تاہم کسی شخص کے اصلی اور ثانوی خصائل میں فی البدیہہ امتیاز کر لینا اب بھی ناممکن ہے، خصائل کی یہ دونوں قسمیں باہم اس قدر متشابہ ہیں، اور ماحول کے اثرات اتنے مکمل طور پر فطری اور جبلی ملکہ کو بدل دے سکتے ہیں، کہ ان دونوں قسموں میں کسی تیقن کے ساتھ فرق کرنا اسی وقت ممکن ہے، جب کامل احتیاط اور دقتِ نظر کے ساتھ کسی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے، اسی لئے جدید علم النفس نے یہ اصول اختیار کیا ہے، کہ اس قسم کے تمام ناپسندیدہ خصائل جیسے استقلال کی کمی، ضد، کاہلی، ہمہ تن متوجہ نہ ہو سکنا، ظاہر داری وغیرہ (اور بعض پسندیدہ خصائل بھی مثلاً حُبِّ جاہ، جرأت، کسی چیز سے مخصوص طور پر دلچسپی لینا، اطاعت وغیرہ) کو حاصل کردہ سمجھنا چاہیے، اور اس بنا پر ان کا نفسیاتی تدبیر کے اثر سے تغیر پذیر ہونا بھی تسلیم کر لینا چاہئے، صرف اسی وقت جب تدبیر بالکل ناکام ثابت ہو جائے، جیسا عملاً کبھی نہیں ہوتا، یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ بعض خصائل ممکن ہے، کہ خلقی اور جبلی رہے ہوں، اور ان میں تغیر نہ ہو سکتا ہو، جدید علم النفس کی یہ بات قابلِ ستایش ہے، کہ اس نے یہ امیدانہ انداز تعلیم میں جاری کر دیا،

(۲)

جیسا کہ ہم پہلے سے جانتے ہیں، یہ ثانوی (حاصل کردہ) خصائل بچہ پر خاندان کے اثر کا نتیجہ ہوتے ہیں، لہذا اس امر پر زور دینے کی ضرورت نہیں، کہ ایک معمولی، اور اس سے بڑھکر ایک غیر معمولی بچہ کی نفسیات کا قابلِ اعتماد علم صرف خاندان کی نفسیات کی بنا پر ہو سکتا ہے، خاندان آدمیوں کی

کوئی بھیڑ نہیں ہے، اور نہ وہ کوئی اتفاقی اجتماع ہے، بلکہ وہ ایک وحدت ہے، ایک معین ڈھانچہ ہے جس کا ہر جزو یا رکن تمام دوسرے اجزا یا ارکان سے مربوط و متحد ہوتا ہے، اثر اندازی اور اثر پذیری کا ایک سلسلہ ہے، جو مستقل طور پر جاری رہتا ہے، اور ہر رکن کا وجود و کردار ایک ناقابل یقین حد تک تمام دوسرے ارکان کے وجود و کردار کا نتیجہ اور ردّ عمل ہوتا ہے،

معمولی ساخت کا خاندان ایک باپ اور ایک ماں پر مشتمل ہوتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کا ایک معین رتبہ ہوتا ہے، باپ لازمی طور پر خاندان کا حقیقی افسر ہوتا ہے، اس کا قدرتی احترام کیا جاتا ہے، اپنے روزگار کے ذریعہ سے وہ خاندان کی پرورش کرتا ہے، اور تمام مشکلات میں سب سے بڑا حکم مانا جاتا ہے، معاشرتی ذمہ داری کا حقیقی بار اسی پر ہوتا ہے، ان تمام باتوں میں ماں کا درجہ باپ کے بعد ہوتا ہے لیکن اپنے خاص دائرہ میں وہ خود مختارانہ طور پر حکمرانی کرتی ہے، خاندان کا مکمل توازن قائم رکھنے کے لئے بچوں، لڑکوں، اور لڑکیوں دونوں کی معیاری تعداد اب تین خیال کیجاتی ہے،

اگر خاندان کے ڈھانچے کے توازن میں کسی طرح کا خلل واقع ہوا تو بچہ کی شخصیت کی نشو و نما کا غیر معمولی ہو جانا یقینی ہے، جن ناموافق حالات سے یہ بات پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:-
باپ یا ماں کی قبل از وقت موت، والدین کی جدائی، بچہ کا اکلوتا ہونا، بچہ کا ولد الحرام ہونا، ماں یا باپ یا کسی ایک بچہ کا دوسرے بچوں پر حد سے زیادہ اثر و اقتدار رکھنا وغیرہ،

ان تمام عناصر کے مجموعہ سے وہ چیز بنتی ہے، جس کو ہم خاندان کی "فضا" کہتے ہیں، یہی فضا خواہ متوازن، موافق اور خوشگوار ہو، یا کشیدہ، افسردہ کن اور اضطراب انگیز، بچہ کی نشو و نما کا حقیقی فیصلہ کن عنصر ہے، پس تعلیمی نفسیات کا پہلا بنیادی اصول ہم قائم کر سکتے ہیں، :-

"اصلی اہمیت اسکی نہیں ہے، کہ ہم والدین کیا کہتے یا کرتے ہیں، بلکہ اسکی کہ ہم کیا ہیں"۔

بچون میں کسی شخص کی اصلی ہستی کے احساس کی حیرت انگیز استعداد ہوتی ہے، اُن سے کسی
کا چھپانا ممکن نہیں، وہ ہر بہروپ کے اندر اصلیت کو دیکھ لیتے ہیں، اس جرمن مقولہ میں بڑی
ائی ہے، کہ "بچے اور بے وقوف سچی بات کہتے ہیں" یہ دیکھ کر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ وہ
م کوششیں جو والدین اپنی ذہنی اور جذباتی مشکلات کو اپنے بچون سے پوشیدہ رکھنے میں
ت کرتے ہین، کس درجہ بیکار ثابت ہوتی ہیں، ممکن ہے کہ بچے ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ سکین کہ دراصل
ہ کیا ہے، لیکن انھیں کشاکش اور بے چینی کا احساس ہوجاتا ہے، یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں سے کونسی
بچون کے لئے زیادہ مصیبت کا باعث ہوتی ہے، ازدواجی زندگی کے مصنوعی رکھ رکھاؤ
شیدہ ماحول یا ایک شریفانہ طلاق کی ناموافق صورتِ حالات یہ کہنا نوع انسانی کی نیکی سے انکار
نا نہیں، بلکہ محض اظہارِ حقیقت کرنا ہے، کہ بچے کبھی نکاح کی بندش کو مضبوط نہیں کرتے،
صرف طلاق کو زیادہ دشوار بنا دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب باتون کو تعدیل و تحدید کے ساتھ
لق کرنا چاہیئے، دراصل بچہ کی شخصیت پر صرف والدین کے طرزِ زندگی، انکی مثال اور ان کے
یدا کردہ ماحول کا اثر پڑسکتا ہے، چنانچہ بچون پر والدین کے اس اثر کی قدر و قیمت جو کسی خاص
ن سے ڈالا جاتا ہے، جدید خیال کے مطابق بہت کم ہوجاتی ہے، لیکن وہ اثر کلیۃً فضول
یں ثابت ہوتا، کیونکہ جو ہدایات و معلومات ——— تعلیم سے علٰحدہ ——— والدین
یتے ہیں، ان کا اثر شخصیت کی زیادہ سطحی تہوں پر ضرور پڑتا ہے، اور وہ طور و طریقۂ اخلاق و عادات
ر طرزِ معیشت کو کسی خاص انداز پر لگا دیتی ہیں، ——— ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی کے لئے
ب اصول کار بہم پہونچاتی ہین،

(۴)

اب ضرورت ہے کہ بچون سے متعلق باپ اور مان کے فرائضِ منصبی کی کیفیت زیادہ

تفصیل کے ساتھ بیان کیجائے، آئیے پہلے ماں سے شروع کریں، انسان اپنی زندگی کے طویل سفر پر اپنی ماں کے جسم سے روانہ ہوتا ہے، اور اس حیاتیاتی امر واقعہ کا مثل نفسیاتی میدانِ عمل میں بھی موجود ہے، اپنی ماؤں کی ذات سے ہمیں ایک ایسی زمین کا شعور ہوتا ہے جس میں ہماری جڑیں قائم ہیں، اس دنیا میں ایک ایسی جگہ کا جو تمامتر ہماری ہے، ایک ایسے انسانی وجود کا جس کے ساتھ ہم غیر منفک طور پر جڑے ہوئے ہیں، مختصر یہ کہ ماں انسان کو اس دنیا کی بے کرانی میں ایک گھر دیتی ہے، یہ سراسر اہم تجربہ اس کے اندر استحکام، حفاظت اور طبیعت کے سکون و توازن کا شعور پیدا کرتا ہے، یہ چیز اُن تمام تعلقات پر اثر ڈالتی ہے، جو وہ بعد کو اپنے ماحول کے ساتھ قائم کرتا ہے، اپنے بچہ کے ساتھ ماں کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ بچہ کی شخصیت کو پوری طرح تسلیم کرتی ہے، اور کامل ایثار کے ساتھ اس کی قدر پہچانتی ہے، بے چون و چرا اور غیر مشروط طور پر، اور بلا لحاظ اس کے کہ یہ صحیح ہے یا غلط، اس میں اپنی فطری خود پسندی کو مستقل بنیاد پر قائم کرنے کے لئے اسی مکمل اعتراف و قدر شناسی کی ضرورت ہے، جس شخص نے کبھی یہ سچی قدر شناسی اپنی ماں سے نہیں پائی ہے، وہ تمام عمر اس قسم کی محبت کی تلاش میں قرونِ وسطیٰ کے بانکے کی طرح مارا مارا پھرتا رہے گا، اسکی تلاش بے سود ہوگی، کیونکہ یہ محبت نہ صرف یکتا و بے مثل ہے اور محبت کے کسی دوسرے طرز سے اس کا بدل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ صحیح وقت پر دی جانی چاہئے، بسبیلِ تذکرہ میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ حقیقی مادری محبت کی یہ کمی ازدواجی زندگی کی بہت سی ناکامیوں کی ذمہ دار ہوتی ہے، انسان کی شاہ راہ حیات کو بجا طور پر ایک لمبی سڑک کہہ سکتے ہیں جس میں چھپے ہوئے گڑھے بکثرت ہیں، یہ سڑک ایک عورت یعنی ماں سے شروع ہو کر بچپن، نوجوانی اور پختگی کے دور سے گذرتی ہوئی، ایک دوسری عورت یعنی بیوی تک پہونچتی ہے، اور مادریت کا خلقی طور پر شاید سب سے زیادہ دردناک پہلو یہ ہے کہ ماں اپنے لڑکے کو

ایک دوسری عورت کے لئے جنسی اور اسکی پرورش اور پرداخت کرتی ہے، بہتیرے آدمی جن کو صحیح وقت پر یہ مادری محبت نہیں ملی ہے، زندگی میں آگے چل کر اپنی بیوی سے اس چیز کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے اپنے بچپن میں وہ محروم رہ چکے ہیں، اس سے بڑھکر امید موہوم اور کیا ہوسکتی ہے، وہ بجائے اس کے کہ بیوی کو طمانیت بہم پہونچائیں، خود اس سے اس چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں، اور بیوی سے اس مادری اور پراثیار قدرشناسی کی توقع رکھتے ہیں جسے وہ اپنی شخصیت کے حقوق کو قربان کئے بغیر پورا نہیں کر سکتی، بکثرت ازدواجی تعلقات ان بنیادی غلط فہمیوں کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں، اور ان بدقسمت بیویوں کو اپنے شوہروں کی ماؤں کے پرانے قرضے ادا کرنے پڑتے ہیں،

مادری محبت بھی شاید انہی جذباتی مظاہرے میں سے ہے، جن کو بیان کرنا حد درجہ مشکل ہے، یہاں ہمیں صرف غلط قسم کی محبت کے بیان پر قناعت کرنی چاہئے، ہم اس قسم کی ماں کا ذکر نہ کریں گے، جو اپنے بچہ کی محبت مطلق محسوس نہیں کرتی، یا جو بعض ایسے اسباب کی بنا پر مثلاً بچہ کا غیر مطلوب ہونا، اپنی فطری محبت کو دبا ڈالتی ہے، ہم صرف اسی قسم کی ماں سے بحث کریں گے، جو دراصل اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے، اور جسے یہ معلوم کرکے نہایت تشویش ہوگی، کہ وہ غلط طریقہ سے محبت کرتی ہے، یا جس جذبہ کو وہ محسوس کر رہی ہے، وہ مادری محبت کے علاوہ کوئی چیز ہے،

ماں کی ایک قسم جو اکثر ملتی ہے، وہ ہے جسے ہم پالنے والی ماں (Mothering Mother) کہہ سکتے ہیں، اس اصطلاح کو اس کے وسیع ترین معنوں میں لینا چاہئے، یہ عورتیں اپنے بچوں کی انتہائی دیکھ بھال، ان کی راحت رسانی، انھیں ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے اور تمام حقیقی اور خیالی دشواریوں میں ان کی مدد کرنے میں بعض اوقات اپنی ساری زندگی قربان کر دیتی

ہین لیکن بچے بغیر کسی اعتراف یا ممنونیت واحسانمندی کے احساس کے ان تمام باتوں کو قدرتی اوران ساری قربانیوں کو اپنا حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں، یہ مائیں مایوسی کی حالت میں اپنی صریحًا بربادزندگیوں پر نظر ڈالتی ہیں، اور مایوسی ہی کی حالت میں یہ بچے بھی گلہ کرتے ہیں، کہ ماؤں نے اُن کی مساعدت نہیں کی، کیونکہ اگرچہ ان ماؤن نے اپنے بچوّن کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جیسا ایک بہترین قسم کی میزبان عورت اپنی مہمانون کیساتھ کرتی ہے، تاہم جس چیز کی بچوں کو حقیقتًہ ضرورت تھی اسے بہم پہونچانے سے یہ مائیں معذور تھین ـــــ یعنی گھراور ماں کی محبت کا ایک ناقابل بیان جز

ماں کی ایک دوسری قسم وہ ہے، جو اپنے بچوں کو محبت کے وفور وغلو میں غرق کردیتی ہے، اورانھیں اس محبت کا قیدی اور شکار بنالیتی ہے، ان میں سے اکثر عورتوں کی زندگیاں نہایت ناشاد وغمگین ہوتی ہین خصوصًا ان کی ازدواجی زندگی کی تمام امیدین ٹوٹ چکی ہوتی ہیں، اور اب وہ اپنی ساری دبی ہوئی اور ناکام محبت کو اپنے بچون پر نثار کردینا چاہتی ہیں، یہان بھی بچے یہ محسوس کرتے ہیں، کہ یہ اس قسم کی محبت نہیں ہے، جسکی انھیں ضرورت ہے، وہ اسکی افراط سے خوفزدہ ہوجاتے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں، کہ ہم اس محبت کے حقیقی مقصود نہین نہیں ہیں، بلکہ کسی اور شخص کے عوض اور قائم مقام ہین، ان کا غیر فریب پذیر وجدان انھیں بتاتا ہے، کہ یہ محبت فی الاصل ایک خود غرضانہ محبت ہے، جس کا اظہار اُن سے زیادہ خود ماں کی بعض ذاتی احتیاج کو پورا کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے ـــــ یعنی اس میں دینے سے زیادہ لینا ہے

میں بہ سبیل تذکرہ ماں کی اُس مشہور ومعلوم قسم کی طرف بھی اشارہ کردینا چاہتا ہون جسکی کم وبیش غیر معمولی شخصیت بچوّن کو محبت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ مضرت پہنچا دیتی ہے، خواہ براہ راست، خواہ گھر کی فضا کو درہم برہم کرکے بالواسطہ طور پر، مثلاً بے حد حسّاس جابر اور اسی نوع کی دوسری مائین،

(باقی) "ع ز"

اخبار علمیہ

برقی صدمے اور موت

اہل سائنس کی جدید تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بجلی کے صدمہ سے جو بظاہر موت ہو جاتی ہے، وہ اصل میں موت نہیں ہوتی، بلکہ اس سے محض اعصاب مفلوج ہو جاتے ہیں، اگر بارہ گھنٹے مسلسل جسم میں مصنوعی سانس پہونچائی جائے، تو بجلی کے صدمہ سے مرا ہوا انسان زندہ ہو سکتا ہے، نیویارک کے ڈاکٹر لیونگسٹن فیرس نے ہزاروں بھیڑوں گائے کے بچھڑوں، اور بلیوں پر اس قسم کے تجربے کر کے دکھایا ہے، کہ بجلی کے تیز وولٹ کے صدمے سے سانس صرف رک جاتی ہے، مختلف پٹھوں کی رگیں منتشر ہو کر ایک ساتھ مل کر کام کرنے سے بیکار ہو جاتی ہیں اور نبض کی حرکت بند ہو جاتی ہے اس سلسلہ میں یورپ کے ایک ڈاکٹر نے کتوں اور بلیوں کے سینوں میں شیشے کے آلات پیوست کر کے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے، وہ یہ کہ ان جانوروں کے جسم میں برقی صدمے پہونچائے گئے، اور ان سے ان کے مختلف اعضاء پر جو اثرات مترتب ہوتے رہے، ڈاکٹر شیشے کے ذریعہ سے دیکھتا رہا، چنانچہ اب یہ بالکل واضح ہو گیا ہے، کہ اگر ایک برقی صدمہ کے بعد دوسرا پہلے سے بھی زیادہ زوردار صدمہ فوراً ہی جسم کو پہنچایا جائے، تو قلب کی رگیں منتشر ہونے سے بچ جا سکتی ہیں، اور نبض کی حرکت پھر جاری ہو سکتی ہے، اسی سلسلہ میں یہ بھی انکشاف ہوا ہے، کہ برقی لہروں کے ذریعہ سے دوسرے قسم کے اعصابی صدموں کا بھی علاج ہو سکتا ہے، مثلاً اگر چھری کے گہرے زخم میں ہلکی سی برقی لہر

پہنچائی جائیں، تو زخم جلد مندمل ہو سکتا ہے، یا موٹر اور اسی قسم کی گاڑیوں کے حادثوں کی شدید ضرب کا بھی برقی لہروں سے کامیابی کیساتھ علاج ہو سکتا ہے بجلی کے تیز وولٹ کے صدمے کا علاج بھی ممکن ہے، اس کے ذریعہ سے مصنوعی سانس پہنچا کر پھیپھڑے حرکت میں لائے جاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ تیز وولٹ کے صدمے کے مارے ہوئے آدمی بچا لیئے گئے ہیں، گو اس میں کچھ دیر لگی ہے، ابھی حال ہی میں اوسیو کے ایک نوجوان نے جو زندگی سے عاجز تھا، ایک بجلی گھر کے سب سے اونچے حصہ پر چڑھ کر جان دینے کی کوشش کی، لیکن اتفاق سے اس کا جسم بجلی کے ایک ایسے تار سے جس میں ۳۳ ہزار وولٹ کی طاقت تھی چھو گیا اور نوجوان کے جسم میں بجلی غیر معمولی سرعت کے ساتھ سرایت کر گئی، اور وہ تیس فیٹ نیچے زمین پر آگرا، لیکن فوری تدبیروں سے بچا لیا گیا اس کے چند ہفتوں بعد ایک اکسرے کا ماہر بھی ایک ایسے بجلی کے تار کی زد میں آگیا جس کا وولٹ ۵، ہزار تھا، وہ بیہوش ہو گیا، لیکن فوراً ہی اس کے جسم میں مصنوعی آکسیجن پہونچایا گیا، اور اس میں پھر جان آگئی، اسی طرح نیویارک کے بجلی گھر میں ایک شخص ارنسٹ ہیگلنڈ نامی نے ایک تار چھو دیا، جس کا وولٹ ۰، ہزار کے قریب تھا، اس صدمے سے اس کے دل کی حرکت فوراً بند ہو گئی لیکن اس کا علاج جاری رہا اور وہ اچھا ہو گیا، حالانکہ لوگوں کو بظاہر اسکی موت کا یقین ہو چکا تھا،

امریکہ کے بعض مجرموں کو بجلی کے ذریعہ سے موت کی سزا دیجاتی ہے، ان کو بجلی کی کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے، اور چار منٹ کے اندر وہ زندگی سے محروم کر دیئے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے، کہ اس سے کم سے کم تکلیف پہونچتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، تکلیف کی زیادتی یا کمی کا ٹھیک اندازہ تو کوئی مرا ہوا مجرم زندہ ہو جائے تو وہی بتا سکتا ہے، لیکن حال ہی میں ایک برقیات کے ماہر نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ اتفاق سے اسکو بجلی کا صدمہ پہونچا، تو اسکو یکایک ایسا معلوم ہوا، کہ اسکی ساری ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں، رگیں پھٹ رہی ہیں، اور اسکے سارے جسم میں بہت ہی تیز آتشین سوئیاں چبھ رہی ہیں، اور وہ پندرہ منٹ کے

نے بظاہر مر گیا، مگر مناسب طبی امداد سے بچ گیا، بعض محققوں کا خیال تھا کہ مجرموں کی لاش لیکر انکو زندہ کرنیکی کوشش کیجائے، لیکن عدالت نے اسکی اجازت نہ دی حالانکہ ۱۹۰۰ء ہی میں نیویارک کے ڈاکٹر ابنو وتج نے بعض جانوروں کو بجلی سے مارکر زندہ کر دکھایا ہے، اسوقت سے ابتک تو بہت سی اور نئی تحقیقات ہو چکی ہیں، اسلئے امریکہ کے اہل الرائے میں بجلی کے ذریعہ سے مجرموں کو موت کی سزا دینا پھر سے غور طلب ہو گیا ہے،

حضرت سلیمانؑ کا بندرگاہ

انجیل میں ایک جگہ ذکر آتا ہے، کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں بحر احمر میں ایک بندرگاہ بنایا تھا، مگر ابتک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ بندرگاہ کہاں واقع تھا، ابھی گذشتہ مئی میں ہیل کے ڈاکٹر میلر بروز نے خبر دی ہے، کہ اس بندرگاہ کا پتہ چل گیا ہے، اور وہ عقبہ کے پاس ہے، چنانچہ یہاں ڈاکٹر گلک کی نگرانی میں کھدوائی کا کام شروع ہو گیا ہے، عقبہ بحر احمر کے شمالی حصہ میں بالکل آخر میں ایک تنگ خلیج پر واقع ہے، جسکے چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں، یہ پہلے ترکوں کے قبضہ میں تھا، لیکن جنگ عظیم میں کرنل لارنس نے عربی فوجوں کی مدد سے ترکوں کو یہاں سے بے دخل کر دیا،

ابتک اس بندرگاہ کے معلوم نہ ہونیکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ موجودہ ساحل سے نصف میل کی مسافت پر زمین کی سمت واقع ہے، ڈاکٹر گلک کی تحقیقات ہے، کہ حضرت سلیمانؑ کے بندرگاہ کے لوگ بحری تجارت جہاز سازی اور ماہی گیری کے علاوہ تانبا پگھلانے کا کام بھی کیا کرتے ہیں، اور مختلف اوزار مثلاً مچھلیاں کیلیں، اور مچھلی مارنے کے آلات بنایا کرتے تھے، ان اوزاروں میں جو شگاف بنائے گئے تھے، وہ ابتک قائم ہیں، یہ شگاف شمالی ہوا کے اثرات سے بنتے تھے، اسی فطری فائدہ کی بنا پر یہ بندگاہ اس جگہ پر قائم کیا گیا اور یہاں تانبے کا کام شروع ہوا، ان کھودنے والوں کا خیال ہے، کہ جب حضرت سلیمانؑ کی یہ بحری تجارت شروع ہوئی، تو ملکۂ سبا کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں یہ تجارت اسکے قافلہ والوں کی تجارت میں خلل انداز نہ ہو، اسی لئے وہ حضرت سلیمانؑ سے معاملت کرنے کے لئے ان کے پاس آئی،

"ص ع"

بابُ التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر

علی گڈھ میگزین کا اقبال نمبر، مرتبہ محمد ابو اللیث صاحب صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ،

گذشتہ ۹ جنوری کو شاعرِ اسلام سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے اظہارِ عقیدت کے لئے سارے ہندوستان میں بڑے جوش و اخلاص کے ساتھ "یوم اقبال" منایا گیا، مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے اس کی یادگار میں علیگڈھ میگزین کا یہ خاص نمبر نکالا ہے، لیکن کسے خبر تھی کہ چند ہی مہینوں کے بعد یہ نغمہائے طرب صدائے شیون بن جائیں گے، چنانچہ یہ نمبر اس وقت نکلا جب اقبال اپنی شاعری کی سوغات لیکر اپنے رب کے حضور میں پہونچ چکا تھا، اس لئے اس گلدستۂ عقیدت کے ساتھ اشکِ حسرت بھی شامل ہیں، اس نمبر میں اقبال کی شاعری ان کی تعلیمات و پیامات پر طلبہ اور اساتذہ کے متعدد اچھے مضامین ہیں، ان میں "اقبال" غلام سرور صاحب ایم اے، "اقبال کے کلام میں عشق کا تخیل" ضیاء احمد صاحب بدایونی، ایم اے، "اقبال اور عشق رسول" شیخ عطاء اللہ صاحب ایم اے "اقبال اور اردو غزل"، قمرالدین خان صاحب متعلم ایم اے، خاص طور سے لائق ذکر ہیں، مسلم یونیورسٹی اور طلبہ کی مناسبت سے محمد رضا علی خانصاحب ایڈوکیٹ جیپور کی تقریر بھی مفید ہے، نثر کے مضامین کے علاوہ اقبال سے متعلق متعدد اچھی نظمیں ہیں، تبرکاً ان کے ایک خط کا فوٹو اور ان کی متعدد تصویریں بھی ہیں لیکن

علامہ مرحوم کی وفات کے بعد "قوم اور وطن" کے سلسلہ کی اخلاقی نظموں کو شائع کرنا کچھ مناسب نہ تھا اور یہ فرسے آسانی کیساتھ نکالے جا سکتے تھے،

سب رس اقبال نمبر، مرتبہ میر محمد علی خانصاحب میکش تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ پتہ رفعت منزل خیرت آباد حیدر آباد دکن،

سب رس نے سر اقبال مرحوم کی وفات پر اظہار غم کے لئے یہ خاص نمبر نکالا ہے، سب رس کا بنیادی مقصد بہتر معیار اور بہتر استعداد کے مضامین پیش کرنا ہے، اس لئے اس نمبر میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اس میں اقبال کی شاعری پر مبسوط ناقدانہ مضامین کے بجائے اس کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، ان کے لکھنے والوں میں حیدر آباد کے مشہور اہل قلم بھی ہیں اور نوآموز بھی اس تنوع سے اختصار کیساتھ اقبال کی شاعری کے بہت سے اہم پہلوؤں کا تعارف ہوگیا ہے، رضی الدین صاحب کا مضمون "اقبال کا پیام حیات" ان کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے، اس نمبر کی یہ خصوصیت لائق ذکر ہے کہ اس میں متعدد خواتین اور ہندو حضرات کے مضامین بھی ہیں، ان میں لطیف النساء بیگم کا مضمون "اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر" اور جھنڈراج صاحب سکسینہ کا مضمون "شاعر حکمت شناس" اچھے ہیں، مضامین کے علاوہ حیدر آباد میں "یوم اقبال" اور یہاں کے تعزیتی جلسوں کی مختصر روئدادیں اور مشاہیر ہند کے پیامات بھی درج کر دیئے گئے ہیں جن سے اس حادثہ کے حالات اور ہندوستان میں اس کے تاثرات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، "اقبال اور حیدر آباد" کے عنوان سے حیدر آباد سے متعلق اقبال کی نظمیں بھی دیدی گئی ہیں،

زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ منشی دیا نراین صاحب نگم بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ دفتر زمانہ کانپور،

منشی پریم چند کی ادبی خدمات کے احسان سے ہماری زبان گرانبار ہے، ان کی موت پر

اردو دنیا نے مختلف طریقوں سے ان کے خدمات کا اعتراف کیا ہے، اس سلسلہ میں اردو زبان کے پرانے خادم منشی دیا نرائن صاحب اڈیٹر زمانہ نے جن کے منشی پریم چند کے ساتھ علمی و ادبی تعلقات کے علاوہ ذاتی روابط بھی تھے، زمانہ کا یہ خاص نمبر نکالا ہے، منشی پریم چند بڑے کثیر الاحباب تھے، اس نمبر میں ان کے دوستوں، جاننے والوں اور بہت سے مشاہیر اہل قلم نے ان کے ذاتی حالات اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے، مضمون نگاروں میں مولینا عبد الماجد صاحب دریابادی، مرزا محمد عسکری، مرزا فدا علی خنجر لکھنوی، فراق گورکھپوری اور خود اڈیٹر صاحب زمانہ کے نام خاص طور سے لائق ذکر ہیں، یہ نمبر تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں منشی جی کی سیرت و سوانح پر مضامین ہیں، اس حصہ میں اڈیٹر صاحب زمانہ کا مضمون منشی پریم چند کے حالات زندگی پر بجائے خود ایک مبسوط تبصرہ ہے، منشی جی کے مختصر خود نوشت حالات خاص چیز ہے، دوسرے حصہ میں ان کے ادبی خدمات کا تذکرہ اور ان کے مختلف پہلوؤں پر نقد و تبصرہ ہے، تیسرے حصہ میں وہ نظمیں ہیں جو ان کی وفات پر لکھی گئیں، منشی جی کی زندگی کے حالات اور ان کے ادبی خدمات اس طرح لازم و ملزوم ہیں، کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرکے دکھانا مشکل ہے، اسلئے سیرت کے حصہ کے بعض مضامین میں بھی ادبی خدمات کا ضمناً تذکرہ آگیا ہے، مضامین کے علاوہ منشی جی کی چند تصویریں اور ان کے خطوط کے فوٹو ہیں، یہ نمبر منشی پریم چند کے حالات اور ان کے علمی و ادبی خدمات اور اس پر نقد و نظر کا اچھا مجموعہ ہے،

پیغامِ حق اشاعت خاص، مرتبہ سید محمد شاہ صاحب ایم اے، تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں پتہ:- دار السلام جمالپور، تحصیل پٹھانکوٹ، ضلع گرداسپور، پنجاب،

موجودہ سیاسی جد و جہد میں مسلمانوں کی شرکت اور آیندہ طریق عمل کے متعلق مولانا سید ابو الاعلیٰ

مودودی نے "ترجمان القرآن" میں ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا، جو کافی شہرت حاصل کر چکا ہے، سید محمد شاہ صاحب نے "پیغام حق" کی ایک خاص اشاعت میں ان تمام مضامین کو جمع کر دیا ہے، ان مضامین میں ابوالاعلیٰ صاحب نے اپنے خاص نقطۂ نظر کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کے گذشتہ سیاسی و مذہبی حالات، موجودہ حیثیت و طرزِ عمل، اس کے نتائج اور ان کی مذہبی روایات اور تمدنی خصوصیات وغیرہ پر بحث کر کے دکھایا ہے، کہ مسلمانوں کو موجودہ مشترکہ سیاسی جدوجہد سے الگ ہو کر ایک علٰحدہ قوم کی حیثیت سے خاص مذہبی بنیادوں پر اپنی تعمیر کرنی چاہئے،

ساقی افسانہ نمبر، مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۲ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:- دفتر ساقی دہلی،

افسانوں کے انتخاب میں حسنِ ذوق اور زبان کی صحت و صفائی کے لحاظ سے رسالہ ساقی کو ادبی رسائل میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اس کا یہ افسانہ نمبر بھی ان خصوصیات کا حامل ہے، بیشتر افسانے اور ڈرامے نتیجہ خیز، ستھرے اور پڑھنے کے لائق ہیں، اس ضخیم نمبر میں بہت کم افسانے بے مقصد اور غیر دلچسپ نظر آئے مختصر اور چھوٹے افسانے بھی لطف سے خالی نہیں ہیں، حسبِ معمول مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے شکسپیر کے ایک "ڈرامے" کا ترجمہ "تامن ایتھنزی" کے حالاتِ زندگی بھی شامل ہے،

ادبِ لطیف افسانہ نمبر، مرتبہ چودھری برکت علی صاحب و مرزا ادیب بی اے تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر، پتہ مکتبہ اردو لاہور

حسبِ معمول امسال بھی ادبِ لطیف نے ہر ذوق کے دلچسپ افسانوں کا یہ ضخیم نمبر نکالا ہے، ان میں "صحرا نورد کے خطوط" اور "پریم کا سپنا" خصوصیت کیساتھ زیادہ دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، افسانوں کے علاوہ فنِ افسانہ نگاری پر متعدد مفید مضامین ہیں، منظوم افسانوں کے نام سے

چند اچھی نظمیں ہیں، اس قسم کی نظمیں ہر رسالہ میں نکلتی رہتی ہیں، ادب لطیف نے ان کو "منظوم افسانے" کا نام دیدیا ہی، خیال آتا ہو کہ بلبنکا کا ترجمہ ابن سراج کے نام سے عرصہ ہوا مولوی عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی شائع کر چکے ہیں، لیکن اسوقت وہ ہمارے سامنے نہیں ہی، اسلئے یقین کیساتھ نہیں کہ سکتے، اگر ایسا ہے تو توارد ممکن ہی،

رفیق الطلبہ مرتبہ جناب شیخ قطب الدین عبد اللہ صاحب (حصہ اردو) وصغیر خان قاسم خان صاحب (حصہ انگریزی) تقطیع بڑی ضخامت ہر دو حصہ ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت خاص نمبر ۸ پتہ:- اینگلو اردو ہائی پونہ،

پونہ میں اینگلو اردو ہائی اسکول مسلمانوں کا بہت پرانا اسکول ہی اور وہاں اردو زبان کی نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دیرہا ہے، کئی سال سے اس اسکول کے طلبہ کا ایک رسالہ رفیق الطلبہ اردو زبان میں نکلتا ہے، حال میں اس اسکول کی نئی عمارت تعمیر ہوئی ہے، اس کے افتتاح کی تقریب میں رفیق الطلبہ کا خاص نمبر نکلا ہی، اس نمبر میں اسکول کی مختصر تاریخ، تقریب افتتاح کی تقریریں اور چند ادبی مضامین اور اسکول کی عمارتوں اور بعض مسلمان عمائد کے فوٹو ہیں، طلبہ کی استعداد اور نشو کو دیکھتے ہوئے جہاں اردو کی رقیب مقامی مرہٹی زبان موجود ہے، یہ رسالہ قابلِ تعریف ہی، ہمکو امید ہے، کہ رفیق الطلبہ وہاں کے نوجوانوں میں اردو زبان کا مذاق پیدا کرے گا،

نئے رسالے

خالد مرتبہ مولانا سید احمد صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ عہ، پتہ دفتر خالد دیوبند ضلع سہارنپور،

یہ رسالہ چند مہینوں سے مولینا محمد اعزاز علی صاحب کی نگرانی اور مولانا سید احمد صاحب کی ادارت میں نکل رہا ہے، اس کا مقصد ایسے علمی مذہبی اور ادبی مضامین پیش کرنا ہے جس سے

عام مسلمان بھی فائدہ اٹھا سکیں" اس مقصد میں یہ رسالہ کامیاب ہے، وقتاً فوقتاً حضرات اکابر دیوبند کے علمی و مذہبی افادات بھی پیش کرتا ہے، مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی و مولینا اعزاز علی صاحب کے افادات میں "قرآن مجید میں تکرار کیوں ہے" اور "افضل الجہاد" لائق ذکر ہیں، مولینا عاشق الٰہی کے قلم سے تاریخ اسلام کا مسلسل مضمون نکل رہا ہے "حضرت خالد بن ولید اور مالک بن نویرہ" کے واقعہ پر معارف میں تفصیلی بحث نکل چکی ہے، بعض رائے منقولات بلا حوالہ نظر آتے ہیں، مثلاً انسانیت موت کے دروازہ پر" کا پورا سلسلہ الہلال کے دوسرے دور میں نکل چکا ہے، عام مسلمانوں کے مذہبی معلومات کے لئے یہ رسالہ مفید ہے،

طرح نو مرتبہ جناب سراج الدین صاحب ظفر بی اے، تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ سے، پتہ اردو بک اسٹال بیرون دروازہ لاہور،

ہندوستان کے سیاسی ارتقار کیساتھ ہمارے نوجوانوں میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے اس کا اثر دن بدن ہمارے لٹریچر میں نمایان ہوتا جاتا ہے، آج نوجوانوں میں ایسے لٹریچر کی مانگ اور مقبولیت ہے، جو ہندوستانیوں میں ذہنی انقلاب پیدا کرے "طرح نو" اس لٹریچر کا مبلغ ہے، اس کے تمام مضامین اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، وہ دنیا کے ایسے سیاسی حالات انقلابات اور جدید رجحانات کو پیش کرتا ہے، جو ہندوستانیوں کی ذہنیت بدلنے میں معاون ہوں، مثلاً "نیا ادب اور ہماری ذمہ داریاں" "ہندوستان کے کسانوں کی ہڑتال" "غلاموں کی بغاوت" "عورت کی معاشی غلامی" "روس کی طرح نو" "نازی ازم" "چند غیر ملکی تحریکات" وغیرہ اس کے ادب افسانے اور منظومات سب اسی مقصد کے ماتحت ہوتے ہیں، لیکن یہ بڑا دشوار گذار مرحلہ ہے، اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، کہ بے قید ذہنی انقلاب معلوم نہیں نوجوانوں کو کہاں سے کہاں بہا لیجائے گا،

صوت المدرسہ تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ اچھا ٹائپ روشن قیمت مرقوم

نہیں، پتہ:۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ،

مشرقی ہندوستان میں عربی کی سب سے قدیم درس گاہ مدرسہ عالیہ کلکتہ ہے، اسکو قائم ہوئے ڈیڑھ صدی سے اوپر ہوگئے لیکن اب تک اس کا کوئی ترجمان رسالہ نہ تھا، طلبہ اور کارکنان مدرسہ نے اس ضرورت کو محسوس کرکے صوت المدرسہ کے نام سے یہ ششماہی رسالہ جاری کیا ہے، مدرسہ عالیہ مختلف حیثیتوں سے متعدد زبانوں کا مخزن ہے، عربی تعلیم کی زبان ہے، اردو ملکی، بنگلہ صوبائی انگریزی اور فارسی بطور ثانوی زبان کے پڑھائی جاتی ہیں، اس لئے صوت المدرسہ میں ان تمام زبانوں کے علحدہ علحدہ حصے ہیں، اور ان سب کے الگ الگ اڈیٹر، اڈیٹروں کی فہرست میں فارسی اڈیٹر کا نام تو ہے لیکن فارسی کا کوئی مضمون نظر نہیں آیا، ابھی اس رسالہ کا پہلا نمبر نکلا ہے، طلبہ کی استعداد کو دیکھتے ہوئے، ہر زبان کے مضامین خاصے ہیں، خصوصًا عربی کے مضامین اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں، کہ عربی مدارس میں عربی انشار کا ذوق تقریبًا مفقود ہے، بنگلہ سے ہم ناواقف ہیں، اسلئے اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دیسکتے، طلبہ کے علاوہ بعض اساتذہ کے مضامین بھی ہیں، امید ہی کہ یہ رسالہ مدرسہ عالیہ کے طلبہ میں عربی اور اردو مضمون نگاری کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا،

عربک کالج میگزین، مرتبہ جناب عزیز اللہ صاحب فاروقی خیری، تقطیع بڑی،

ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ بہتر، ٹائپ اچھا، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ عربک کالج دہلی،

شمالی ہند میں مدرسہ عالیہ کا چھوٹا بھائی دلی کا عربک کالج ہی، اسکو قائم ہوئے بھی ایک صدی سے اوپر ہو چکی، اس کا ترجمان عربک کالج میگزین اردو انگریزی میں عرصہ سے نکلتا ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کے لئے ایک نمبر آیا ہے، علمی، ادبی، تاریخی، مختلف رنگ کے اوسط درجے کے مضامین ہیں، "شیطان کے بچے" دلچسپ ڈرامہ ہے، لیکن عربک کالج دہلی کے لحاظ سے ابھی اس کا معیار اور بلند کرنے کی ضرورت ہے،

نبات مرتبہ جناب رازق الخیری صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ معمولی کتابت و

طباعت اچھی، قیمت سالانہ عہ، پتہ:۔ دفتر نبات کوچہ چیلان دہلی،

مولینا راشد الخیری مرحوم نے "مدرسۃ البنات" کے ساتھ مسلمان بچیوں کے لئے ایک رسالہ نبات جاری کیا تھا، یہ رسالہ گیارہ سال سے جاری ہے، اور مولانا مرحوم کے فرزند رازق الخیری صاحب اس کو کامیابی سے چلا رہے ہیں، یہ رسالہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے عصمت کا مثنیٰ ہے لیکن بچیوں کی استعداد کے لحاظ سے معیار اس کا کم رکھا گیا ہے اس میں مختلف قسم کے معلومات بڑھانے والے چھوٹے چھوٹے مضامین، دلچسپ اور سبق آموز قصے، ستھری نظمیں، سلیقہ اور ہنر سکھانے والی باتیں، غرض ایک شریف مسلمان لڑکی کی تعلیم و تربیت کیلئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، سب اسمیں موجود ہیں، یہ رسالہ چھوٹی بچیوں، نوجوان لڑکیوں اور شادی شدہ خواتین سب کے لئے یکساں مفید ہے،

نارجیلستان، مرتبہ مولوی ہارون صاحب ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت

و طباعت، بہتر قیمت عہ سالانہ، پتہ:۔ تلچری، مالابار،

مالابار میں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے لیکن یہ خطہ ہندوستان سے ایسا الگ تھلگ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں صرف نام کا تعلق تھا، سرفروش موبلوں کی قربانی کے زمانہ سے ان سے عام مسلمانوں سے تعلق پیدا ہوا، ان کا تمدن، اور ان کی زبان بھی بالکل جداگانہ ہے، مقامی زبان "ملایالم" ہے لیکن کچھ دکن کے مسلمانوں کے اثر اور کچھ اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت نے اس کا قدم اس دور دراز خطہ میں پہونچا دیا ہے اور اب یہاں کے مسلمانوں میں اردو کا ذوق بڑھتا جاتا ہے، جس کا ثبوت یہ رسالہ ہے، جسے حال میں ایک ندوہ کے فارغ التحصیل نے نکالا ہے، ہم نے اس کا صرف ایک نمبر دیکھا ہے، اسے دیکھ کر خوشی اور تعجب دونوں ہوا کہ ایسے دور دراز مقام سے جس کو اردو سے کوئی تعلق نہیں، ایسا اچھا رسالہ نکل سکتا ہے، یہ رسالہ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں کے

لحاظ سے تعریف کے لائق ہے، مضمون نگاروں میں متعدد شمالی ہند کے ارباب قلم کے نام ہیں، مضامین سب سنجیدہ اور مفید ہیں، لیکن ہم کو یہ خطرہ ہے کہ یہ پودا ناموافق آب و ہوا میں کہیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی خشک نہ ہو جائے، اسلئے دکن کے مسلمانوں کو خصوصاً اسکی قدر افزائی کرنی چاہیے کہ آگے چل کر یہ رسالہ مالابار میں اردو کا نقیب ثابت ہو،

شمس المشائخ، مرتبہ مقبول احمد صاحب داوری تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت عہ، پتہ: شریف گنج، امرتسر،

یہ رسالہ پنجاب کے ایک بزرگ سید بابا شاہ سوار قادری کی یادگار میں حال میں نکلا ہے، اسلامی موضوعوں پر معمولی درجہ کے مختصر مضامین ہوتے ہیں،

حشر، مرتبہ ویدپرکاش صاحب سرور کھوریہ تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت معمولی قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۲ر پتہ کوٹ کشن چند، جالندھر،

یہ رسالہ آغا حشر کاشمیری مرحوم کی یادگار میں جالندھر سے نکلتا ہے، اسکے انتساب سے ظاہر ہے کہ رسالہ فلمی اور ادبی ہے، کبھی کبھی معمولی درجہ کے علمی اور تاریخی مضمون بھی نظر آجاتے ہیں،

اخبارات

زمزم مرتبہ جناب نصر اللہ خان صاحب عزیز تقطیع بڑی ضخامت ۱۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت سالانہ سے ششماہی عہر، پتہ دفتر زمزم بیرون موری دروازہ لاہور،

یہ نیا سہ روزہ اخبار حال میں جناب نصر اللہ خان صاحب عزیز کی ادارت میں لاہور سے نکلا ہے، نصر اللہ خان صاحب جیسے تجربہ کار اخبار نویس کی ادارت اخبار کی خوبی اور کامیابی کی کافی ضمانت ہے، اخبار نویسوں کی جماعت میں وہ پرانے قوم پرور ہیں، یہی مسلک اس اخبار کا ہے، ابھی اس کو نکلے چند ہی ہفتے ہوئے ہیں، لیکن وہ کسی حیثیت سے پرانے اور اچھے سہ روزہ اخبارات سے کم نہیں ہے،

جو اس کی کامیابی کا پہلا زینہ ہے، اخباری معیار سے معلومات وافر خبریں متنوع، مسلک صحیح، رائیں سنجیدہ، غرض ایک بلند پایہ اخبار کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے، سب اس میں موجود ہیں، اس طوائف الاخباری کے دور میں کسی اچھے سنجیدہ اور صائب الرائے اخبار کا نکلنا نہایت مفید ہے، امید ہے اس ہنگامہ آرائی کے دور میں زمزم مذاق عوام سے اپنا دامن بچاتے ہوئے ملک و ملت کی سچی خدمت انجام دیگا، اور مسلمان بھی اس مخلص خادم کی پوری قدر دانی کریں گے،

ہندوستان (ہفتہ وار) مرتبہ مولوی حیات اللہ صاحب انصاری تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ار پتہ نمبر ۶ نیل روڈ لکھنؤ،

یہ اخبار ہندوستان نیوز پیپرس کمپنی کی جانب سے عرصہ سے کانگریس کے پروپیگنڈے کیلئے نکل رہا ہے، اس کا شعبۂ ادارت متعدد تعلیم یافتہ اشخاص کے ہاتھوں میں ہے، مالی حیثیت سے بھی اس کو فراغت حاصل ہے، اسلئے ظاہری اور بعض معنوی خوبیوں کے لحاظ سے وہ سیاسی اخباروں کے لئے نمونہ ہے، سیاسی خبروں کے ساتھ ہندوستان اور بیرونی دنیا کے اہم سیاسی حالات و کوائف پر ناقدانہ تبصرہ ہوتا ہے، مختلف سیاسی اور معاشی مسائل پر پر مغز مقالات ہوتے ہیں، عام دلچسپی کے لئے ادب و افسانے کی چاشنی بھی ہوتی ہے لیکن سب سیاسی بلکہ انقلابی رنگ لئے ہوئے، ہندوستان چونکہ کانگریس کا آرگن ہے، اور اس کی باگ نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے اس لئے انقلابی نوجوانوں کی طرح اس کے مسلک میں بھی بے اعتدالی اور انتہا پسندی پائی جاتی ہے، اختلافی مسائل میں مخالف جماعتوں کے ساتھ ناگوار حد تک لہجہ میں تلخی اور کبھی کبھی ابتذال آجاتا ہے، جو ایک کانگریسی اخبار کے لئے موزوں نہیں ہے،

"م"

مطبُوعات جدیدہ

اسلامی ہند پر ایک نظر (حصّہ اوّل) مصنفہ جناب محمد شعیب خان صاحب فیروز تقطیع اوسط، ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ قصبہ برن ضلع علیگڈھ،

ہندوستان میں سیاسی شعور کے آغاز سے مسلمانوں کو سیاست کا جو غلط سبق پڑھایا گیا تھا، اور جس غلط راستہ سے وہ اس راہ پر لائے گئے تھے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ آج تک ان کا قدم صحیح جادہ پر نہ پڑسکا، اور وہ خارجی سیاست میں اُلجھے رہے، ہنگامی حوادث کے وقت وہ صحیح راستہ کی طرف بڑھے ضرور لیکن چونکہ ان کا سیاسی مزاج پختہ نہ ہوا تھا، اس لئے حالات کے بدلتے ہی پھر پلٹ گئے، ہندوستان کے سیاسی تغیرات کے ساتھ صاحب فکر مسلمانوں میں انکی اس سیاسی پریشان نظری اور بےراہ روی اور اس کے تدارک کا احساس بڑھتا جاتا ہے، مذکورۂ بالا کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے، اس میں مسلمانوں کی گذشتہ اور موجودہ سیاسی بے راہ روی اور اُن کے غیر مآل اندیشانہ طرزِ عمل اور اس کے نتائج کو دکھاکر ان کے لئے صحیح راہِ عمل متعیّن کی گئی ہے، اور وطنیت اور قومیت کے مفہوم، ہندوستان کیساتھ مسلمانوں کے تعلق اور اس پر ان کے حقوق و فرائض پر قومی اور مذہبی دونوں پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے، اور اس کے خلاف جو دلیلیں پیش کیجاتی ہیں، ان پر تنقید کرکے ہندوستان سے متعلق مسلمانوں کا صحیح فرض بتایا گیا ہے، اس سلسلہ میں ضمناً مسلمانوں کی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر نہایت مفید بحثیں ہیں، اس قسم کی کتابوں میں عموماً مسلمانوں کی پستی اور زبون حالی کا رونا رویا جاتا ہے، جس سے ان میں اپنی حالت سے اور مایوسی اور بددلی پیدا ہوتی ہے، لیکن اس

ب میں ان کی عظمت و شان ظاہر کرکے انھیں دلوں سے محو کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس
م کے مشوروں سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا، کہ ان سے اسلامی اخوت کا رشتہ ٹوٹتا ہے، اس لئے کہ
ی حد تک خود اسلامی ممالک کی آزادی اور ان کا امن وسکون ہندوستان کی آزادی سے وابستہ
ے، اس سے کون واقف کار انکار کرسکتا ہے، کہ اسلامی ممالک کے جو حصے جس حد تک
ے برطانوی سیاست کے دام میں ہیں، وہ صرف ہندوستان پر گرفت مضبوط رکھنے کے لئے یہ صرف
ہندوستان کی غلامی کا نتیجہ تھا، کہ جنگ عظیم میں ترکی، عراق، شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کے فرزندوں
سینوں پر ہندوستان کی فوجوں، بلکہ مسلمان پلٹنوں نے سنگینیں چلائیں، کیا یہی اسلامی
خوت ہے، کہ ایک طرف زبانی اس کا دعویٰ کیا جائے، دوسری طرف ہندوستانی مسلمان
ں کے سینوں پر گولیاں چلائیں، اور ان کے ملکوں کو غلام بنانے کا وسیلہ بنیں، ایسی حالت میں جبکہ
غلامی کی حالت میں دنیائے اسلام کیساتھ کوئی عملی ہمدردی نہیں کرسکتے، تو خالص ہندوستان کی آزادی پر توجہ
شعور قطعاً اخوت اسلامی کے خلاف نہیں ہے، بہرحال یہ کتاب مسلمانوں کے موجودہ سیاسی انتشار
دور میں نہایت مفید ہے، اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کو اسکا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے، جناب مصنف
ے درخواست ہے، کہ وہ جلد سے جلد اسکی دوسری جلد کی اشاعت کا انتظام فرمائیں،

قادیانی قول وفعل، مؤلفہ جناب صلاح الدین محمد الیاس برنی صاحب ایم اے،
تقطیع چھوٹی، ۳۹۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۲ ار، پتہ کمال احمد صاحب،
فاروقی بیت الاسلام حیدرآباد، دکن،

مولوی الیاس برنی صاحب ناظم دارالترجمہ کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" سے ناظرین معارف
ی طرح واقف ہوں گے، اس کتاب نے قادیانی جماعت میں بڑی ہلچل ڈالدی، انھوں نے اس
ے جواب میں بشارت احمد لکھی، ہم نے یہ کتاب نہیں دیکھی، لیکن قادیانی قول وفعل کی تمہید سے معلوم

ہوتا ہے، کہ یہ جوابات۔ ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

کا مصداق ہیں، اور اس میں حسب معمول غلط تاویلات سے مسلمانوں کو قادیانی مذہب کی جانب سے مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، برنی صاحب نے ان جوابات کی تنقیح میں یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے، اگرچہ یہ کتاب جواب الجواب کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے لیکن مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے اس کی حیثیت مستقل تالیف کی ہے، برنی صاحب چونکہ اخلاص و حسن نیت سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں، اس لئے توفیق الٰہی ان کے سامنے انسداد قادیانیت کے نئے نئے دروازے کھولتی جاتی ہے، چنانچہ "قادیانی قول و فعل" میں "بشارت احمد" کے جوابات کے جائزہ کیساتھ قادیانی مذہب کے بعض ایسے رخوں کو جو مخفی تو نہیں تھے، لیکن پس چلمن ضرور تھے، بے نقاب کیا ہے، اور "قادیانی مذہب" کی طرح خود مرزا صاحب، ان کے خلفار اور قادیانی مذہب کے اکابر کی تحریروں اور تقریروں سے دکھایا ہے، کہ "قادیانی تحریک" کی حقیقت، اس کا منشار و مقصد اور اس کے نتائج کیا ہیں، اس کے پڑھنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ قادیانیت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک مستقل تحریک، اور ہندوستانی قومی تحریکوں کے خلاف ایک منظم اور مخفی سازش ہے، اس کتاب میں بھی برنی صاحب نے ضروری تشریحوں کے علاوہ خود بہت کم لکھا ہے، اور جہاں لکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے، مثلاً مرزا صاحب کے مرض الموت کے اسباب کی تحقیق کے سلسلہ میں ان کے قلم کی "تراوش" قابل دید ہے، بعض بعض مقامات پر تو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا، اگرچہ کتاب مناظرانہ ہے، لیکن مصنف کی شگفتہ نگاری نے اس کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے، مصنف کی پہلی تصنیف "قادیانی مذہب" کی طرح مسلمانوں کو "قادیانی قول و فعل" کا بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے،

طبِ قدیم و جدید، مصنفہ جناب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۰ صفحے،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت: ۱۲/ ملنے کا پتہ: معتمد کتب خانہ سعیدیہ جام باغ ترپ بازار حیدرآباد دکن

اعلیٰ حضرت نظام دکن کے جشنِ سیمیں کی تقریب کے موقع پر انجمن طبیہ حیدرآباد نے طب یونانی اور ڈاکٹری کے موازنہ اور ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس کی ترقی کی تدابیر پر انعامی مضامین لکھوائے تھے، ان میں مدرسہ طبیہ حیدرآباد کے ایک فرزند حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کا مضمون اول قرار پایا، جس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس کتاب کے آغاز میں مختلف قوموں خصوصاً یونانی اور اسلامی طب کی تاریخ اور اس سے یورپ کے استفادہ کے مختصر حالات ہیں، اس کے بعد مستند ماخذوں سے دکھایا گیا ہے کہ یونانی طب فن طب کی اکثر شاخوں میں ڈاکٹری سے پیچھے نہیں ہے، اور وہ بہت سی تحقیقاتیں جو ڈاکٹری کا کارنامہ سمجھی جاتی ہیں، بجنسہا یا نام اور شکل کی تبدیلی کے ساتھ طب یونانی میں موجود ہیں، اور ان سے ڈاکٹری نے استفادہ کیا ہے، معالجہ میں بھی وہ ڈاکٹری سے کم کامیاب نہیں ہے، بلکہ دواؤں کی ارزانی و سہولت اور ہندوستانی طبائع سے ان کی مناسبت اور بے ضرر ہونے کے لحاظ سے وہ ڈاکٹری سے زیادہ مرجح اور کامیاب ہے، آخر میں دورِ عثمانی کی طبی ترقیوں کو دکھایا گیا ہے، اور آیندہ مزید ترقی کی تدبیروں کو پیش کیا گیا ہے، طب یونانی کی حمایت میں علمی حیثیت سے بہت اچھی کتاب ہے لیکن اسے موازنہ کہنا صحیح نہیں ہے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ طب یونانی کی پستی و جمود اور اس کے غیر علمی ہونے کے بارہ میں جو غلط فہمی اور ڈاکٹری کے ساتھ جو غیر معتدل حسنِ عقیدت ہے، اس کی محققانہ تردید کرکے دونوں کا صحیح درجہ واضح کیا گیا ہے، اور اس حیثیت سے یہ کتاب لائقِ قدر ہے، تعجب ہے کہ اس کے حوالوں میں عیون الانبا فی طبقات الاطبا کا نام کہیں نہیں نظر آتا،

"م"

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۱ — اگست سنہ ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی ہے عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید د تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ بجز قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں ستے، تقطیع خورد صہ و عہ، حصہ سوم تقطیع کلاں سلے و للعہ، تقطیع خورد صعہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں عے و سے، تقطیع خورد صعہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ و للعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈہ)

جلد ۴۲ | ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۸ء | عدد ۲

-9

مضامین

شذرات

سیرۃ النبیؐ کی پانچویں جلد تین برس ہوئے کہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ وہ جلد سے جلد چھوٹی تقطیع پر چھپ جائے، چنانچہ اب بڑی مسرت سے اطلاع دیجاتی ہو کہ اسکی چھوٹی تقطیع چھپ کر تیار ہے، جن صاحبوں کے پاس چھوٹی تقطیع کی سیرت کی جلدیں ہیں، وہ یہ جلد بھی منگوالیں، یہ حسب دستور دو قسم کے کاغذوں پر چھپی ہے، پہلی قسم کی قیمت: صر ہے، اور دوسری قسم کی عہ ہے، ضخامت ۴۹۳ صفحوں کی ہو،

سیرۃ کی چھٹی جلد جو آنحضرت صلعم کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہو ابھی تک زیرِ طبع ہو، اس وقت تک سوا چار سو صفحے چھپ چکے ہیں، سو صفحے ابھی اور چھپنے ہیں، امید ہے کہ دو تین مہینوں میں یہ چھپ کر تیار ہو جائے، اس کے شروع میں اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر ایک مفصل مقدمہ ہو۔

مسند احمد بن حنبل حدیث کی سب سے بڑی کتاب ہے، چھ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے، اس کی ترتیب راوی صحابیوں کے ناموں پر ہو، اس لئے اس میں کسی حدیث کی تلاش میں بڑی دقت ہوتی تھی، ہندوستان میں اہلِ حدیث کانفرنس نے اسکی ابواب پر ترتیب کی کوشش کا کئی دفعہ ارادہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی، حالانکہ پہلے بزرگوں میں سے کوئی یہ کام کر چکا ہے، اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مصر کے ایک عالم نے جو ساعاتی کے نام سے مشہور ہیں اس کام کو بڑی محنت سے انجام دیا ہے، اور ہر مضمون کی حدیث کو الگ الگ کیا ہے، متن کے نیچے آدھے حصہ میں حدیث کی شرح بھی کرتے گئے ہیں، سیرت کی حدیثوں کو بھی الگ جمع کیا ہو، اس وقت تک پانچ جلدیں

ہندوستان آچکی ہیں، الفتح الربانی کتاب کا نام رکھا ہے،

تفسیروں میں محدث ابن کثیر کی تفسیر ایک خاص حیثیت رکھتی ہے، نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اسکو اپنی تفسیر فتح البیان کے حاشیہ پر چھپوایا تھا، مگر اس کی اس ضمنی حیثیت سے فائدہ پوری طرح نہیں پہنچتا تھا، اب مصر میں یہ علیحدہ مستقل طور سے چھاپی گئی ہے، ہندوستان میں ابناء غلام رسول سورتی چاملی محلہ بمبئی ۳ سے ملے گی،

ابناء شرف الدین بھنڈی بازار نے عربی ٹائپ کا ایک عمدہ چھاپہ خانہ قائم کیا ہے، اور فارسی وعربی کی بعض کتابیں نہایت صفائی اور خوبی سے چھاپ کر شائع کی ہیں منجملہ ان کے ایک مقدمہ ابن صلاح ہے، طبقات ابن سعد بھی بعض ضروری تصحیح وتحشیہ کے بعد یہ مطبع چھاپ رہا ہے،

مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن جو فقہ حنفی کی امہات کتب کو چھاپنے کا کام بڑی محنت سے انجام دے رہی ہے، ابھی حال میں اس نے امام محمد کی مشہور کتاب جامع کبیر کو چھاپ کر شائع کیا ہے، کتاب کے مصحح مولانا ابوالوفا صاحب قندھاری مدرس مدرسہ نظامیہ نے جس طرح ٹونک جاکر سالہا سال دنوں میں اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا، اور مصر وقسطنطنیہ سے عکسی نسخے منگوا کر مقابلہ اور تصحیح وتحشیہ کی خدمت انجام دی وہ علمائے سلف کی محنتوں کو یاد دلاتی ہے، کتاب ابناء غلام رسول چاملی محلہ بمبئی نمبر۳ سے ملیگی،

خوشی کی بات ہے کہ ایران میں بھی ہماری بعض مستند ہندوستانی کتابوں کے ترجمے شروع ہوگئے ہیں، اس سلسلہ میں مولانا حالی کی حیات سعدی اور مولانا شبلی کی شعر العجم کے فارسی ترجمے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، اور شاید شمس العلماء آزاد کی سخندان پارس کا بھی، امید ہے کہ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان وہ علمی تعلق پھر پیدا ہو جائیگا،

جو سو ڈیڑھ سو برس سے منقطع ہوگیا ہے،

ایران میں آجکل قدیم عربی و فارسی کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا شوق بھی پیدا ہو رہا ہے، محاسن اصفہان تتمۃ یتیمۃ الدہر، حدود العالم (جغرافیہ) التوسل الی الترسل تحفۂ سامی اور بہت سی مفید کتابیں چھپ کر عام ہو چکی ہیں، کتابخانۂ دانش طہران نے ہمارے پاس بعض کتابیں اس غرض سے بھیجی ہیں کہ اہل شوق ان کو خرید سکیں، ان کی فہرست معارف میں شائع ہوگی۔

بمبئی کے بعض پرجوش مسلمانوں نے جنہیں حاجی قاسم علی جیراج بھائی کا نام خاص طور سے ذکر کے قابل ہے، اسلام پر مفید انگریزی و اردو و گجراتی کتابوں کا سلسلہ ایک ادارہ کی طرف سے قائم کیا ہے جس کا نام "مسلم مشن اینڈ لٹریری ٹرسٹ" رکھا ہے، ابھی حال میں "محمدؐ صلعم کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب ۸۰ صفحوں کی ضخامت میں شائع کی ہے جس پر ہز ہائینس آغا خاں نے مقدمہ لکھا ہے،

بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ اس سے بچپن ہی میں ہر بچہ کو لکھنے پڑھنے اور کچھ کمانے کا ڈھنگ آجائے گا، بلکہ اس لئے ہے کہ اس عمر کی تعلیم کا نقش ان کی زندگی میں ہمیشہ کیلئے قائم رہ جائیگا، مسلمانوں کا ایسی اہم عمر کی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھنا عملاً اپنے مذہب سے ارتداد کے ہم معنی ہے جس جبری تعلیم کے نفاذ کی اسکیم میں یہ پہلو نظر انداز ہوگا، اسکے معنی یہ ہیں کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس جبری تعلیم سے محروم رہیں، یا یہ ہے کہ مسلمان آئندہ عملاً مسلمان نہ رہیں، اس مشکل کا حل صرف اختلاف اور شور وغوغا نہیں ہے، بلکہ سنجیدگی کیساتھ معاملہ پر غور کرنا، اور پوری مستعدی کے ساتھ پورے ملک میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی ایک اسکیم مرتب کرنا، اور اس پر عمل کرنا ہے یا د رہے کہ اگر ہم اس نیم آزاد حکومت سے اپنی اسکیم نہیں منوا سکے، تو پھر پوری آزاد حکومت سے منوانے کی طاقت ہم میں کہاں سے آجائیگی؟ جو کچھ کرنا ہے سفر کی پہلی ہی منزل میں کرنا چاہئے، تاکہ آئندہ غلط روایت کی دلیل نہ پیدا ہونے پائے،

مقالات

اسلامی نظام تعلیم

از مولینا سید ریاست علی ندوی

فنِ حدیث کی درسی کتابیں، ہر فن کی تعلیم کے لئے اس عہد تک کی تصنیف کی ہوئی معیاری کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، مثال کے طور پر فنِ حدیث کی درسیات ذیل میں پیش ہیں،

فنِ حدیث کے تحصیل کے معنی حدیث کے اسناد، رجال، معنی لغت اور تاریخ پر عبور حاصل کرنے کے تھے، علم حدیث کا جو کم سے کم نصاب مقرر تھا اسمیں پہلے صحیح بخاری پڑھاتے تھے پھر صحیح مسلم اسکے بعد مشہور کتابیں موطا امام مالک سنن ابی داؤد نسائی، ابن ماجہ، جامع ترمذی، مسند شافعی (واحناف کو موطائے محمد) لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھیں[1] خصوصًا صحاح ستہ میں سے کوئی کتاب چھوڑی نہ جاتی تھی، چنانچہ اکثر محدثین کے حالات میں ان کے پڑھنے کا ذکر آتا ہے، مثلاً امام نووی کے حالات میں علامہ ذہبی لکھتے ہیں،

"کتب ستہ (صحیح بخاری، مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ،) مسند ابن حنبل، موطا، شرح السنۃ بغوی، سنن دارقطنی، اور بہت سی کتابیں سنیں[2]"

ان صحاح و سنن کی قرأت اور سماع کے بعد علم حدیث میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے سنن بیہقی اور مسند احمد بن حنبل، ابن حمید و بزاز وغیرہ پڑھتے تھے، کسی محدث کے لئے ان مذکورہ بالا صحاح، سنن اور مسانید سے کم پر اکتفا کرنے کی اجازت نہ تھی[3] اسی کے ساتھ اصول حدیث میں چند

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۲۷ تا ۱۲۹، [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ صفحہ ۲۵۱، [3] تذکرۃ السامع ص ۱۲۹،

کتابیں لازمی تھیں، مثلاً کتاب العلل دارقطنی، کتاب المؤتلف والمختلف امیر ابونصر بن ماکولا، کتاب وفیات الشیوخ حمیدی، اور معرفۃ علوم الحدیث حاکم[1]

پھر جو لوگ علم حدیث میں اعلیٰ بصیرت پیدا کرنی چاہتے تھے، وہ اس زمانہ میں بھی حدیث کی طلب کے لئے سفر کرکے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے تھے، اور مختلف محدثین سے کتابیں اور روایتیں پڑھتے اور سنتے تھے، مثلاً ابن عساکر ابواسحاق ابراہیم بن احمد نیشاپوری ان کے متعلق لکھتا ہے "کم سنی میں علم حدیث حاصل کیا، نیشاپور میں روایتیں سنیں، پھر نسا گئے، جہاں حسن بن سفیان سے مسند ابن مبارک اور مسند ابن ابی شیبہ اور انتخاب ابوبکر بن علی سُنی[2]"۔

اسی طرح اس زمانہ کے بہت سے اہل علم کے سوانح میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاکر حدیثیں سننے کے حالات تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ابن عساکر، ابن خلکان، الدرر الکامنہ ابن حجر اور شذرات الذہب ابن عماد حنبلی میں پائے جاتے ہیں،

فن حدیث کی معیاری تحصیل فنِ حدیث کی معیاری تحصیل اور "محدث" کا لقب پانے کے لئے چند امور ضروری سمجھے جاتے تھے،

۱۔ صحیح احادیث کا معتد بہ حصہ برزبان ہو،

۲۔ حدیث کے جملہ اقسام صحیح، حسن، ضعیف، و مرسل و مسند وغیرہ پر کامل عبور ہو،

۳۔ علم درایت سے پوری آگاہی ہو، یعنی حدیث کے الفاظ اور معانی پر اس حیثیت سے کامل نظر ہو، کہ وہ عربی قواعد اور شرعی ضوابط کے لحاظ سے واقعی قول رسول صلعم معلوم ہو، چنانچہ ابن جماعہ محدث کی تعریف میں فرماتے ہیں، ۔

"محدث وہ ہے جو اسانید و علل واسمائے رجال پر حاوی ہو، متون حدیث نوک

---

[1] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۶۱۴، [2] ابن عساکر،

زبان ہوں، اور کتابوں میں سے صحاح ستہ، مسند احمد، سنن بیہقی، اور معجم طبرانی کم سے کم سُن چکا ہو،[1]

دیگر علوم کی درسیات، جس طریقہ سے علم حدیث کی یہ کتابیں مقرر تھیں، اسی طریقہ سے دوسرے شرعی ادبی اور عقلی علوم کا نصاب بھی مقرر تھا، ان علوم میں بھی اسی طریقہ سے مثلاً پہلے اشعار و دواوین یاد کراتے صرف و نحو کے اہم مسائل ذہن نشین کراتے، اور ادب و شعر میں ملکہ پیدا کرتے تھے، عقلیات میں بھی پہلے مبادیات حفظ کرتے، پھر کتابیں پڑھتے، ان کی شرحوں سے گذرتے، اور علوم سائنس میں بھی نظریات کی تحصیل کے بعد عملی طور پر سائنٹفک تجربے کرتے، اور ایجادات اور اکتشافات میں لگے رہتے تھے،

مثلاً ابن ابی اصیبعہ اپنے چچا رشید الدین علی بن خلیفہ طبیب کی تحصیل علم کی تفصیل بیان کرتا ہے، کہ "انھوں نے پہلے ابو النفی صالح بن احمد قرشی مقدسی سے جو بچوں کو تعلیم دینے میں ماہر تھے، قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم حساب پڑھا، پھر جمال الدین بن ابی الحواخر کی خدمت سے وابستہ ہو کر علم طب کی تحصیل شروع کی، اور جالینوس کی کتابیں پڑھیں، اور اس فن کے مبادیات حفظ کئے، پھر اطبا کی جماعت میں حاضر رہنے لگے، اور بیمارستان میں عملی تجربہ اور امراض کی قسموں کی تعلیم حاصل کرتے رہے، اور علاج و معالجہ کا طریقہ سیکھتے رہے، پھر اسی اثنا میں علم امراض چشم کی تعلیم حاصل کی، اور قاضی نفیس الدین ابن زبیر سے جو بیمارستان کے شعبہ چشم کے افسر اعلیٰ تھے، اس فن کو عملی حیثیت سے سیکھا، پھر اسی طرح آپریشن کرنے کی تعلیم اور مشق بہم پہنچائی، اور نیز دوسرے علوم کی مہارت کیلئے موفق الدین عبد اللطیف بن یوسف بغدادی اور سدید الدین منطقی سے سلسلۂ تعلیم جاری کیا، اور ان سے ادب فلسفہ اور منطق کی تحصیل کی، نیز علوم نجوم کی تحصیل ابو محمد بن جدری سے کی، اور فن موسیقی کی تعلیم ابن دیجور مصری سے پائی، اور بیس سال کی عمر میں ان تمام علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی، اور

---

[1] مفتاح السعادۃ جلد ۲ ص ۳ بحوالہ طبقات الشافعیہ سبکی،

شام پہونچکر مطب شروع کر دیا، اس کے بعد پانچ سال مزید تحصیل میں صرف کئے، اور پچیس سال کی عمر میں ماہر کامل بن گئے[1]

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنے تحصیل علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں طلبہ کس ترتیب سے پڑھتے، نصاب کی کتابوں اور ان کے حواشی و شروح کے متعلق کیا سمجھتے تھے، تعلیم کی مدت کیا تھی، اور تعلیم میں اصل مطمح نظر کیا رہتا تھا، اور تعلیم و تعلم کا کیا طریقہ رائج تھا، فرماتے ہیں:-

"اوّل از قرآن مجید متسابقہ تعلیم فرمودند سبق در سبق ایشان می نوشتند، ومن می خواندم از قرآن مجید) مقدار تعلیم کردہ ام بعد ازان باثر تربیت و شفقت ایشان چناں قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشان میگذرانیدم، در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم،

و در خط و سواد چنانچہ معلمان جلیل اطفال را در مکتبہا یاد دہند، مفید نشدند، فقیر را تا فاو قاف بر طریقۂ اطفال مفید شدہ نولیسانیدہ باشند بعد ازان بطریق اجمال در اندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعیین کنیم دروغ نگفتہ باشم قدرت کتابت و سلیقہ انشا پیدا شد،

وانہ کتاب ہائے نظم و اشعار کہ تعلّم آن متعارف این دیار است شاید کہ چند چیزے از بوستان و گلستان و دیوان حافظ تعلیم کردہ باشند، وہم از ابتداء حالت صغر بعد از ختم قرآن میزان صرف یاد دادند تا مصباح و کافیہ خود تعلیم فرمودند..... وگاہے کتبہا را تعداد می کردند و می فرمودند ہمین چند کتاب را کہ خواندی دانشمند شدی،

می فرمودند تو یک مختصر از ہر علم بخوان ترا پسندیدہ است، بعد ازان انشاء اللہ چنان ابواب

---

[1] عیون الانباء جلد ۲ ص ۲۴۷، ۲۴۸،

برکت وسعادت بر تو بکشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روے نماید.....از مختصرات نحو مثل کافیہ، ولب وارشاد، شاید کہ در بعضے اوقات یک یک جزو بلکہ بیشتر طے می نمودم بلکہ بسبب حرص وشوقیکہ براتمام تحصیل وفراغ داشتم، چنان بودم کہ اگر جزوے زین مختصرات مصحح ومحشی بدست می افتاد، بگذرانیدن آن پیش استادمی پرداختم، وبجلی از مطالعہ کہ دران اوان بنظر درحواشی دست می داد اکتفا کردہ، بجزو دیگری انداختم. بمفید نہ بودم، کہ شروع از اول کتاب باید نمود، واختتام بآخران کرد، قطع نظر تحصیل علم بود، ہر نوع کہ باشد دوازدہ یا سیزدہ سالہ بودہ ام کہ شرح شمسیہ وشرح عقائد می خواندم وپانزدہ یا شانزدہ کہ مطول ومختصر را گذراندم وپیشتر یا پسترہبک سال ازعددے کہ ظرفا در شمار عمر از ذکران ملا خط کنند از علوم عقلی ونقلی انچہ درافادہ واستفادہ از صورت و مادہ کافی ووافی باشد تمام کردم، ......وبالجملہ ہمیں قیاس کہ برخواندم برسائر کتب عبوری کردم وعشوری نمودم، غیر آنکہ مدت ہفت ہشت سال بلکہ زیادہ بعد از رسیدن بکتب عربیت ومنطق وکلام وحصول نوعے از قوت اکمال واتمام ملازمت درس بعضی از دانشمندان ماوراء النہر بطورے نمودہ شد کہ درتمامی شب وروز شاید کہ دو سہ ساعت از مطالعہ وتعقل واشتغال فرصتے دست نمی دادہ باشند[1]۔

مولینا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے رسالہ وصیت نامہ میں تعلیم کے طریقہ اور کتابوں کی ترتیب پر خیالات ظاہر کئے ہیں، کہ یہ ان کا آزمودہ طریقہ ہے، اس سے اس زمانہ میں ہندوستان کے تعلیمی طریقے اور کتابوں کی ترتیب پر روشنی پڑتی ہے، مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی مرحوم نے اسے اپنے رسالہ "اسلامی درسگاہیں" میں نقل کیا ہے، اسکو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

[1] اخبار الاخیار ص ۲۹۰ تا ۲۹۲،

"طریق تعلیم علم چنان کہ بہ تجربہ محقق شد آن ست کہ نخست رسائل مختصرہ صرف و نحو درس گویند سہ سہ نسخہ از ہر یکے یا چہار چہار بقدر ذہن طالب بعد ازان کتابے از تاریخ یا حکمت عملی کہ بزبان عربی باشد آموزند و دران میان بطریق تتبع لغت و برآوردن مشکل از جائے آن مطلع سازند، چون قدرت بزبان عربی یافت موطا بروایت یحیی بن یحیی مصمودی بخوانند، و ہرگز آن را معطل نگذارند، کہ اصل علم حدیث ست، و خواندن آن فیضہا دارد و ارا سماع جمیع آن مسلسل ست، بعد ازان قرآن عظیم درس گویند، بآن صفت کہ صرف قرآن خوانند، بغیر تفسیر و ترجمہ گویند و آنچہ مشکل باشد، در نحو، یا در شان نزول متوقف شوند و بحث نماید، بعد فراغ از درس تفسیر جلالین را بقدر درس بخوانند، درین طریق فیضہا است بعد ازان در یک وقت کتب حدیث بخوانند مانند صحیحین و غیر آنہا و کتب فقہیہ و عقائد و سلوک و در یک وقت کتب دانشمندی مثل شرح ملا جامی و قطبی و غیر آن الا ماشاء اللہ واگر میسر آید کہ مشکوٰۃ را یک روز بخوانند و در روز دیگر شرح طیبی بقدر آنچہ روز اول خواندہ است بخواند خیلے نافع ست[۱]"

تکمیل علوم کے چند لازمی طریق ساتویں آٹھویں صدی میں طالب علموں کے لئے فنون کے مبادیات کے حفظ کرنے کے بعد مختلف فنون کی تکمیل کیلئے حسب ذیل طریقوں پر عمل کرنا ضروری تھا، اور تا وقتیکہ کوئی طالب علم ان منزلوں سے گذر نہ لے اسے صاحب فن کا درجہ حاصل نہ ہوتا تھا،

۱۔ اساتذہ کے درس کے حلقہ میں زبانی خطبوں کا سلسلہ اس عہد میں بھی جاری تھا، طلبان میں التزام سے شریک ہو کر املا کرتے تھے،

۲۔ اس عہد میں اساتذہ سے ہر فن کی اہم کتابوں کے سبقاً سبقاً پڑھنے کا طریقہ جاری ہو گیا

[۱] اسلامی درسگاہیں، ص ۱۰۷، ۱۰۸،

تھا، اور طالب علموں کے لئے ضروری تھا، کہ وہ ہر فن کی معیاری (کلاسیکل) کتابیں استادوں سے پڑھیں، اور ان کی قرأت اور سماع کی سند اور اجازت حاصل کریں،

۳۔ طلبہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، کہ وہ اپنے استادوں سے اجازت لینے کے بعد علم کی تحصیل کے لئے دور دراز کے سفر طے کریں، چنانچہ طلبہ اپنی جماعت کی جماعت تیار کرتے تھے، اور مختلف شہروں میں گھوم کر وہاں کے ممتاز اہلِ علم سے علوم میں بصیرت پیدا کرتے تھے،

۴۔ ہر طالب علم کے لئے اپنے عہد کے بلند پایہ مصنفین سے شاگردی کا شرف حاصل کرنا ضروری تھا، اس کے مدرسہ کے جو اساتذہ صاحبِ تصانیف ہوتے، ان سے انکی کتابیں پڑھ کر ان کی قرأت اور سماع کی سند حاصل کرتے تھے، پھر اپنے علمی سفروں میں زیادہ تر علم کی تحصیل اسی ذریعہ سے کرتے، ہر شہر میں جو ممتاز اساتذہ اور مصنفین ہوتے تھے ان کے درس کے حلقہ میں شریک ہو کر ان کی کتابوں کی اجازت و سند حاصل کرتے تھے، کسی کتاب کا پڑھنا، اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا تھا، جب تک اس کے مصنف سے یا اس کے شاگرد، یا شاگردوں کے شاگرد سے اس کے پڑھنے کی اجازت حاصل نہ کر لی جاتی،

۵۔ طلبہ جب تک علوم میں پوری بصیرت پیدا نہ کرتے، وہ اختلافی مسئلوں کا مطالعہ نہ کرتے تھے، جب انھیں اپنے علم پر بھروسہ ہو جاتا، تو پھر نظر کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے خلافیات کا مطالعہ کرتے تھے،

۶۔ جب علمی استعداد کمال کے درجہ پر پہونچ جاتی، اور فن کی اکثر کتابیں نگاہوں سے گذر جاتیں تو پھر درس و افتار کی مسند پر بیٹھتے تھے، اور اپنی تصنیف اور تالیف کے ذریعہ سے فیض جاری کرتے تھے، اسی سلسلہ میں علمائے اسلام کے اختلافی مسئلوں پر تحقیق کی نظر ڈالتے تھے، اور اگر ضرورت ہوتی تو ان خلافیات پر اپنی تصنیفات میں مصنفانہ نظر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے،[۱]

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۳۳ تا ۱۴۲ و ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۹

(۸)

طرزِ تعلیم و نصابِ درس کی چند خامیاں اور انکی اصلاح کی کوششیں

امتدادِ زمانہ سے طرزِ تعلیم و نصابِ درس میں چند خامیاں اور انکی اصلاح کی کوششیں

امتدادِ زمانہ سے اسلامی طرزِ تعلیم و نصابِ درس میں چند خامیاں پیدا ہوئیں اور مختلف زمانوں میں ان کی اصلاح کی کوششیں کی گئیں، جب اسلامی حکومتوں کے شباب کا دور آیا، اور علما بھی حکومت کے مختلف منصبوں، افتا، قضا، خطابت اور اوقاف کی تولیت وغیرہ پر مقرر کئے جانے لگے، تو چوتھی پانچویں صدی ہجری سے لوگوں کی توجہ علم فقہ پر زیادہ مبذول ہوگئی تھی، اس کے علاوہ فقہ میں مختلف مذہبوں کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے خلافیات کے نام سے اس علم میں ایک مستقل باب کا اضافہ ہوگیا تھا، اور تعلیم و تعلم میں بھی انہی چیزوں پر توجہ کیجانے لگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصابِ تعلیم میں خلافیات کے رسائل زیادہ داخل ہوگئے، اور دوسرے علوم کی طرف توجہ کم ہوگئی،

امام غزالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان خامیوں کا احساس کیا، اور احیاء العلوم میں ان پر تفصیل سے نظر ڈال کر ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائیں جنھیں مولینا شبلی مرحوم نے "تعلیم کی اصلاح" کے عنوان سے الغزالی میں مفصل بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ امام غزالی نے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کی تقسیم کرکے جو مختلف علوم مذہبی سمجھے جانے لگے تھے، ان کی تردید کی، اور ضروری علوم پر متوجہ کیا،

۲۔ خصوصاً علم فقہ کو جو اس زمانہ میں معیشت کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا، دنیاوی علوم میں شمار کیا،

۳۔ شرعی علوم کے غلط استعمال سے روکا،

۴۔ فقہی و کلامی مناظروں سے باز رکھ کر صحیح علم کلام کے حاصل کرنے کی تلقین کی،

۵۔ ان شرعی علوم کے لئے ایک مختصر نصابِ تعلیم تیار کیا جن کی تحصیل مسلمانوں کے لئے ضروری ہے

امام غزالی کی اصلاح کی اس آواز کا نتیجہ آگے چل کر مولینا شبلی مرحوم کے الفاظ میں حسب ذیل ظاہر ہوا :۔

"تعلیم کے نصاب میں فقہ وکلام کے ساتھ منطق و فلسفہ داخل ہوگیا، دنیوی علوم کے لئے اتنا کافی وقت نکل آیا، کہ فقہاء و محدثین بھی ریاضی دان اور حساب دان ہونے لگے، فقہ میں سے علم اخلافیات کا حصہ بالکل خارج ہو گیا، کلام کے بہت سے غیر ضروری مباحث چھٹ گئے"[۱]

پھر آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون نے چند اصلاحیں پیش کیں، ان سے اس عہد کی خامیوں کا بھی اندازہ ہو گا، مثلاً

۱۔ تعلیم کی ابتدا قرآن مجید سے شروع کرنے کا عام رواج اصلاح کے قابل ہے،

۲۔ جو علوم دوسرے علوم کے حاصل کرنے کے ذرائع ہوں، ان میں نہ زیادہ وقتِ نظر پیدا کیا جائے، اور نہ اس کے فروعی مسئلوں پر وقت صرف کیا جائے،

۳۔ کتابوں اور علوم کے جو مختصرات تیار کئے گئے ہیں، ان پر علم کی تحصیل کی بنیاد نہ قائم کیجائے،

۴۔ ایک ہی فن کی ایک ہی قسم کی بہ کثرت کتابیں پڑھانا نہ صرف تضیعِ اوقات بلکہ مانعِ تحصیلِ علم ہے،

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع کرانے کا طریقہ اگرچہ تمام اسلامی ملکوں میں رائج تھا، لیکن بعض اہلِ علم اُسے اسلئے محلِ نظر سمجھنے لگے تھے، کہ بچوں کو ان کی بے سمجھی کے زمانہ میں خدا کی کتاب پڑھائی جائے، چنانچہ ابن خلدون نے قاضی ابوبکر ابن عربی کے حوالہ سے اس مسئلہ پر ذیل کے خیالات ظاہر کئے ہیں :۔

---

[۱] الغزالی از ص ۲۱۱ تا ۲۲۰، ان مباحث کی تفصیل کے لئے دیکھئے احیاء العلوم جلد ۱، از ص ۹ تا ۲۲،

"قاضی ابوبکر بن عربی نے اپنے سفرنامہ میں طرز تعلیم کے متعلق ایک نادر طریقہ پیش کیا ہے،
وہ عربیت اور شعر کی تعلیم کو تمام علوم کی تعلیم پر مقدم کرتے ہیں، جیسا کہ تقریبًا اہل اندلس کا
طریقہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ پہلے شعر و ادب کی تعلیم دینا چاہئے، پھر حساب لکھا کر اسکی مشق کرانی
چاہئے، یہانتک کہ وہ اصول و قوانین کو سمجھ سکے، اس کے بعد قرآن پڑھانا چاہئے، کیونکہ اس
ترتیب سے پڑھنے سے قرآن اس کے لئے آسان ہو جائے گا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہموطنوں
کی غفلت پر ماتم ہے، کہ وہ بچہ کے ہاتھ میں شروع ہی میں خدا کی کتاب پکڑا دیتے ہیں،
اور وہ ایسی چیز پڑھتا ہے، جسے بالکل نہیں سمجھ سکتا
اس کے بعد وہ کلام پڑھانے کے لئے کہتے ہیں، پھر اصول فقہ، پھر مناظرہ، اس کے بعد علوم
حدیث کا درجہ دیتے ہیں،
اس کے ساتھ دو علموں کو ملا کر پڑھانے کی ممانعت کرتے ہیں، البتہ اگر طالب علم اپنی تیزی
اور ذکاوت سے اس قابل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں"
اس کے بعد وہ یہ رائے ظاہر کرتا ہے، کہ

درحقیقت یہ ایک عمدہ طریقہ تعلیم ہے، لیکن جو عادتیں جاری ہیں، ان کا بدلنا دشوار
ہے، اور لوگ قرآن مجید کی تعلیم کو مقدم تبرک اور ثواب کی نیت سے کرتے ہیں، اس کے
علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ آگے چل کر ممکن ہے بچہ کی تعلیم جاری
نہ رہ سکے تو قرآن کی تعلیم کا موقع نہ مل سکے گا، خصوصًا اس لئے کہ بچے بچپن میں والدین
کے مطیع رہتے ہیں، بالغ ہونے کے بعد والدین کا اختیار ان پر باقی نہیں رہتا، اس لئے
اگر وہ تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر دیں گے، تو قرآن کی تحصیل کا فرض باقی رہ جائے گا،
لیکن جس بچہ کے متعلق یہ یقین ہو کہ اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع نہ ہوگا، تو قاضی ابوبکر نے

جو طریقۂ تعلیم بیان کیا ہے، اسے اختیار کرنا بہتر ہوگا"[۱]

علوم غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنانے کی مخالفت ابن خلدون ان علوم پر جو دوسرے علوم کے پڑھنے کے وسیلہ کے لئے پڑھے جاتے ہیں، اور جنھیں اس نے علوم آلیہ کی اصطلاح سے یاد کیا ہے، کم توجہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"متداول علوم کی دو قسمیں ہیں، ایک مقصود بالذات ہیں، جیسے، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام طبیعیات، الٰہیات، اور ایک وہ علوم ہیں جو ان کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، جیسے قواعد عربی، حساب منطق، پس جو علوم مقصود بالذات ہیں، اگر ان میں کلام کو وسعت دیجائے، تو کوئی حرج نہیں، لیکن جو علوم دوسرے علوم کا آلہ ہیں، جیسے قواعد عربی اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہئے، کہ وہ آلہ ہیں، اس لئے ان میں کلام کو وسعت نہ دینی چاہئے، کیونکہ اس سے ان کا اصل مقصد فوت ہوجائے گا، اور علوم مقصود بالذات کی تحصیل میں رکاوٹ پیدا ہوگی، حالانکہ وہی اہم ہیں، اور اس طریقہ سے طالب علم کی عمر ان سب کی تحصیل کے لئے کافی نہ ہوگی، کیونکہ ان علوم آلیہ کی مصروفیت میں عمر ضائع ہوجائیگی، جیسا کہ متاخرین نے نحو، منطق، اور اصول فقہ کے متعلق کیا ہے"[۲]

مختصرات سے اجتناب ہر فن کے مسئلوں کے سمیٹنے کے لئے "مختصر" کے نام سے جو رسالے لکھے جاتے تھے، ان کے متعلق کہتا ہے:۔

"اکثر متاخرین نے علوم وفنون کے طریقے کو مختصر کر دیا ہے، اور ہر علم کی ایک مختصر سی فہرست مرتب کر لی ہے، جو مختصر لفظوں میں اس کے تمام مسئلوں اور دلیلوں پر مشتمل ہوتی ہے، ان لوگوں نے تفسیر اور بیان کی بڑی کتابوں کا اختصار کر لیا ہے، جیسا کہ ابن حاجب نے فقہ و

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۰۰، ۶۱۹، ۶ [۲] ص ۶۱۵

اصول فقہ میں ابن مالک نے قواعد عربی اور خونجی وغیرہ نے منطق میں کیا ہے، لیکن تعلیم کا یہ طریقہ نقصان دہ ہے، اور اس سے تحصیل میں خلل پڑتا ہے، تمام خرابیوں کے ساتھ طالب علم کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ انھیں مشکل اور مختصر الفاظ کا تتبع کرنا پڑتا ہے، اور ان میں سے دشواری کے ساتھ مسائل کو نکالنا پڑتا ہے، ان تمام خرابیوں کے علاوہ ان "مختصرات" کی تعلیم سے جو ملکۂ علمی حاصل ہوتا ہے، وہ اس ملکہ سے ناقص ہوتا ہے، جو طویل الذیل کتابوں کے پڑھنے اور ایک بات کے بار بار دہرانے سے حاصل ہوتا ہے[۱]"

ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابوں کی تعلیم کے نقصانات

ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابیں پڑھنے کی مخالفت میں اس نے دکھایا ہے کہ کتابوں کی زیادہ تصنیف علم اور تعلیم کی ترقی میں مانع ہے، لکھتا ہے:-

"لوگوں کو علم کی تحصیل میں جس چیز نے نقصان پہنچایا ہے، وہ کتابوں کی کثرت، اصطلاحوں کا اختلاف تعلیم کے طریقوں کا متعدد ہونا، اور پھر طالب علم سے ان کے یاد کرنے کا مطالبہ کرنا ہے، جو کچھ ایک فن کے متعلق لکھا گیا ہے، طالب علم کی عمر اس کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسلئے علم کی تحصیل میں خواہ مخواہ کوتاہی واقع ہوتی ہے، فقہ مالکی میں اس کی مثال مدونہ اور اس کی شرحیں ہیں، ابن یونس لخمی، ابن بشیر وغیرہ کی کتابیں اور تنبیہات و مقدمات بیان وغیرہ، یہی حال، ابن حاجب کی کتابوں اور اس کی شرحوں کا ہے، یہ تمام کتابیں مکرر ہیں، اور معنی سب کے ایک ہیں، لیکن طالب علم سے سب کے یاد کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور عمر صرف ایک ہی کتاب میں گذر جاتی ہے،

اگر اساتذہ صرف مذہبی مسائل پر اکتفا کرتے، تو تعلیم آسان ہو جاتی، اور اس کا ماخذ قریب ہو جاتا[۲]"

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۰، [۲] ،، صفحہ ۶۰۹،

طریقۂ تعلیم کے متعلق ابن خلدون کے چند مفید مشورے،

ابن خلدون نے طریقۂ تعلیم کی مذکورۂ بالا خامیاں مٹانے کے علاوہ چند مفید مشورے بھی دیئے ہیں، جو اجمالاً حسب ذیل ہیں لکھتا ہے:

"طالب علموں کے لئے علوم کی تلقین اسوقت مفید ہوسکتی ہے، جب وہ تھوڑا تھوڑا تدریجاً پڑھائے جائیں، پہلے ہر فن کے چند اصولی مسئلے ذہن نشین کرائے جائیں، پھر اجمال کے ساتھ ان کی شرح بیان کی جائے، اور اس میں ان کی قوت فہم اور استعداد ملحوظ رکھی جائے، یہان تک کہ فن کے آخری حصے انھیں سمجھائے جائیں، اس وقت ان میں اس فن کے متعلق ایک قسم کا ملکہ پیدا ہوگا، اور اس کی غایت یہ ہوگی، کہ وہ اس فن کے سمجھنے اور اس کے مسائل حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، پھر دوسرے فن کی جانب رجوع کیا جائے، اور اسی ترتیب سے وہ فن بتدریج انھیں پڑھایا جائے، اور پھر شروح وغیرہ سے گذر کر اس کے اختلافی مسائل سمجھائے جائیں، یہانتک کہ وہ فن کو پورے طور پر حاصل کرلیں، اور اس طریقہ سے تدریجاً ان میں عمومی علمی ملکہ پیدا ہو جائیگا، ورنہ اگر شروع ہی میں انتہائی مسائل ان پر بار کر دیئے جائیں گے، تو رفتہ رفتہ ان کی طبیعت چھوٹ جائے گی اور بالآخر وہ تعلیم سے منہ موڑلیں گے۔"

اسی طرح فنون کی تحصیل میں ناغہ کرنا مناسب نہیں، ورنہ اس کی وجہ سے فن کا آخری حصہ اوّل کے منقطع ہوجائیگا، اور طلبہ کو دشواری پیش آئیگی، اور پراگندگی خاطر لاحق ہوگی[۱]۔

قاضی ابن جماعہ نے بھی اپنی کتاب میں جابجا مفید تعلیمی مشورے دئے ہیں، جیسے تعلیم کیلئے اساتذہ کو بار بار نہ بدلا جائے، ایک کتاب میں پوری بصیرت حاصل کرلیجائے، پھر دوسری کتاب شروع کیجائے[۲]، کتابوں کو حفظ کرنے سے پہلے ان کی دیکھ بھال کر پوری تصحیح کرلیجائے[۳] علم

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۱ [۲] تذکرۃ السامع ص ۱۱۳ [۳] ایضاً ص ۱۲۱،

کو کتاب میں منحصر نہ سمجھا جائے، کیونکہ علم صرف کتاب سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ استاذ سے شکوک رفع کرنے اور خود تحقیق و تفتیش کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں[1]، اور دو فنون بیک وقت حاصل نہ کئے جائیں، بلکہ یکے بعد دیگرے پڑھنا چاہئے[2]،

عالم اسلامی میں جدید تعلیمی انقلاب اسلامی طریق تعلیم کی جن خامیوں کی طرف امام غزالی اور علامہ ابن خلدون نے توجہ دلائی ہے، وہ دور آخر تک ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں بھی باقی تھیں، خصوصاً نصاب تعلیم میں غیر معمولی ابتری پیدا ہوگئی تھی، طالب علموں کی عمریں علوم آلیہ ہی کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کر دیجاتی تھیں، اور شرعی علوم قرآن، حدیث اور فقدرجال وغیرہ پر کم توجہ صرف کیجاتی تھی، فقہ و کلام میں بھی سارا زور خلافیات پر صرف ہوتا تھا، اور فقہی اور کلامی مسائل پر علماء کی باہم تفسیق و تکفیر کی عام گرم بازاری تھی، پھر جدید علوم و فنون کی تحصیل اگر کفر نہیں تو درجۂ فسق تک علی گڈھ کی جدید تعلیمی تحریک کے باوجود باقی رہ گئی تھی، کہ اسی اثناء میں مجلس ندوۃ العلماء کی صدائے اصلاح بلند ہوئی، اور اس کی توجہ خصوصاً ذیل کے اہم مسائل پر مرکوز رہی،

۱۔ نصاب تعلیم کی اصلاح کرنا،

۲۔ باہمی فرقہ وارانہ اختلافات اور ایک دوسرے کی تفسیق و تکفیر کو روکنا،

۳۔ بقدر ضرورت دینی علوم کیساتھ نئے فنون کی تعلیم دینا،

پھر ان مقاصد کے پورے طور پر حاصل کرنے کے لئے اس مجلس نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، تاکہ ان اصولوں کے بموجب تعلیم کا صحیح طریقہ رائج ہو، دار الاقامہ کے لڑکوں کی اسلامی اخلاق کے بموجب تعلیم و تربیت کیجائے، اور اس مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء ملت کی نئی ضرورتوں سے آشنا ہو کر انھیں پوری کریں،

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۲۳ و ۱۲۴ [2] ر صفحہ ۵،

یہ شکر کا مقام ہے، کہ آج نصف صدی کے بعد ہندوستان میں اس مجلس کی اصلاح کی صدا کے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، آج ہندوستان میں نہ صرف دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کا نیا نصاب جاری ہے، بلکہ تدریجاً دوسرے اسلامی مدرسوں نے بھی کم و بیش اسکی یہ دعوت قبول کرلی ہے، اور ہر مدرسہ کے نصاب تعلیم میں کچھ نہ کچھ تبدیلی رونما ہو چکی ہے،

فرقہ وارانہ اختلافات اور باہمی تفسیق و تکفیر فقہ اور کلام کے خلافیات کے باعث پیدا ہوئے تھے، ندوۃ العلماء کو اسکے دوسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ ہندوستان کے مختلف اسلامی فرقے والوں میں باہمی رواداری کا تخیل پیدا ہو چکا ہے، اور تکفیر و تفسیق کے باب میں اگرچہ علماے زمانہ کی زبانیں اب بھی کبھی کبھی کھل جاتی ہیں، اور مکفرین کا ایک مختصر گروہ مستقل طور پر موجود ہے، تاہم انکے فتوؤں کا اثر صرف زبان قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر بدنما داغوں کے چھوڑ جانے کے سوا اور کوئی ظاہر نہیں ہوتا، اسلامی ہند کا سنجیدہ خیال تعلیم یافتہ طبقہ تکفیر کے ان فتوؤں کو وقعت نہیں دیتا اور یہ فتاوی عقائد کی اصلاح کرنے کے بجائے تمسخر و استہزا کا ذریعہ بن جاتے ہیں،

اسی طرح اسے تیسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ آج ملک میں ندوۃ العلماء کے بہ کثرت اور دوسرے مدارس کے خال خال فارغ التحصیل علماء، قدیم و جدید دونوں علوم کے حامل نظر آتے ہیں،

اسی طرح دیگر اسلامی ممالک میں بھی تعلیمی انقلاب برپا ہوئے کہیں ندوۃ العلماء کی صدائے بازگشت کے طور پر، اور کہیں زمانہ نے ہوا کا رخ خود پلٹ دیا، مصر میں شیخ جمال الدین افغانی مرحوم کے مسند نشیں علامہ رشید رضا نے جنھوں نے اسی سال اس دار فانی کو الوداع کہا، نہ صرف ہندوستان آکر ندوۃ العلماء کی تحریک میں عملی حصہ لیا، بلکہ مصر واپس جاکر انھوں نے دار الدعوۃ دار الارشاد کے نام سے انہی مقاصد کیساتھ ایک دار العلم قائم کیا، پھر مصر کی قدیم اور مستند اسلامی درسگاہ جامعہ ازہر کے علما نے بھی ہوا کا رخ پہچانا، اور نئی اصطلاحات قبول کرکے اسے نئی شاہراہ پر

لائے، اسی طرح مصر میں دوسرے نئے مذہبی مدارس اسکندریہ (زمانہ تعمیر ۱۹۱۳ء) اسیوط (۱۹۱۵ء) زقازیق (۱۹۲۵ء) وسوق و دمیاط وغیرہ تعلیمی مجلس کی نگرانی میں نئے طریق پر تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں،

عراق میں جامعہ آل البیت کی بنیادیں استوار ہو چکی ہیں کہ دار العلم بغداد میں مدرسۂ نظامیہ و مستنصریہ کا منظر پھر سامنے آجائے،

تیونس کا جامعہ زیتونیہ محمد بن ابی شنب جیسے صاحب علم کی مدد سے ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے،

ٹرکی میں جدید دور جمہوریت کیساتھ تعلیمی انقلاب بھی برپا ہو چکا ہے، اور اب وہ غیر ممالک کے تعلیمی مرکزوں کا محتاج نہیں رہ گیا ہے،

ایران رضا شاہ پہلوی کے سایہ میں تعلیمی ترقیوں میں مصروف ہے، اور اب دانشگاہ ایران سے علوم وفنون کی نئی روشنی پھیل رہی ہے،

ہمارا ہمسایہ ملک افغانستان بھی تعلیم کے لئے کوشش کر رہا ہے، اور کابل یونیورسٹی کی بنیاد پڑ چکی ہے،

اقبال علیہ الرحمۃ کے چند جواہر ریزے جنھیں چننے کا مجھے موقع ملا

از

جناب پروفیسر خواجہ عبدالحمید صاحب لکچرار گورنمنٹ کالج ملتان

ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ سے پہلی بار ملاقات کا شرف مجھے نومبر ۱۹۲۰ء میں حاصل ہوا، اس سے پہلے میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے بیسیوں بار ان کو دور سے دیکھ چکا تھا، اسلامیہ اسکول لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں جب کبھی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لاتے تو ہر شخص کی زبان پر ہوتا "آج ڈاکٹر اقبال نے آنا ہے" ہر کس و ناکس وہاں موجود ہوتا، آپ بالعموم لے سے اپنی نظم پڑھا کرتے تھے، پہلی نظم جو میں نے ان کی زبان سے بغیر ترنم کے سنی "شکوہ" تھی، اس کے بعد "شمع وشاعر" اور "جواب شکوہ" (جو موچی دروازہ کے باغ میں پڑھی گئی) پھر دوبارہ ترنم "خضر راہ" سے شروع ہوا جو اسلامیہ اسکول دروازہ شیرانوالہ کے صحن میں پڑھی گئی تھی، ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت قدرے علیل تھی اس لئے نظم مذکور گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر پڑھی تھی،

اس زمانہ سے پہلے مجھ جیسے شخص کے لئے ڈاکٹر صاحب کا نام، ان کی شکل وصورت اور انکا ترنم ہی باعث کشش ہوتا تھا، اسکول اور کالج کے زمانہ میں ہر مسلمان طالب علم کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ نہ کچھ اشعار (اور لاہور میں تو ہر ملت کے طلبہ کو) یاد ہوتے تھے، اور مجلسیں

ان اشعار کے ترنم سے گرمائی جاتی تھیں، کالج کے زمانہ میں میں ڈاکٹر صاحب کو ہر روز مشن کالج کے دروازہ سے باہر والی سڑک پر اپنی مختصر سی گاڑی (ٹمٹم) میں چیف کورٹ سے واپس آتے دیکھتا تھا، چہرہ سرخ، سنہری مونچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اور سیاہ سوٹ، ہاتھوں میں گھوڑے کی باگ غرض اسی شان سے ہر روز تفریح کی گھنٹی میں مجھے دور سے ان کی زیارت نصیب ہوتی تھی، لاہور میں ہم لوگوں میں "ڈاکٹر صاحب" کا لقب، صرف اقبال ہی کے لئے وقف تھا، اس لئے آیندہ سطور میں میں اسی لقب سے یاد کرونگا،

نومبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان بھر میں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی، لاہور میں کانگریس کے کارکنوں کی خاص توجہ اسلامیہ کالج کی طرف مبذول تھی، مسلمان اور ہندو اکابر لاہور میں جمع تھے اور ان کی ہدایات کے مطابق کانگریسی کارکنوں نے اسلامیہ کالج میں "جاعتوں" کا کام تقریباً ناممکن کر دیا تھا، خود اسلامیہ کالج کی ہستی معرض خطر میں تھی، ڈاکٹر صاحب ان دنوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل سکریٹری تھے، چنانچہ ایک روز کالج کے چند پروفیسروں نے (جنہیں راقم الحروف بھی شامل تھا) فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چلکر ان متضاد فتووں اور قرار دادوں کے متعلق جن کی بارش ہر سمت سے کالج پر ہو رہی تھی، ان کی رائے دریافت کیجائے، ڈاکٹر صاحب اس وقت انارکلی والے مکان میں مقیم تھے اور حسب عادت آرام کرسی پر بیٹھے تھے، حقہ پاس تھا۔ (میں نے انھیں ان کے قیام گاہ میں حقہ کے بغیر کبھی نہیں دیکھا) ڈیڑھ دو گھنٹوں تک تحریک عدم تعاون کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی، ہمیں معلوم ہوا کہ ابھی انھوں نے اس تحریک کی ضرورت اور صحت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی، گاندھی جی کی انھوں نے بہت تعریف کی، اور جو کام وہ ہندو قوم کی بہتری کے لئے کر رہے تھے، اسے مدنظر رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر ہندوؤں کی آیندہ

نسلیں انھیں اوتار تسلیم کریں، ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے، ظریفانہ انداز میں فرمایا "جسقدر کام کالج میں ہو سکتا ہے، کرتے جاؤ، ہاں ابھی یہ ڈر ہے کہ کالج ٹوٹ نہ جائے اور آپ لوگوں کو تلاش روزگار کی زحمت اٹھانی پڑے، سو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا کاٹ دو، میں نے بھی یہ کام شروع کیا ہے، اور میری صحت پر اس کا اثر بہت اچھا پڑا ہے، اس پر قہقہہ پڑا اور ہم لوگ واپس آئے،

اس کے بعد مجھے گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا، اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک تو شاید کوئی ہفتہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی خدمت میں ایک یا دو بار حاضری کا اتفاق نہ ہوا ہو، ان صحبتوں میں طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں، اگر کوئی اور صاحب موجود نہ ہوتے تو میں ان سے بعض باتوں اور مسائل کے متعلق سوالات کرتا جن کا وہ کمال مہربانی سے شافی جواب مرحمت فرماتے، میرے ذمہ ایک فرض یہ تھا کہ فلسفہ اور جنرل سائنس کے متعلق جو اچھی اور تازہ چھپی ہوئی کتاب نظر سے گذرے اسے ان کی خدمت میں پیش کروں، اور پیش کرنے سے پہلے پڑھ لوں، چنانچہ کتاب لیتے وقت وہ مجھ سے اس کے متعلق راے پوچھتے ہوئے اچھا خاصا امتحان لے لیا کرتے تھے،

ڈاکٹر صاحب کی زبان فیض ترجمان سے جو ہزارہا جواہر ریزے بکھرتے رہے ہیں، ان میں سے چند (جو مجھے یاد ہیں اور جن میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لئے بار خاطر ہو) میں نے یہاں جمع کیا ہے، ان میں ان باتوں کو درج نہیں کیا ہے جن میں ملی یا سیاسی معاملات پر تفصیلی بحث تھی، یا جن میں فلسفہ یا سائنس کے دقیق مسائل پر بحث تھی، ایسی باتوں کو بھی ترک کر دیا گیا ہے جن کا تعلق ذاتیات سے ہے، ایسی باتیں بھی نہایت پر لطف اور سبق آموز ہوتی تھیں، لیکن ان کا شائع کرنا مناسب نہیں،

ڈاکٹر صاحب کی یاد ان کے عقیدت مندوں کے دلوں میں ابھی تازہ ہے، وقت گزرتا جائے گا، اور ان کی شخصیت کے خط و خال ذہن میں دھندلے پڑتے جائیں گے، اس وقت ہر اس شخص کے پاس جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا (اور ایسے اشخاص کی تعداد ہزار ہا ہے) ان کا کوئی نہ کوئی ذہنی تبرک ضرور موجود ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان تبرکات کو جمع کر دیا جائے، افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو زندگی میں کوئی بوسول (Boswell) نہ ملا، اس لئے درخواست ہے کہ جن بزرگوں اور دوستوں کو ان سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوا ہو وہ ان کے جواہر ریزوں کو ضائع ہونے نہ دیں اور جلد تر انھیں دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے سیرت نگاروں کو اس مواد سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ "عبدالحمید"

۱۔ ایک روز طہارت کے اسلامی قواعد کا ذکر اتفاقاً چھڑ گیا، اس سلسلہ میں غیر مسلم قوموں کی طہارت بھی معرض بحث میں آئی، ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے "میں جب طالب علمی کے سلسلہ میں انگلستان گیا تو میرا لوٹا میرے ساتھ تھا، میں جب کبھی رفع حاجت کے لئے غسلخانہ جاتا، تو میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا، چند روز اسی طرح سے گذرے، آخر میری میزبان یعنی مالکۂ مکان (Land lady) سے رہا نہ گیا (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ ہونگی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھیں) مجھ سے پوچھنے لگیں یہ چیز تم غسلخانے میں کیوں لیجاتے ہو، میں نے ان سے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں ہے، بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے، چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، میں (یعنی ڈاکٹر صاحب) نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کئے، مثلاً یہ کہ غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہو جس طرح عورت پر طُہر کا غسل، میں نے کہا، بڑی بی، کسی خاص غسل کی تو آپکو اب حاجت نہ ہوگی، البتہ طہارت کے لئے پانی ضرور استعمال کیا کیجئے، یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئیں اور فرمانے لگیں کہ ضرور

ایسا کرونگی، مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں،

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ سائنس داں اور اہل طب کو اسلامی قواعد طہارت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں جو کام اہل فقہ نے کیا ہے اسے بغور پڑھنا چاہئے،

۲- "یہود" کا لالچ اور دولت کا عشق ضرب المثل ہے، اس کے متعلق کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے میری گفتگو ہوئی، ایک مرتبہ مثال کے طور پر فرمانے لگے کہ جب میں انگلستان گیا تو میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش کی کہ میرے قیام کا انتظام ایسے گھر میں کروا دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو، یورپ میں صرف یہود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائیں، چنانچہ ایک اچھے یہودی گھر میں میری رہائش کا انتظام کروا دیا گیا، ان لوگوں میں بہت خوبیاں تھیں، اپنی "نماز" باقاعدہ پڑھتے تھے جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا، میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے لئے بھی پیغمبر ہیں، اور میں ان کی روش پر چل سکتا ہوں، وغیرہ، لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا، مجھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر اس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جو کہ میں ان کے ذریعہ سے منگواتا تھا، یہ لوگ دوکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے، ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا،

۳- ہندوستانی مذاہب پر ایک روز مجھ سے باتیں کر رہے تھے، بدھ مت کا ذکر آگیا، فرمانے لگے انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا، یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی، اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا، گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا (all change) یعنی "سب بدل جاؤ"، ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا، کہ میرے اردگرد اخبار میں مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے، ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں،

ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہئے، چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا، میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں، یہ کہہ کر چپ رہا، چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا، میں نے پھر کہا ابھی جواب دیتا ہوں، وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں، میں نے کہا ہاں، اس دوران میں اسٹیشن آگیا، اور گارڈ all change پکارنے لگا، میں نے کہا بس یہی بدھ مذہب ہے، all change (یعنی مسئلہ تناسخ)

۴۔ کیمبرج کے زمانہ میں چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی، ایک صاحب پوچھنے لگے مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے، وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پیترا جمالیا، اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اسی لئے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں ایشیا میں مبعوث ہوئے، وہ صاحب بول اٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ انھوں نے جواب دیا، یہ تمھارے میکائیولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہیں، اس پر بہت قہقہہ پڑا،

۵۔ یورپ اور انگلستان میں اس وقت بھی ہزاروں اشخاص ایسے موجود ہیں جن کے خیال میں ہندوستان میں صرف بڑے بڑے دریا، پہاڑ، جنگل، بیابان، چند بڑے بڑے شہر، شیر، سانپ، بچھو، سپیرے اور جنگلی لوگ پائے جاتے ہیں، یہ خیال بہت کچھ یورپی پادریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی جدت طبع کا مرہون منت ہے، اسی طرح سے یہ لوگ اپنی بہادری اپنے ہم عصروں پر جتا سکتے ہیں اور گپیں ہانک کر مجلسوں کو گرما سکتے ہیں، چنانچہ طلب علمی کے سلسلہ میں جب اقبال انگلستان گئے (یہ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا) تو انھیں بھی اس طرز خیال کا تجربہ ہوا، ایک مجلس میں ایک لیڈی صاحبہ پوچھنے لگیں، کیوں مسٹر اقبال! کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا تھا؟ ڈاکٹر صاحب نہایت سنجیدگی سے بولے، نہیں بی جان، ہر روز نہیں، ہر تیسرے دن،

۶- ایک مرتبہ ایشیا اور یورپ کے باہمی فرق و امتیاز کا ذکر ہو رہا تھا، میں نے پوچھا کیا ایشیا اور یورپ کی عورتوں میں بھی وہی فرق ہے جو ان ممالک کے مردوں کے درمیان ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں میں نے انگریز اور جرمن عورتوں کے باہمی امتیاز اور فرق کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، (انگریز اور جرمن عورتوں کی تخصیص اس لئے کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب طلب علم کے زمانے میں زیادہ تر ان ہی دونوں ملکوں میں رہے تھے) فرمایا "انگریز عورت میں وہ "نسائیت" اور "بے ساختگی" نہیں جو جرمن عورت میں ہے، جرمن عورت ایشیائی عورت سے ملتی جلتی ہے، اس میں محبت کی گرمی ہے، انگریز عورت میں یہ گرمی نہیں، انگریز عورت گھریلو زندگی اور اس کی بندشوں کی اس طرح شیدا نہیں جس طرح کہ جرمن عورت ہے" میں نے عرض کیا آپکے اس خیال کی تصدیق مسٹر ڈبلیو، ٹی، سٹیڈ (W. T. Stead) (جو انگلستان کے مشہور سیاست دان تھے، اور کسی زمانہ میں انگریزی رسالہ ریویو آف ریویوز کے مدیر بھی تھے) کے ایک قول سے ہوتی ہے، جو اس وقت مجھے یاد ہے، ایک موقع پر انھوں نے یہ کہا تھا کہ جرمن عورتیں درحقیقت پردہ میں ہیں، (یہ قول زمانہ قبل از جنگ کا ہے، لیکن کوئی تعجب نہیں اگر اب بھی صحیح ہو) انگریز اور امریکن عورتوں کی آزادی کے مقابلہ میں جرمن عورتیں "تقریباً" پردہ ہی میں ہیں،

۷- طلب علم کے سلسلہ میں جب ڈاکٹر صاحب لندن میں تھے، تو سرسید علیہ الرحمۃ کے ایک رفیق جن کا نام مبارک مولوی . . . . صاحب تھا (غالباً آپ ایڈوکیٹ تھے) سیاحت کے سلسلہ میں یورپ کی سیر کرتے ہوئے انگلستان پہنچے، (ان بزرگ کو میں نے ۱۹۱۰ئہ میں مسلم یونیورسٹی کے وفد میں لاہور میں دیکھا تھا، میں ان دنوں اسلامیہ اسکول میں پڑھتا تھا، اس وقت مولوی صاحب شکل و ہیئت میں بالکل سرسید کا ثنی تھے، وہی لمبی ترکی ٹوپی، لمبی سفید داڑھی، سیاہ مارننگ ڈریس، الغرض چھوٹے پیمانے پر سرسید معلوم ہوتے تھے) پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ جنھیں اقبال سے شغف تھا اور جن کی توجہ سے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی مستفید ہوئے تھے، ان دنوں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے، اور اقبال کے مربی خاص تھے، بلکہ جب

پروفیسر موصوف چند ماہ کے لئے مصر تشریف لے گئے تو اقبال ہی کو وہ اپنا جانشین بنا گئے تھے،

مولوی صاحب لندن میں تشریف لائے، چونکہ پروفیسر آرنلڈ سرسید مرحوم کے حلقۂ اثر بلکہ خود علی گڈھ کالج میں رہ چکے تھے، اس لئے مولوی صاحب ان ہی کے پاس گئے، انھوں نے اقبال کو حکم دیا کہ بھئی مولوی صاحب کو لندن کی تمام قابلِ دید جگہیں اور چیزیں دکھادو۔ . . . . اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا، اور شام کے قریب کسی قہوہ خانہ میں جابٹھایا، وہاں چائے اور قہوہ کے علاوہ چند ستم پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں، اور خدا جانے اقبال کے اشارے یا خود اپنی جولانی طبع سے وہ مولوی صاحب قبلہ کے گرد جمع ہوگئیں، کوئی مولوی صاحب کو قہوہ پینے کی تلقین کرتی، کوئی ان کی نورانی داڑھی پر شیدا تھی، ایک دو نے تو شاید مولوی صاحب کے رخساروں پر عقیدت مندی کی ایک دو مہریں بھی جڑ دیں، اس مصیبت سے جب ان کو نجات ملی تو وہ غصہ سے بھرے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کی خدمت میں پہنچے اور اقبال کی شکایت کی، دوسرے روز جب اقبال پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بہت خفا تھے، فرمانے لگے اقبال تم لندن میں آکر بے حد شریر ہوگئے ہو، تمھیں شرم نہ آئی، مولوی صاحب ایسے بزرگ کو اس قہوہ خانے میں لے گئے، اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا، قبلہ "آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ لندن کی تمام قابلِ دید جگہیں مولوی صاحب کو دکھادوں، اگر میں مولوی صاحب کو صرف لندن کا عجائب خانہ، چڑیا گھر، محلات، تاریخی عمارتیں، وغیرہ ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے، اور ہندوستان جاتے ہوئے لندن کے متعلق نہایت غلط اور یک طرفہ خیالات لے کر جاتے، لندن کی زندگی میں قہوہ خانوں کا رخ خواہ برا ہو یا بھلا بہت اہم ہے، اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو یہ تاریک پہلو بھی دکھادوں، میں انھیں جان بوجھ کر وہاں لے گیا تھا، اقبال کا یہ خیال کہ زندگی کا ہر پہلو دیکھنے سننے اور تجربہ کرنے کے لائق ہے، ان کے اسلامی فلسفہ کا ایک اہم رکن تھا (اسی خیال سے مجبور ہوکر انھوں نے سوامی۔ بی کے سوانح نگاروں کو ٹوکا تھا، دیکھئے نیچے نمبر ۸)

۴۔ جسم اور روح کی جو غلط تقسیم پرانے زمانے سے فلاسفہ اور مذاہب میں ہو چکی ہے، اس کے برے نتائج میں سے سب سے برا نتیجہ یہ ہے کہ عام مذاہب میں جسم اور اس کی خواہشات کو برا کہا گیا ہے لیکن اسلام میں نہ "جسم" کو کبھی برا کہا گیا اور نہ جسمانی لذات کو کوسا گیا ہے، صرف اس کی حدیں مقرر کر دی گئی ہیں، جو شخص اسلامی حدود کے اندر رہ کر جسمانی لذات حاصل کرے، اس سے مواخذہ نہیں، اور نہ وہ گنہگار ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ ان لذات میں ترتیب کا لحاظ رکھے اور اعلیٰ کو ادنیٰ کے لئے قربان نہ کرے، دوسرے مذاہب کے بانی اور پیرو لذات جسمانی سے اس قدر متنفر ہیں، کہ خود "جسم" کا وجود ہی گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اس گناہ کا کفارہ صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر طرح سے "جسم" کو ایذا دی جائے اور جسمانی لذات کے حصول کو گناہ کبیرہ سمجھا جائے، ادھر "جسم" میں خودی ہے جس قدر اس کو ٹھکرا دو بگڑتا ہے، دباؤ ابھرتا ہے، لذات سے محروم رکھو تو ہر وقت ان ہی کی فکر میں رہتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس اسلامی تعلیم کو بار بار اور نئے نئے رنگ میں اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے،

قریباً بارہ یا سترہ سال ہوئے، میں ایک روز شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں یہی مسئلہ معرض بحث میں آگیا، فرمانے لگے، ابھی چند ہی روز ہوئے کہ مجھے اس اسلامی تعلیم کی صحت کا ثبوت ضمناً ذکر کرنا پڑا، دو تین ہندو صاحبان میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے رشی سوامی جی کی سیرت لکھی ہے، آپ چونکہ سوامی جی کے گہرے دوست تھے اس لئے آپ اس سیرت پر نظر ثانی فرمائیں اور ہمیں مزید مواد دیں، بلکہ خود بھی کچھ لکھیں وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے کہا "جو سیرت آپ نے لکھی ہے، دکھائیے"، ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو جستہ جستہ دیکھا، یہ سیرت بالکل اسی طرح سے لکھی گئی تھی جیسے اس نوع کی کتابیں بالعموم لکھی جاتی ہیں، یعنی ممدوح کو فرشتہ سیرت، ولی اور ہر قسم کی لغزشوں اور نقائص سے مبرا اور منزہ ثابت کرنا، ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا، آپ لوگوں نے سوامی جی کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، اور نہ اس درسِ عبرت کا جو ان کی زندگی

سے حاصل ہو سکتا ہے، اس کتاب میں ذکر ہے، انھوں نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا آپ کو معلوم ہے کہ فلاں سال سوامی جی اپنی تعلیم ہمہ اوست، اور "برہمچاریہ" کے پرچار کے لئے امریکہ تشریف لے گئے تھے، وہاں بعض لوگ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے، ان کے حلقۂ اثر میں آگئے، ان میں ایک مریدنی ضرورت سے زیادہ فیضیاب ہوئی، لیکن واپسی پر سوامی جی اس عورت اور بچہ دونوں کو امریکہ ہی میں چھوڑ آئے، یہ واقعہ ایک نہایت اہم اور عبرت آموز سبق ہے جو سوامی جی کی زندگی سے حاصل ہوتا ہے، کہ وہ خود "برہمچار" کو نباہ نہ سکے اور اپنے اس فعل سے انھوں نے اپنی تعلیم کو غلط ثابت کر دکھایا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس غلط تعلیم اور غلط اصول کو چھوڑتے، انھوں نے اپنی ناکامی کو چھپانا چاہا، اور اس وجہ سے انھوں نے بچہ اور اس کی ماں کو امریکہ میں چھوڑ کر ایک اخلاقی گناہ کا ارتکاب کیا، آپ لوگوں کا فرض تھا کہ سوامی جی کی زندگی کے اس اہم واقعہ کو کھول کر بیان کرتے تاکہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنی تعلیم میں جس کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی کس حد تک کامیاب رہے"۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ان دوستوں کو کیوں بھاتی، کہنے لگے، جناب والا ان باتوں کو کتابوں اور سیرتوں میں لکھنا نہیں چاہئے، یہ کہہ کر واپس چلے گئے،

میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ سوامی جی سے آپ کی دوستی کس زمانہ میں تھی، فرمایا کہ لاہور میں طالب علمی کے زمانہ ہی میں میری ان سے دوستی بڑھ گئی تھی، میں نے انھیں مثنوی مولانا روم سے آشنا کیا تھا، بلکہ پڑھائی بھی تھی، سوامی جی سے میں نے سنسکرت سیکھنا شروع کی تھی، ڈاکٹر صاحب سوامی جی کے خلوص نیت اور روحانی سرشاری کے بہت معترف تھے، اور اسی لئے وہ سوامی جی کے برہمچاریہ کی ناکامی میں ان کی حیات کا اہم ترین سبق پاتے تھے یعنی جو بات سوامی جی سے بھی نبھ نہ سکی وہ ہی غلط۔

۹- چند سال ہوئے ایک جرمن یا آسٹرین سیاح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا، آپ اس زمانہ میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے، سیاح صاحب "جہاں گرد" (GLOBETROTTER) بقول علی بخش

(ڈاکٹر صاحب کا ملازم) نے اسے پہلے دیکھا تو معلوم ہوا کہ پٹھانستان کا کوئی فقیر ہے، اسے اندر بلوایا گیا اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی بیاض دکھائی جس میں ہر ملک کے مشہور و معروف لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا، سیاح مذکور نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی اس میں کچھ لکھدیں، انھوں نے فارسی کا ایک قطعہ لکھکر دستخط کر دیئے، اس نے پوچھا آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا میرے آبا و اجداد برہمن تھے، انھوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گذار دیں کہ خدا کیا ہے، میں اپنی عمر اسی سوچ میں گذار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے،

۱۰۔ ۱۹۲۵ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں، جاڑے کا موسم تھا، ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے (بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھتے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے) لڑکے اندر آئے، یہ اسلامیہ کالج کے طلبہ تھے، میں چونکہ اسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لئے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا، مجھے یہ معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں وہ شام کے وقت وفد کی صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا "کیوں بھئی کیسے آئے"، انھوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے، جناب والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی بہت جمع ہونگے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "صدر" تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ "شعر بازی" سے تمھیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو "شعر بازی" کی ضرورت نہیں، اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے، لوگ شعر بازی کی طرف اسی لئے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش، مطالعہ اور محنت کے انھیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں "بقا" کا عنصر موجود ہو، آپ نوجوان ہیں آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہئے، ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف

موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا کم و بیش یہی ماحصل تھا، چنانچہ ان کی تقریر نے ان نوجوانوں شعراء کے جوش کو ٹھنڈا کیا، اور وہ یہ لیکچر سن کر بورڈنگ ہاؤس سدھارے،

۱۱- ۱۹۲۵ء میں ایک نامور بزرگ لاہور میں تشریف لائے، ان کی لیاقت، وسعت علم اور بالخصوص فصاحت و بلاغت کے متعلق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں، فن تقریر میں بہت کم لوگ ان کی ہمسری کر سکتے تھے، اور انگریزی زبان، محاورہ، تلفظ اور ادب میں تو انہیں بلا کی دسترس حاصل تھی، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ بھی نئے نئے وارد ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگریزی فن تقریر میں ان کا پایہ مسلّم ہے لیکن یاد رکھو کہ (انبیاء اور مصلحینِ اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں ان میں روحانیت کا نقدان ہوتا ہے In people other than prophets and great national reformers, too much of public speaking is very often a sign of spiritual poverty

"باتونی" حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بعض بڑے بڑے مقرروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط نہیں، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں، میں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لئے بہت منہمک رہا، لیکن بعد میں میں نے اسے بالکل ترک کر دیا، علامہ نے جو کلیہ اوپر بیان فرمایا ہے، اس میں "بے ضرورت" (Too much) یا "ضرورت سے زیادہ" پر زور ہے، عوام اور سامعین سے خراج تحسین حاصل کرنے میں مقرر صاحب کو وہ لطف حاصل ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث پر پورا عبور کئے بغیر دھواں دھار تقریر فرما دیتے ہیں، اس لئے ایسے بزرگوں کے اقوال و تقریروں میں سطحیت کا عنصر زیادہ نمایاں رہتا ہے، بہت کم مقرر ایسے ہوتے ہیں جو کاوش اور مطالعہ سے اپنے آپ کو اس خطرہ سے محفوظ رکھتے ہیں، ان سطحی مقررین

کے برعکس جو شخص کچھ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ اپنے الفاظ پر غور کرتا ہے، اور جب تک اسے اپنی بات اور اپنے استدلال پر پورا الیقین نہیں ہوتا، وہ انھیں عوام کے سامنے پیش کرنے سے گریز کرتا ہے؛ اس حقیقت کو البتہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کے دلوں کی تسخیر کے لئے جو طاقت اور جذب تقریر میں ہو سکتا ہے وہ تحریر میں ممکن نہیں،

انبیاء اور مصلحین اقوام ہر وقت فکر و عمل میں مصروف رہتے ہیں، وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ان کے الفاظ ان کے فکر و عمل اور ان کی روحانیت و الہام کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ شوق تقریر سے مجبور ہو کر نہیں بولتے بلکہ صرف اس لئے بولتے ہیں کہ بغیر تقریر کے چارہ نہیں، ان کی تقریر سراسر روحانیت ہوتی ہے، کیونکہ خود خدا ان کا سکھانے والا ہوتا ہے، علّمہ البیان،   (باقی)

دار المصنفین کی نئی تالیف،

تابعینؒ

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل، اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کیلئے نمونۂ عمل ہے، اسلئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، امام ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعین کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت للعہ،

"منیجر"

آخری سلاطین مغلیہ کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے رفیق دارالمصنفین

(۲)

بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر تیموری سلاطین کا خاتم ہے، وہ بادشاہ بنا لیکن حکمرانی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے اسلاف کی سطوت و عظمت کی یاد میں خون کے آنسو بہانے کے لئے، سلطنت ایک بیرونی قوم کے قبضہ میں جا چکی تھی، سکوں پر سے آل تیمور کا نام مٹ چکا تھا، بادشاہ محض ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہ گیا تھا، وہ پھر بھی بادشاہ کہلاتا تھا لیکن اسکی ساری بادشاہی قلعۂ معلی کی چہار دیواری تک محدود تھی، جہاں وہ نہ امورِ سلطنت کے لئے فرامین صادر کرتا، اور نہ اعیانِ حکومت کی مجلسیں منعقد کرتا، بلکہ صرف دل کے پھپھولے توڑتا، اور جب وہ پھوٹ کر بہہ جاتے، تو اس کے سوز و گداز کا اظہار اپنے نالہا سے موزوں سے کیا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اسکی آپ بیتی کو پڑھ کر دل پر جو اثر ہوتا ہے، وہ اور شعراء کی جگ بیتی سے نہیں ہوتا، خود کہتا ہے :-

اے ظفر یہ تیرے اشعار ہیں یا نالۂ زار   کیا بلا ہیں کہ جو یوں دل میں اثر کرتے ہیں

ظفر تاج و تخت کا نہ سہی لیکن اقلیم سخن کا بادشاہ تھا، جہاں اس نے اپنی طبیعت کی ذہانت ذکاوت اور بے قراری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ اگر وہ انہی اوصاف کو سیاسی کام میں لاتا

تو کیا عجب تھا کہ وہ اپنی ظفریاب فوجوں کے ساتھ اغیار کے شہروں اور ملکوں پر اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا نظر آتا، اور ایک کامیاب مدبر اور سیاست داں بھی ثابت ہوتا لیکن نہ اب رزم کی معرکہ آرائیاں تھیں، اور نہ بزم کی نکتہ آفرینیاں، لامحالہ ایک بےچین اور بےقرار ذہن کی تمام قوتیں ایک ہی طرف منتقل ہوگئیں، اور وہ شعر و شاعری کا میدان تھا،

ظفر کا دور ہندوستانی شاعری کا دورِ شباب تھا، نصیر، ذوق، ممنون، مومن، غالب، تسکین، اور شیفتہ کی شاعری نے ریختہ گوئی کی زمین کو آسمان پر پہونچا دیا تھا، ان ہی اساتذہ کیساتھ ظفر نے بھی طبع آزمائی کی، اور نمایاں حیثیت حاصل کی، نصیر نے ریختہ گوئی میں مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی، ذوق نے غزل کو زبان اور محاورات سے آراستہ کیا، مومن اپنی نازک خیالی اور شوخی ادا کیلئے ممتاز رہے، غالب کے طرزِ بیان، مسائلِ تصوف، اور نکاتِ فلسفہ نے شاعری کو عرشِ معلی پر پہونچا دیا، مگر اس گروہ میں ظفر کی شاعری میں جو سلاست، صفائی اور روزمرہ کی سادگی پائی جاتی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے،

طرزِ سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے، اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا
ظفر کلام میں تیرے عجب صفائی ہے، کہ ہر سخن ترا دُرِّ خوش آب سا چمکا
خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو ترا ہر شعر تر ہر بحر میں بحر المعانی ہے،

ظفر شاعری سے مناسبتِ ازلی رکھتا تھا، ایام شاہزادگی سے زندگی کے اخیر دنوں تک شعر و سخن کی مشق کرتا رہا، ولی عہدی کے دنوں میں دلی کے تمام باکمال شعرا[۱] اس کے درِ دولت پر حاضر ہوتے، اور وہ اپنا کلام سناتا، اور اُن سے ان کے نتائجِ فکر سنتا، سریر آرائے حکومت ہوا تو قلعہ معلی

[۱] مثلاً حکیم ثناء اللہ فراق، حافظ عبد الرحمن خان احسان، حکیم قدرت اللہ خاں، قاسم، میر قمر الدین منت، نظام الدین، ممنون،

کے اندر بزمِ مشاعرہ منعقد کراتا، کبھی کبھی شہر میں جا کر مشاعروں میں شریک ہوتا، اپنی غزلیں پڑھتا، دوسروں کی سنتا، داد لیتا اور داد دیتا تھا، یہاں تک کہ اساتذہ فن میں شمار کیا جانے لگا، چنانچہ تمام اربابِ نظر نے سکی سخن سنجی اور نکتہ آفرینی کی دل کھول کر داد دی ہے۔[۵۲]

ظفر شاعری میں پہلے تو نصیر، پھر بے قرار، پھر ذوق، اور آخر میں غالب کا شاگرد ہوا، مگر اسکی ذہین اور مجتہدانہ طبیعت نے کسی ایک کی بھی خالصتہً تقلید و پیروی نہیں کی، طبیعت میں خاکساری تھی، اس لئے اساتذۂ فن کی شاگردی قبول کر لیتا تھا، مگر اساتذہ اپنے لائق شاگرد کو اپنے خیالات اور جذبات سے متاثر نہ کر سکے، وہ شاید صرف فن کے اغلاط اور اسقام کو درست کر دیتے تھے، ورنہ اگر ظفر اپنی راہ چھوڑ کر اپنے استادوں کی راہ پر گامزن ہوتا، تو اس کے سارے کلام میں اول تو نصیر کی مضمون آفرینی اور شکوہِ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے، یا پھر ذوق کی طرح عام زبان کی کہاوتیں، اور عام لوگوں کے اوہام و مزعومات کی کثرت ہوتی، یا آخر میں

---

۵۲ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جو ظفر کے ہمعصر تھے، اور اسکی صحبت میں شریک بھی ہوتے تھے، لکھتے ہیں:

"بہ اکثر صفات موصوف و محامد مکارم معروف، در اکثر خطوط دستگاہے شایستہ دارد... باایں فن (یعنی شاعری) بسیار مالوف است، شیخ ابراہیم ذوق از زمرۂ نعمتش زلہ ربا و وظیفہ خوار است و افکار ایشان بحکِ اصلاح آوردہ است و ہموار"

منشی احمد حسین سحر تذکرۂ بہارِ بے خزاں (۱۲۹۱ھ) میں ظفر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ظفر تخلص، مرزا ابو ظفر بادشاہ دہلی بفن شعر میلے و مناسبتے تمام دارد، ابراہیم ذوق از مخصوصان حضرت اوست، و افکار ایشان باصلاحِ او چوں گوہر آبدار اند"

تذکرۂ بزمِ سخن میں ظفر کے بارے میں ہے:-

"در سخن پایہ ارجمند داشت اگفتارش اگرچہ سادہ پرکاست ہمہ اش خاطر نشکار است

غالب کے فلسفہ اور تصوف کی نکتہ آرائیاں اور فارسی کی پرشوکت ترکیبیں ہوتیں، مگر ان میں سے کسی کے رنگ کی اثر پذیری اس کے کلام میں نہیں، وہ اپنے ہی رنگ اور طرز ادا کا مالک رہا، بات یہ تھی کہ طبیعت میں شاعری کا مادہ بھرا تھا، پھر زندگی کچھ ایسی گذری کہ شاعر نہ بھی ہوتا، تو انقلاباتِ زمانہ اور حوادثِ روزگار سے خواہ مخواہ شاعر ہو جاتا، اسلاف کی عظیم الشان حکومت ہاتھ سے گئی، عزت و وقار کا خاتمہ ہوا، غدر ہوا تو نان شبینہ کو محتاج ہو گیا، دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرا، لختہائے جگر کو خون میں تڑپتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور آخر میں خود ایک مجرم کی حیثیت سے محبوس و مقید ہوکر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی، شاعر بننے کے لئے اور کیا چاہئے تھا، اور شعرا نے بلبل کے نالۂ و فریاد سے اپنی شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا، ظفر نے اپنی ہی آہ و بکا سے اپنی شاعری میں درد اور درد میں تڑپ پیدا کی، اور شعرا نے عاشقانِ زبون حال کے طوق و سلاسل کی ہولناک تصویریں

(حاشیہ) محاورہ گوئی از آن او ست و معاملہ نویسی زیر فرمانِ او"

منشی کریم الدین صاحب رقمطراز ہیں:۔

"شعرا ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا، ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا، کہ تخت نشین ہوئے، ابتدا میں ولی عہد تھے ان ایام میں بھی ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے، تمام ہندوستان میں اکثر قوال.... ان کی غزلیں اور گیت اور ٹھریاں گاتے ہیں، ہر ایک قسم کے شعر ہیں"

ظفر کی بابت مولوی امام بخش صہبائی کی دلچسپ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"گو ہر سخن اس کے لب سے ہم پایہ اعجاز اور مضمون نیاز اس کے اشعار میں ہم پہلوے ناز شاہدان محفل قدس ہر راہ سے اس کے جادۂ قلم میں عنان افگن ہیں، اور نازنینان ملک تقدس ہر طرف سے اسی کے میدان صفحہ میں گامزن ہیں، اس کے قلم کی صریر ہے یا

کیلئے عبرت کا پیام دیا، ظفر کی اپنی ہی زندگی قید اور زنجیر کی داستان رہی، اسلئے اسکی ہر صدا صحیح معنوں میں دنیا کی نیرنگیوں کی آواز بازگشت ہوگئی، اور شعرا نے ایک خیالی چمن کی بربادی اور اس کے پھولوں کی پامالی پر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا رونا رویا، ظفر نے اپنی سلطنت کے چمنستان کو اجڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے خیالات میں محشرستان پیدا نہ ہوتا تو آخر کس میں ہوتا، ؟ اپنی شاعری میں خون جگر خوب خوب بہایا، اسکی تمام شاعری مغلیہ سلطنت کی تباہی اور بربادی کا ایک مرقع ہو سکتی ہے یہ شاید قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ تیموری حکومت کا آخری فرمانروا ایسا ہو، جو صحیح طور پر اپنے کمال کے زوال کا خونچکاں ماتم کر سکے،

یہی وجہ ہے کہ ظفر کی شاعری حزن و ملال، رنج والم اور یاس وحسرت کی سراپا داستان ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۷) خوشخرامان معنی کی آواز یا اوس کے الفاظ سے فروغ معنی جلوہ گر ہے، یا مینا سے پری نقاب کشا...... اشعار متصوفانہ میں دیدۂ مینا اور ابیات عاشقانہ میں چشم گریہ زا اور بین السطور بہاریہ میں خیابان اور فلکیات میں کہکشاں نقش شگفتگی الفاظ سے نسیم چمن اور نگاہ تازگی رقم سے ریشہ یاسمن مصرع قامت شمشاد و بیت ابروئے خوبان فلخ و نوشاد"

عبدالغفور نساخ اپنے سخن شعرا (۱۲۹۱ھ) میں لکھتے ہیں:۔

"اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے تھے، شعر نہایت شیریں و نمکین کہتے تھے"

موجودہ دور کے ادبا میں خواجہ الطاف حسین حالی تحریر فرماتے ہیں کہ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکسان ہے،

محمد حسین آزاد نے باوجودیکہ اپنے استاد کی محبت، اور عصبیت میں ظفر کے تمام کلام کو ذوق کی طرف منسوب کر دیا ہے، پھر بھی وہ اس کو شعر و شاعری میں طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ بتاتے ہین،

دیوان میں بعض غزلیں ایسی ضرور ہیں جن میں رنگینیوں اور سرمستیوں کی جھلک ہے، بعض تو متانت اور سنجیدگی سے بھی گری ہوئی ہیں، مگر یہ شاید غایت رنج و مصیبت اور شدت غم والم کا رد عمل ہے، ظفر کی اندوہناک زندگی میں کوئی ایسی صورت باقی نہیں رہی تھی، کہ دو چار گھنٹے بیٹھ کر غم غلط کر لیتا، گذشتہ روایات کے مطابق شکار کی تفریحیں اور نہ عیش و نشاط کی محفلیں تھین، اور نہ قلعہ معلّیٰ کے اندر مسرت وشادمانی کی مجلسیں تھیں، لامحالہ شدتِ غم سے چھٹکارا پانے کے لئے ظفر شاعری ہی میں رند بلانوش اور غافل از تمکین و ہوش ہو جاتا، ورنہ اور کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ مصیبت و نکبت کی وجہ سے فقر و درویشی نے مزاج پر ایسا استیلا پا لیا تھا، کہ وہ نہ صرف برابر اذکار و وظائف میں مشغول رہتا، بلکہ آل تیمور کی نفلی دنیاسی پیری و مریدی ظفر کے ہاں حقیقت بن گئی تھی جس کا ذکر آیندہ صفحات میں ملے گا،

ظفر کا دیوان نولکشور پریس لکھنو سے چار جلدوں میں شائع ہوا ہے، جس میں ہر قسم کے تین ہزار سے زیادہ اشعار، مثلاً حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مثلث، مخمس، مستزاد، قطعات، رباعیات، پنکھا اور سہرا ہیں، بھاکا، پنجابی اور فارسی کے بھی اشعار ملیں گے، جن سے ظفر کی طباعی اور مختلف زبانوں پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، اس مجموعہ میں وہ حصہ شامل نہیں جو ظفر نے غدر کے بعد کہا، اس زمانہ کا کلام شائع نہ ہو سکا، بلکہ ضائع ہو گیا، حالانکہ اس عہد کی شاعری میں نہ صرف پختگی بلکہ جذبات میں اور بھی درد اور شدت پیدا ہو گئی ہو گی،

کلامِ ظفر | دیوان، حمد کے بجائے ایک نعتیہ قصیدہ سے شروع ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

اے سرورِ دو کون شہنشاہِ ذو الکرم — سر خیلِ مرسلین و شفاعت گرِ امم،
موکب ترا ملائک و مرکب ترا براق — مولد ہے تیرا مکہ و معبد ترا حرم
رنگِ ظہور سے ترے گلشن رُخِ حدوث — نورِ وجود سے ترے روشن دلِ قدم
ہوتا کبھی نہ قالبِ آدم میں نفخِ روح — بھرتا اگر خدا نہ محبت کا تیری دم

کرتا تھا جس سے مردہ کو زندہ دمِ مسیح — تھا شمّہ تیرے خلق کا وہ اے علو شیم
ٹوٹا جو کفر قوتِ اسلام سے تری — صد جا سے شئے شکستہ ہو زنارِ موجِ یم
تو تھا سریرِ اوجِ رسالت پہ جلوہ گر — آدم نہاں ہنوز پسِ پردۂ عدم
کرتا ہے تیرے اسمِ مبارک کو دل پہ نقش — اس واسطے عزیزِ جہاں ہو گیا درم
اے معدنِ کرم تری ہمت کے روبرو — کمتر ہے سنگ ریزہ سے قدرِ نگینِ جسم
جو کچھ سوا ئے عرش ہے سب اسکے سایہ میں — تیرے ہوا ہے جاہ کا برپا جہاں علم
صدقے زمیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسماں — رکھتا سرِ زمیں نہ اگر اپنا تو قدم
محروم تیرے دستِ مبارک سے رہ گیا — کیونکر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم
عالم کو تیرا نور ہوا باعثِ ظہور — آدم ترے ظہور سے ہے مظہرِ اتم
ہیں زائرانِ روضۂ اقدس تری جہان — آتا ہے پائے بوس کو واں روضۂ ارم
واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا — والشمس ہے ترے رُخِ پُر نور کی قسم
انصاف تیرا دیوے جو دادِ ستم کشاں — دندانِ سین آرہ کشاں ہو سرِ ستم
قرآں میں جب کہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا — کیا تاب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے رقم
تیری جنابِ پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض — صدقے میں اپنی آل کے اے شاہِ محتشم
صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دور کر — آئینۂ ضمیر سے میرے غبارِ غم
پہونچا نہ آستانِ مقدس کو تیرے میں — اس غم سے مثلِ چشمہ ہوئی میری چشم نم

پر خاکِ آستاں کو تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سرمہ میل تصور سے دم بدم

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ نعت کہنا کتنا مشکل ہے، بقول عرفی، ع رہ بردمِ تیغ است قدم را

لیکن ظفر کے ہم عصر شعراء میں اتنا مؤثر نعتیہ قصیدہ کسی نے نہیں کہا، وہ کچھ اور نہ بھی کہتا، تو صرف یہی قصیدہ اسکے اعجازِ شاعری کیلئے دلیل و برہان تھا، دیوان کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا حصہ حمد سے شروع ہوتا ہے، جس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

شاباش دلا! آسرے شد ک اللہ تعالیٰ　　پہچانا اسے تو نے جسے دیکھا نہ بھالا
اللہ ری تری جنبشِ مژگانِ ستم کیش　　اک پل میں کئے تو نے دو عالم تہ و بالا
ادا پورا نہ ہو یک حرف اصلا حمدِ یزداں کا　　اگرچہ صد زباں ہو دو زباں خامۂ سخنداں کا
اگر ہو جائے پارہ پارہ دل اسکی محبت میں　　تو پھر ہر پارۂ دل کو سمجھ سی پارہ قرآں کا
جسے خیال ہے کچھ رحمتِ الٰہی کا،　　گناہ سمجھے ہے دعوی وہ بیگناہی کا
یہ لطف دیکھ کہ خود بے نیاز ہے لیکن　　دھیان ہے اُسے بندوں کی خیر خواہی کا
تم اپنے جی میں عزیز اور ذلیل ٹھہرالو　　خدا ہے ایک مہ و مہر و مرغ و ماہی کا

ظفر کو اپنے حمد و نعت پر بہت زیادہ فخر تھا، چنانچہ کہتا ہے،

ظفر مضمون حمد و نعت کے لکھا ہو رنگیں سو　　ورق میرے سر دیواں کا ہو اک باغ رضواں کا

ظفر کی المیہ شاعری

اوپر کی سطروں میں کہا گیا ہے کہ ظفر کی تمام شاعری الم و یاس اور اندوہ و غم سے بھری ہوئی ہے بعض غزلیں تو پوری کی پوری المناک جذبات سے لبریز ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی مٹی ہوئی شوکت اور گذری ہوئی حشمت پر بے اختیار ہو کر روتا ہے اور آنسو بہا بہا کر کہتا ہے :-

بلا سے گرچہ ہوتا رازِ دل افشا ہو رونے میں　　نہ روکو مجھکو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں
پڑا ہے کشتیِ افلاک کا رونا زمانے میں　　مری آنکھوں نے وہ طوفاں کیا برپا ہے رونے میں
مری دیوانگی کا اے پری، رہ ہے عجب عالم　　کبھی رونے میں ہنستا ہوں کبھی ہنستا ہوں رونے میں

سُنا ہی نوح کے طوفاں کو یاروں نے کانوں سے مگر آنکھوں سے اپنی ہم نے وُہ دیکھا ہے رونے میں
لگے آگ ایسے رونے کو کہ مثل شمع گھل گھل کر بہا جاتا مرا دل سوز سرتاپا ہے رونے میں
ظفر ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے
رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

پھر بھی روتا جاتا ہے، اور اس رونے میں اتنی شدت ہو کہ اسکو خود احساس ہے، کہ

لگ جائے جھڑی برسوں پھر اپنے جھڑیں آنسو جھاڑوں جو دم گریہ میں دامنِ مژگاں کو

اور جب رو کر چپ ہوتا ہے، تو اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے آہ سوزاں بلند کرتا ہے،

شعلہ جو سوز دل سے گلوگیر آہ ہو پیکاں نمط عیاں وہ سر تیر آہ ہو
سیل سرشک چشم بھی ہمراہ ہو اگر جوں سرو آبجو عیاں تو قیر آہ، ہو
دکھلائے جو سوزش دل کو تو برق بھی حیران دیکھ عالم تنویر آہ، ہو
کلک جلی تو شمع جگر سے بنا مانی جو کھینچے تو مری تصویر آہ ہو
نالاں ہیں ایک عمر سے ہم اسلئے ظفر کب اسکے دل میں دیکھئے تاثیر آہ ہو

اور جب آہ کھینچنے سے بھی اس کو تشفی نہیں ہوتی، تو چیخیں مارتا ہے، اسطرح جیسے کوئی نشترِ غم اس کے تمام جسم میں چبھو رہا ہو،

کیا رنگ دکھاتی ہے یہ چشم ترا ہو ہو خونِ جگر آیا ہا لختِ جگرا ہو ہو،
اس ہستی یک دم پر اف بل بے تری گرمی ہنستا ہے شرارت سے کیا کیا شررا ہو ہو،
اک وار میں دو ٹکڑے کرتی ہے مرے دل کے کیا تیز ہے قاتل کی تیغ نظرا ہو ہو،
چھڑکے ہے نمک قاتل لے لیکے نمکداں سے لیتے ہیں مزے کیا کیا زخم جگرا ہو ہو،
ہستی کی عدم سے مر مر کے پہونچتے ہیں اک دم کی مسافت پر اتنا سفرا ہو ہو،

اس پر بھی اسکو تسکین نہیں ہوتی ہے، تو اپنی حالت اس طرح بیان کرتا ہے، کہ

سینہ میں اک دھواں کئی بار اٹھکے رہ گیا نکلا نہ میرے دل کا بخار اٹھکے رہ گیا
آیا نہ میرے دیدۂ گریاں کے سامنے سو بار دیکھا ابر بہار اٹھکے رہ گیا
دنیا جلا فلک کو مگر خیر ہو گئی ساتھ آہ کے جو دل سے شرر اٹھکے رہ گیا

آتشِ غم سے اس کا دل جل کر داغدار ہو گیا تھا، وہ بھی ایسا کہ خود کہتا ہے

ذرہ جو دکھاتا ہوں داغ دلِ سوزاں کو چڑھتی ہے تپ لرزہ خورشید درخشاں کو

وہ اپنی مصیبتوں اور صعوبتوں سے گھبرا جاتا ہے، اور ظالم چرخ سے شکایت کرتا ہے کہ

سدا گردش میں ہم ہوں اور نہ اکدم در ساغر ہو یہ کیا انصاف ہے اے چرخ گرداں یہ ہو وہ ہو

مگر پھر اپنے کو یہ کہکر تسلی دیتا ہے، کہ

ہو زیر فلک راحت کس طرح ظفر ہم کو آرام نہیں آپ ہی اس گنبد گرداں کو

یہ تو ظفر کی وارداتِ زندگی کا نالہ و شیون تھا، جن کے تاثرات کی گہرائی کو ظفر نے خود بیان کیا ہے کہ،

ہمسر ہوں میرے نالہ کو کیا نالہا نے اس میں ظفر یہ سوز کہاں اور کہاں گداز

اب یہی سوز و گداز اس کی شاعری کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے، جب وہ ایک شاعر بن کر عشق کی تمام واردات یعنی محبوب کی کج ادائیاں، ستم آرائیاں اور بے اعتنائیاں بیان کرتا ہے تو طالب محبوب کی محویت شیفتگی اور ہجوم آرزو میں صرف سوز و گدازہی کی نیرنگیاں دیکھنا چاہتا ہے، اسکا معشوق معشوقوں کی طرح ظالم، پُر فریب، حیلہ ساز اور دل آزار ضرور ہے لیکن اس کے عاشق کے عشق میں ہوسناکی نہیں وارفتگی ہے، وصال کی لطف اندوزی نہیں، ہجر کی غم انگیزی ہے، اور حسن کی رسوائی نہیں بلکہ عشق کی پسپائی ہے۔

اس کا عاشق عشق کے میدان میں اس طرح آتا ہی کہ

جو آگے عشق کے میدان میں بڑھائے پاؤں   تو شرط یہ ہو کہ پیچھے نہ پھر اٹھائے پاؤں

اور جب وہ سر بکف ہوکر اس میدان میں آجاتا ہی، تو پھر وہ ہے اور ہر قسم کی مصیبتوں کی ہلاکت خیزی، وہ ہی اور عشق کی آتش افروزی،

ہوتی ہی بری عشق کی آتش یہی ڈر ہی   گھر پھونک نہ دے آتش سوزاں کسی کا

خانہ دل کو لگی ہی آگ سوز عشق سے   ہر بُن مو سے نکلتے ہیں شرارے بے طرح

مگر با ایں ہمہ وہ عاشق سے ضبط، تحمل، سرفروشی، بلکہ صرف تڑپ چاہتا ہے، اور وہ بھی ایسی کہ جل کے خاک ہو دل اور خبر کسی کو نہ ہو،

وہ تو عشق میں رونے کا بھی قائل نہیں،

رو رو کے میرا راز نہاں فاش کر دیا   خانہ خراب ہو جیو چشم پُر آب کا،

لیکن جب ہجر میں بے تاب ہو کر روتا ہے، تو پھر یوں کہ

نہیں لے ابر ہم قائل کہ آنسو سر بسر ٹپکے   وہ کیا آنسو ہو جو بے آمیزش خون جگر ٹپکے

ہر اک آنسو کا قطرہ ہی جو دانا کہربا کا سا   دم گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر ٹپکے

مگر حقیقت میں وہ چشم گریاں کا نہیں، بلکہ دل بریاں کا قائل ہے، دل جل جائے مگر شرط یہ ہی کہ خاکستر نہ ہونے پائے بلکہ اس میں صرف سوزش ہو اور اس طرح کہ

دکھلائیں سوزش دل بے تاب ہم اگر   کانپ اٹھے شعلہ شوق سے نار جحیم کا

اور اس سوزش میں اتنی ٹیس ہو کہ

دونوں گداز عشق سے بہ جائیں ہو کے آب   آہن جو دل کے پاس ہو پتھر جگر کے پاس

اور پھر اس کے دل میں کچھ باقی نہ رہ جائے،

دل میں تو کچھ نہیں ہے، وہم دود دلِ ظفر ‎ اک آہ رہ گئی ہے، فقط اک جگر کے پاس

ظفر کے عشق کا فلسفہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا عشق تو اس کا مقتضی ہے کہ عاشق اس سوزش سے مضطرب، بے قرار اور بے چین ہونے کے بجائے لطف اندوز ہو عشق کی آگ سے دل پر داغ پڑ جائیں، مگر:-

خانۂ دل میں رہے روشنی داغِ عشق ‎ بجھنے نہ پائے مرا یہ کبھی یارب چراغ

اور گو جگر میں زخم پڑ جائیں لیکن:-

پھاہا نہ زخمِ دل سے اٹھا میرے چارہ گر ‎ رہنے دے اس کو تو خم پر جوش ہو ڈھنکا

کیونکہ

سب یہ کھل جائیگا میرے دلِ مجروح کا حال ‎ دل کے زخموں سے ذرا بھی جو یہ سرکے پھاہے

ظفر کے یہاں ایک کامیاب عشق کے مدارج یہاں پر بھی ختم نہیں ہونے پاتے، اصلی سوزِ عشق تو یہ ہے، کہ

دفن ہو ویگا ترا کوئی جہاں سوختہ جان ‎ سبزہ واں خاک سے پیدا کبھی ہوئیگا نہیں

بلکہ

اف ترے کشتہ کا سوزِ دل کہ ظالم سنگ بھی ‎ گور پر اس کے رہا محشر تلک جلتا ہوا

اور

رفاقت کیا کہوں آہ جگر اور داغِ سوزاں کی ‎ ہماری قبر پر حاجت نہیں ہے شمع گریاں کی

(باقی)

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

کا

سالانہ اجلاس

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ہمارے ملک کا سب سے پُرانا ادارہ ہے جس کا مقصد عربی زبان کی قدیم نادر کتابوں کو چھاپ کر عام کرنا ہے، نواب عماد الملک بہادر مرحوم اور اُن کے چند ساتھیوں کی کوششوں سے آج سے نصف صدی پہلے اس کا قیام ہوا، اور اس وقت سے آج تک اوس کی زندگی کا ہر قدم آگے ہے،

دائرہ نے اپنی زندگی کے چند سالوں میں حدیث، رجال، فلسفہ، تاریخ، طبقات، طب، وغیرہ کے ایسے انمول موتی ہمارے دامن میں دھر دیے ہیں، کہ اس مفلسی کے ایام میں ہم کو بھی تھوڑی دیر کے لئے غرور ہو جاتا ہے، کہ شاید ہمارا پہلا زمانۂ سعادت پھر عود کر آیا ہے،

عربی ہندوستان کی زبان نہیں لیکن دنیا میں بحمد اللہ ایسے ملک موجود ہیں، جہاں کی زبان عربی ہے، اور جہاں عربی کتابوں کی مانگ ہی، پھر بھی جو چیز اس ہندوستانی دائرہ کو دوسرے عربی بولنے والے ملکوں کے مطبعوں اور اداروں سے ممتاز کرتی ہی، وہ یہ ہے کہ دائرہ نے اپنے کاموں میں کبھی تجارتی نقطۂ نظر کو دخل نہیں دیا، اور دوسرے عربی ملکوں نے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، ساتھ ہی دائرہ نے بازار کو دیکھ کر متاع پیش نہیں کی، بلکہ ضرورت اور حاجت اور افادہ پر اسکی نظر رہی، یہی سبب ہے کہ آج دائرہ کے خدمات تمام اسلامی دنیا میں مانے جاتے ہیں، اور سرکار آصفیہ کی یہ وہ

سعادت ہی جس میں آج کوئی اسلامی حکومت اسکی حریف نہیں،

دائرہ یوں تو ہمیشہ اپنے کاموں میں مستعد ہے، مگر یہ کہنا بیجا نہیں کہ اعلیٰ حضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کی سرپرستی میں جب سے نواب حیدر نواز جنگ سر اکبر حیدری نے اسکی صدر نشینی اور نواب مہدی یار جنگ بہادر نے اسکی معتمدی قبول کی ہے، اور اہتمام کی عنان بعض پرجوش کارفرما نوجوانوں کے ہاتھوں میں آئی ہے، اسکی حیثیت اور قدر و قیمت میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے،

اسی ترقی کا ایک قدم وہ ہے جس کا ذکر اس مضمون کا سر عنوان ہے، ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے، کہ دائرہ نے اب یہ کوشش کی ہے، کہ وہ سال میں ایک دفعہ پورے ملک کے عربی کے علماء محققین کو ایک مجلس کی شرکت کی دعوت دے، چنانچہ اس مجلس کا پہلا اجلاس ۹۔۱۰۔۱۱۔۱۲ جولائی ۱۹۳۴ئہ کو حیدر آباد دکن میں ہوا، ملک کی اکثر یونیورسٹیوں کے عربی پروفیسر اور بعض علماء ان تاریخوں میں دائرہ کے جلسوں میں شریک ہوئے، اور اپنے اپنے مقالے اور مضمون پڑھکر سنائے اکثر مقالے عربی میں لکھے گئے تھے، اور عربی ہی میں پڑھے گئے،

افتتاحیہ جلسہ اس کا افتتاحیہ جلسہ ۹ جولائی کو ۹ بجے دن سے ۱۰ بجے دن تک حیدر آباد دکن کے باغ عامہ کے اندر ٹاؤن ہال میں ہوا، وسیع ایوان ارکان سلطنت، اہل علم، اور مستعد طلبہ سے بھرا تھا، دولت آصفیہ کا صدر اعظم جلسہ کا صدر نشیں تھا، سارے مجمع پر خاموشی چھائی تھی، کہ دفعۃً قاری ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد نے اپنی جلال بھری آواز میں خالق ذوالجلال کے کلام سے لرزہ پیدا کر دیا، اس کے بعد صدر اعظم بہادر نے اپنا اردو خطبہ پڑھا جس میں دائرہ کے خدمات کی تحسین تھی، اور آخر میں اعلیٰ حضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کا شاہانہ پیام پڑھکر سنایا، جو عام اہل علم اور خاص دائرہ پر خسروانہ لطف و کرم سے معمور تھا،

اس کے بعد نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیمات و سیاسیات سرکار عالی معتمد دائرۃ المعارف

نے اپنا دلچسپ خطبہ پڑھکر سنایا، جو عام طور پر پسند کیا گیا، اس کے بعد ایک یمنی فاضل مولانا عبد اللہ صاحب رفیق دائرۃ المعارف نے اپنا عربی قصیدہ پڑھا،

آج جمعہ کا دن تھا، اس لئے ۱۰ بجے کے بعد جلسہ ختم کر دیا گیا، باہر کے اکثر مہمانوں نے نماز جمعہ مکہ مسجد میں ادا کی، قاری ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد نے حسب دستور زبانی خطبہ پڑھا جس میں برجستہ قرآنی آیتوں کی تضمین بہت موثر تھی، تمام ہندوستان میں آج حیدرآباد ہی وہ ملک ہے، جہاں کے منبر سے بارہ سو برس کی دیرینہ رسم کی یاد تازہ ہوتی ہے، یعنی خطبہ کے آخر میں خطیب سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کا نام لیکر دعا کرتا ہے،

پہلا جلسہ | دائرہ کا پہلا عام اجلاس ۱۰ جولائی کو ۲ بجے شام سے ۵ بجے شام تک بلدیہ کے اسی وسیع و شاندار ہال میں ہوا، نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر کی کرسی پر جلوہ افروز تھے، سب سے پہلے شیخ ابراہیم حمدی صاحب مدنی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ نے جو آجکل خوش قسمتی سے یہاں موجود تھے، قرأت کی، اس کے بعد پروگرام میں سب سے پہلے ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کے اصول پر راقم الحروف کا نام تھا، راقم نے چھٹی صدی کے مشہور مسلمان فلسفی ابو البرکات بغدادی کی غیر مطبوعہ کتاب المعتبر پر زبانی تقریر کی، مقالہ لکھا ہوا ہاتھ میں موجود تھا، جو عنقریب شائع ہوگا، یہ وہ مسلمان فلاسفر ہے جس نے ارسطو کے فلسفہ اور منطق پر ایسی ناقدانہ کتاب لکھی ہے، جسکی تعریف و توصیف ہر زمانہ کے باکمال اہل علم نے کی ہے، یہ تقریر پون گھنٹہ میں پوری ہوئی،

نمبر سے بعد مولینا عبد العزیز صاحب میمن، پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جو ابھی اسی سال اسلامی ملکوں کی علمی سیاحت کرکے واپس آئے ہیں، تین اسلامی ملکوں کے کتب خانوں میں کیا کیا دیکھا، [illegible] ایک مضمون پڑھا جس میں ان کے اس سفر کا حال اور مصر و شام و عراق اور

قسطنطنیہ کے کتب خانون کی اُن نادر کتابون اور نسخوں کا تذکرہ تھا، جنکو انھون نے اپنے اس سفر میں دیکھا تھا مضمون دلچسپ اور پُر معلومات تھا،

ان کے بعد مولینا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کھڑے ہوئے اور شیخ محی الدین ابن عربی کے فلسفہ پر ایک محققانہ عربی مضمون پڑھا جس میں پہلے یہ دکھایا تھا کہ ہمارے مجتہدین کرام نے فقہ کی تدوین کرکے کس طرح اسلامی قانون کو بادشاہوں کے تصرف سے آزاد کیا، اسی سلسلہ سے وہ اندلس پہونچے، اور مالکی مذہب کے وہاں کے ملکی مذہب ہونے کا سبب بیان کرکے ابن رشد اندلسی کے فلسفہ کی تشریح کی، اور پھر بتایا کہ محی الدین ابن عربی نے کس طرح ابن رشد کے مشائیانہ فلسفہ کی بیخ کنی کرکے اپنا فلسفۂ وحدۃ الوجود پیش کیا،

پہلے جلسہ کا پروگرام اسی مضمون پر ختم ہوگیا،

دوسرا اجلاس | دائرہ کا دوسرا عام اجلاس شہر سے چھ سات میل دور عثمانیہ یونیورسٹی کے ایوانِ عام میں ہوا، ڈاکٹر عبد الحق صاحب عربی پروفیسر جامعہ عثمانیہ اس جلسہ کے صدر تھے، حاضرین میں علماء اور اہلِ علم کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبہ کی تعداد زیادہ تھی، سب سے پہلے قاری روشن علی صاحب ناظر القرأ سرکار عالی نے چند آیتیں تلاوت کین، پھر ڈاکٹر داؤد پوٹا صاحب پروفیسر عربی اسمٰعیل کالج بمبئی نے عربی میں ابن خلدون کے فلسفۂ اجتماع پر ایک مضمون پڑھا، پروفیسر موصوف آج کل ابن خلدون کے مقدمہ کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، مضمون دلچسپ اور دلپذیر تھا،

اس کے بعد مولینا شیخ عبد الرحمان صاحب یمانی رفیق دائرۃ المعارف نے عربی میں علم اسماء الرجال اور اسکی اہمیت پر ایک مضمون سُنایا، جسکو موصوف نے محنت سے لکھا تھا،

بعد ازین ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر اصول فقہ و قانون جامعہ عثمانیہ نے اردو میں "عہد نبوی کے اوّلین دستور مملکت" پر ایک محققانہ مقالہ پڑھا، آنحضرت صلعم نے مدینہ منورہ آنے کے بعد مسلمانوں اور

یہودیوں کے درمیان جو عہد نامہ مرتب فرمایا تھا، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس عہد نامہ کے تمام اجزا یکجا کئے تھے، اور ان میں سے ہر ایک کی تشریح کی تھی، اور بتایا تھا کہ اس عہد نامہ کی حیثیت ایک مملکت کے اساسی دستور کی ہے،

اس کے بعد مولینا سید احمد اللہ صاحب ندوی رفیق دائرۃ المعارف نے مسلمانوں کے علم جرّاحی (علم صناعۃ الجراحہ) پر عربی میں اپنا مضمون سنایا، اور عرب جرّاحوں کے آلات کی تشریح کی،

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے ہندوستان میں ایک عربی اکاڈیمی (المجمع العربی) کے قیام کی ضرورت پر عربی مضمون پڑھا جس میں خطابت کی پوری شان تھی، موصوف نے مدرسہ نظامیہ سے پڑھکر مصر اور پھر یورپ جاکر تحصیلِ علم کی ہے،

تیسرا اجلاس دائرہ کا تیسرا عام اجلاس جامعہ عثمانیہ کے ایوان تقریر میں دوسرے دن پھر ساڑھے دس بجے دن سے شروع ہوا، جلسہ کے صدر نشین نواب محمد یار جنگ بہادر تھے، نواب موصوف نسلاً عرب ہیں، سرکار آصفیہ کی اعلیٰ ملازمت (صوبہ داری) میں عمر بسر کی ہے، اور اس پیری اور کبر سنی کے باوجود علمی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں، چنانچہ دائرہ کے وہ ایک معزز عہدہ دار بھی ہیں،

آج کے جلسہ کا آغاز قاری عبد الرحمٰن صاحب شیخ التجوید مدرسۂ نظامیہ نے اپنی قرأت سے کیا، اس کے بعد ڈاکٹر حسین الہمدانی پروفیسر عربی الفنسٹن کالج بمبئی نے اپنا عربی مضمون بڑی خوبی سے پڑھا، مضمون کا عنوان "کتاب الریاض لاحمد الکرمانی" تھا، یہ تیسری صدی کا اسماعیلی متکلم اور فلسفی تھا، اور فارابی کا معاصر تھا، ڈاکٹر ہمدانی اصل میں یمن کے باشندہ اور اسماعیلی مذہب کے بڑے واقف کار ہیں، یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسماعیلی کتابوں سے دنیا کو آشنا کیا ہے، ورنہ وہ اب تک راز کے طور پر چھپائی جاتی تھیں، موصوف نے اپنے مضمون کے شروع میں اسماعیلی ادبیات کی تھوڑی سی مجمل تاریخ بھی بیان کی،

ان کے بعد ہمارے پرانے دوست مولینا عبد اللہ العمادی نے جو دکن جاکر ہندوستان سے گم ہو گئے ہیں، ابن ہیثم کے علم مرایا ومناظر پر ایک عربی مضمون پڑھا، بعد ازیں دمشق کے عالم علامہ مامون ارزنجانی نے عربی زبان کی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے مسئلہ پر عربی میں تقریر کی، دورِ شام میں عربی زبان کے ابجد کے قواعد اور ریڈریں جو نئے اصول کے مطابق لکھی گئی ہیں، ان کو پیش کیا، اور طلبہ کو اصلاح دینے کے نئے طریقے کے نقشے دکھائے،

اسکے بعد ہمارے نوجوان فاضل مولوی عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی مددگار معجم المصنفین نے جن کو ہمارے خیال میں قیم المصنفین کہنا صحیح ہوگا، ایک عربی کتاب "کتاب المخترع فی فنون من الصنع" پر ایک عربی مضمون پڑھا، کتاب کے مصنف کا حال گو معلوم نہیں، مگر یہ نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ میں ہندوستان کا لکھا ہوا ہے، اور ضیا ترک قاضی خان ناگوری کے قلم کا ہے، اس کتاب میں مختلف صنعتوں اور صناعیوں کے نسخے اور تدبیریں بتائی گئی ہیں، اور اس لحاظ سے اسکی خاص اہمیت ہے، نسخہ ۶۰۰ھ کا لکھا ہے،

ان کے بعد مولینا امتیاز علی خان عرشی ناظم کتبخانہ سرکاری رامپور نے امام سفیان ثوری کی تفسیر پر اردو مضمون پڑھا، اس تفسیر کا نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے، (معارف میں بھی اس کتاب پر ایک مضمون عرشی صاحب لکھ چکے ہیں) مضمون کے آغاز میں ثابت کیا گیا تھا: کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے قرآن ہی کی خدمت کی، اور تفسیر پر کتاب لکھی،

جلسہ کے آخر میں نواب محمد یار جنگ بہادر نے اپنا مختصر خطبۂ صدارت پڑھا، اور جلسہ ختم ہوا، آج یہیں جامعہ عثمانیہ کے بورڈنگ میں مہمانوں نے دوپہر کا کھانا کھایا، جسمیں خود وزیر تعلیم وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے دوسرے پروفیسر اور تعلیمی حکام شریک تھے،

چوتھا اجلاس آج دائرہ کا آخری اجلاس تھا، یہ ٹون ہال میں منعقد ہوا، مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ صدارت کی کرسی پر متمکن ہوئے، مولوی حسن شاہ صاحب نے

قرائت کی، اس کے بعد مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی مہتمم اعلیٰ دارالعلوم دیوبند و صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے علم وحی کے بری عن الخطا ہونے پر تقریر کی، اور تجویز پیش کی، کہ دائرہ اب علوم القرآن کی طرف توجہ کرے، اور ان فنون کی کتابیں شائع کرے،

اس تقریر کے بعد شمس العلما ر مولانا عبدالرحمٰن صاحب عربی پروفیسر دہلی یونیورسٹی نے "کلمۃ فی المتشرقین" کے عنوان سے ایک عربی مضمون پڑھا اور اس کی تشریح کی، اس مضمون میں مستشرقین یورپ کی تاریخ اور ان کے عیب و ہنر پر کلام تھا،

اس کے بعد ڈاکٹر زبیر صدیقی صدر شعبۂ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی نے ادبیات علم حدیث پر ایک دلچسپ مضمون اردو میں پڑھکر سنایا، اس میں موصوف نے یورپ کے مستشرقوں نے علم حدیث پر جو زہر اگلا ہے، اُس کا تریاق پیش کیا تھا، اور دکھایا تھا کہ ہمارے علم حدیث کی چند خاص خصوصیتیں ہیں، ایک اسناد، یعنی ہر واقعہ کے بیان میں واقعہ کے اخیر شاہد تک پہنچنا، اس سلسلہ میں بتایا کہ دوسری قوموں میں اسناد کا پتہ کہاں تک چلتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ محدثین سلاطین زمانہ کے درباروں سے یکسر بے تعلق رہے، اور جن ایک دو کو تعلق بھی تھا، تو وہ آزاد اور حق گو رہے ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین اسلام بھی اپنی حیثیت کے مطابق شریک رہیں، چوتھی خصوصیت وہ حزم و احتیاط ہے، جو محدثین نے روایتوں میں برتی ہے آخر میں فاضل مقرر نے علم حدیث کے نشر و اشاعت اور تعلیم میں ائمہ اور شیوخ نے جو محنتیں کی ہیں، ان کا مختصر مگر دلپذیر حال بیان کیا،

آخر میں مولینا سید ہاشم صاحب ندوی ناظم دائرۃ المعارف اپنا مضمون پڑھنے والے تھے، مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے پڑھ نہ سکے، اور عربی علوم و فنون اور عربی زبان کی یہ پہلی کانفرنس اعلیٰ حضرت آصف سابع کی سلامتی کی دعا پر ختم ہوئی،

"س"

تلخیص و تبصرہ

سیرت کا مولد

(سلسلہ گذشتہ)

جیسا کہ کہا گیا ہے، ماں وہ زمین ہے جس میں ہماری جڑیں نصب ہیں لیکن باپ یوں کہنا چاہئے کہ آسمان کی جانب اشارہ کرتا ہے، جدھر ہمیں بڑھنا ہے، باپ ان مطالبات کا قائم مقام ہے، جو انسان پر دنیا کی طرف سے ہوتے ہیں، وہ ایک خارجی معیار قائم کرتا ہے، وہ فرض منصبی کا احساس پیدا کرتا ہے، وہ کامرانی کے تصور کو مجاز کی صورت میں پیش کرتا ہے، اس کے اندر اختیار و حکومت کے اصول کو مجسم شکل میں دیکھتے ہیں،

باپ کی محبت تمامتر ایک مختلف قسم کی محبت ہے، جب کہ ماں کی محبت ایک ہمہ گیر جوش ہوتی ہے، اور اس کا اظہار سیدھے سادے اور بے تکلف طریقہ پر بچہ کی اصلی ہستی کی قدر شناسی میں ہوتا ہے، باپ کی محبت بچہ کی مخصوص اہلیتوں اور معین کارناموں کے اقرار و اعتراف کی شکل اختیار کرتی ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ الفاظ میں تعریف و توصیف کرے، اور بچہ کو اس بنیادی اور لازمی قدر و اعتراف سے واقف کر دینا نہایت ضروری ہے، باپ کو چاہئے کہ بچہ کو سعی و کوشش کے لئے ابھارے، ایک ایسے معیار کے لئے جد و جہد کرنے کی ترغیب دے جو گو اصل میں تو باپ کا ہے، تاہم بچہ کے لئے ضروری ہے، کہ اُسے اپنا سمجھ کر قبول کرے، اگر اور جب بچہ اپنے اندر اس معیار کے مطابق عمل کرنے کی اہلیت محسوس کرتا ہے، اور اس سے بڑھ کر، اگر

اور جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کا باپ اُس کو اِس معیار کے مطابق عمل کرنے کا اہل سمجھتا ہے، تو اُسے احساس ہوتا ہے، کہ اس کی قدر پہچان لی گئی، اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے،

ماں سے بچہ خود اعتمادی حاصل کرتا ہے، اور باپ سے اعتماد علی النفس، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس بچہ کے کارنامے شروع بچپن میں تسلیم نہیں کئے جاتے وہ بعد میں اس ابتدائی نقصان کی تلافی نہیں کر سکتا، وہ اپنے ناکام و نامراد ہونے کے احساس کیساتھ بڑھتا ہے، اور آیندہ زندگی کی کوئی کامیابی اس ذہنی کیفیت کو بدل نہیں سکتی، ایسے بعض بچے دراصل ناکام رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کو ناکام خیال کرتے ہیں، اور بعض اپنی کامیابی کا لطف اٹھانے سے معذور رہتے ہیں، خواہ وہ کامیابی کتنی ہی بڑی ہو، کیونکہ ان پر ہمیشہ کسی نہ کسی آفت کا خطرہ طاری رہتا ہے، غالباً ان بُرے نتائج کے اصلی سبب کا سراغ باپ کی صرف ایک غلطی میں پایا جا سکتا ہے، یعنی حد سے زیادہ دوری، حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں، پس اگر وہ گھر پر ہمیشہ تھکا ہوا اور سوچ اور فکر میں غرق رہتا ہے، تو اس کے اور بچہ کے درمیان صحیح تعلق قائم نہ ہوگا، اس کا بچہ اُسے باپ سے زیادہ خاندان کا پرورش کرنے والا سمجھے گا، اور خاندان کی پرورش کا بار اور زندگی کی سختیاں بچہ کی نظر میں حد سے زیادہ اہم دکھائی دیں گی، اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اگر باپ اخلاقی حیثیت سے بچہ سے بہت دور ہے، اور ایسے بلند معیار قائم کرتا ہے، جن تک بچہ کی رسائی ناممکن ہے تو یہ چیز احترام و اقتدار کے شعور کا تو باعث ہوتی ہے لیکن بے تکلفی کو بے لطف کر دیتی ہے، اور اُبھارنے اور ترقی دینے کے بجائے بچہ کی ہمت کو پست اور اس کے حوصلوں کو افسردہ کر دیتی ہے،

(۴)

ان چند باتوں سے ناظرین پر گھر کی فضا کا تخیل واضح ہوا ہوگا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

مناسب اور نامناسب ماحول کا ردعمل بچوں پر کیا ہوتا ہے، بچہ یا والدین ہونا کوئی آسان بات نہیں بچوں
کی تربیت کا مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہے، اس کی پیچیدگیاں ایسی ہیں، کہ ان پر نہ والدین آسانی سے قابو
پا سکتے ہیں، اور نہ بچے خوش قسمتی سے بچوں میں ہر قسم کے اثرات کی مقاومت کی قوت بہت ہی
سخت ہوتی ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے، کہ ان میں اچھے اثرات کے قبول کرنے کی صلاحیت نسبتہ
زیادہ ہوتی ہے، ان میں خوش رہنے کا مادہ حد سے زیادہ ہوتا ہے، جس کو زائل کرنا محال ہے،
بہت ہی ناخوشگوار حالات میں بھی بچے خوش رہ سکتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رنج بالغوں
ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اور بلوغ کی منجملہ اور نشانیوں کے ایک نشانی یہ بھی ہے، ہاں
ایک بچہ مغموم، رنجیدہ، اور کسی چیز سے خوفزدہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے رنج وغم کی سطح کے قریب
ہی مسرت اور محبت کی لہریں برابر اٹھتی رہتی ہیں، مگر ہم میں بعض بدقسمت لوگ ایسے ہیں جو ان
مسرور بچوں کو سن بلوغ تک پہونچتے پہونچتے خواہ مخواہ مغموم بنا دیتے ہیں، میرے سامنے اس وقت
دو بچوں کی مثالیں ہیں، ایک پندرہ سال کا لڑکا ہمیشہ چیختا چلاتا، اور گایا کرتا تھا جس سے اس
کے اسکول اور گھر کے لوگ پریشان رہتے تھے، اس نے مجھ سے کہا "مجھ میں خوشی کی ابلتی ہوئی قوت
بھری ہے، جس کو میں اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں"، ایک دوسرا لڑکا سولہ سال کا تھا جو ہر قسم
کی مشکلوں میں گھرا رہتا تھا، وہ اپنی زندگی سے عاجز تھا، وہ جو کام کرتا راس نہیں آتا تھا پھر بھی وہ
خوش رہتا تھا، ایک روز اس نے مجھ سے کہا "میں اکثر سوچتا ہوں کہ مسرت کا جذبہ میرے لئے کس
قدر ناموزون ہے"، لیکن مسرت تو خدا کا عطیہ ہے، یہ کوئی انسان کی حاصل کی ہوئی چیز تو نہیں، ہمارا
فرض صرف اس کو برقرار اور قائم رکھنا ہے، اس کے لئے صرف اس بات کی ضرورت ہے
کہ ہم لڑکوں کو مصیبتوں، مشکلوں اور خطروں سے محفوظ رکھیں، کیونکہ یہی چیزیں ہیں، جو ان کی
اصلی مسرتوں کو برباد کر کے ان سے اصلی اعتماد کو زائل اور ان کی محبت کو نفرت میں تبدیل کر دیتی ہیں

بچّون کے گوناگون مصائب اور مشکلات کے مسئلے تین حصّوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ان کی

(۱) اجتماعی زندگی کا مسئلہ (۲) ضبط و نظم کا مسئلہ، (۳) کام کا مسئلہ،

اجتماعی زندگی کے مسئلہ سے میرا مطلب یہ ہے، کہ ایک بچہ کو دوسرے سے ملنے اور اپنی صحبت کے صحیح انتخاب کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یا تو وہ الگ تھلگ اور بالکل تنہا ہو جاتا ہے یا بچّون سے ملنا چاہتا ہے، لیکن نہیں مل سکتا ہی، ان دونون مشکلوں کے اسباب ظاہر ہین، بچہ جب پہلی دفعہ اجتماعی زندگی یعنی اپنے خاندان والوں کی صحبت میں داخل ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ کوئی ایسا غلط رویہ اختیار کر لیا جاتا ہے جس سے اس کو احساس ہوتا ہے کہ وہ خاندان کی اجتماعی زندگی میں مساویانہ اور یکسان حیثیت نہیں رکھتا ہے، لامحالہ وہ اپنی دنیا میں چلا جاتا ہے، جہان وہ اپنے کو تنہا پاتا ہی نہیں تو پھر وہ اسی کوشش میں رہتا ہے، کہ کسی صورت سے وہ گھر کی بہشت ممنوعہ میں پہونچ جائے، اس کے اثرات اکثر بہت ہی خراب مترتب ہوتے ہیں، اس قسم کے دو لڑکوں کی مثالیں میرے سامنے ہیں، ایک نے چوری، دوسرے نے اپنے گھر کی چیزوں کو فروخت کر کے اپنے رفقاء اور اساتذہ کو تحائف دینے شروع کئے، ان دونوں کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ گھر میں نہ سہی تو باہر اس تدبیر سے انکے دوست آسانی سے پیدا ہو جائیں گے،

انضباط کا سوال ذرا اہم ہے، منضبط ہونے کے معنی یہ ہیں، کہ ہم کو یہ احساس ہو کہ ہماری داخلی ضرورتوں سے بالا کچھ خارجی قوانین ایسے ہیں جن کے مطابق ہم کو بننا ضروری ہے، اس ناخوشگوار اور تکلیف دہ حقیقت کا احساس بچّوں کو ڈھائی برس کی عمر ہی میں ہو جاتا ہی، اس سن میں بچہ اپنی اور اپنے ماحول کی خواہش میں تصادم پاتا ہے، اس تصادم سے اس میں ضد پیدا ہو جاتی ہے، یہ ضد کا پہلا دور ہوتا ہے، یہ دور بالکل فطری ہے، جو ہر بچہ میں پایا جاتا ہے، اگر اس مشکل دور کو والدین دانشمندانہ اور ہمدردانہ طریقہ پر گذارے جائیں، تو چھ مہینے میں بچہ کی صحبت پذیری غیر شعوری سے شعوری میں تبدیل

ہو جاتی ہے لیکن والدین بچہ کی فطری کیفیات سے ناواقف ہو کر اس کی ضد سے جنگ کریں گے، اور اسکی طبیعت کے مدارج کو مکمل نہ ہونے دیں گے، تو پھر اس میں ناقابل علاج ضد پیدا ہو جائے گی۔

میں بہت کم ایسے بچوں سے ملا ہوں، جو انضباط کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوں لیکن شاید ہی کوئی اس کا تطابق اپنی عملی زندگی سے کرتا ہو، کسی چیز کو سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہو جب تک اس کے ساتھ "اندرونی ذاتی تجربے" وابستہ نہ ہوں، بچے جانتے ہیں کہ ان کو کیا کرنا ہے، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کریں لیکن اندرونی طور پر کوئی "چیز" ان کو کرنے سے روکتی ہے، یہ کوئی چیز وہ خیال ہی جو انضباط اور تحکم کے ذریعہ سے برباد ہو گیا ہو، ان میں بعض بچے تو ایسے ہوتے ہیں جن کی تربیت غیر منظم اور غیر منضبط گھر میں ہوتی ہے، اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے ضرورت سے زیادہ منضبط ماحول میں تربیت پائی ہے، دونوں نتائج کے لحاظ سے بچوں کے لئے مہلک ہیں خودروئی کی محرومیت سے زندگی کی اصلی آب جاتی رہتی ہے، بچوں کی طبیعت کے نشو ونما کے سلسلہ میں بعض نتائج بہت ہی تعجب انگیز واقع ہوتے ہیں، میں ایک ایسے خاندان سے واقف ہوں جس کا سرپرست ایک نہایت عمدہ انسان تھا، اس کو غیر معمولی تجربے حاصل تھے علمیت اور صلاحیت بھی تھی، مہربان اور رحمدل بھی تھا، اور خود اعتمادی کی قوت بھی بہت زیادہ تھی لیکن اس کی فوق الانسانی خوبیاں اس کے لڑکوں کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئیں، وہ اپنے لڑکوں کو اپنی ہی قابلیت کا نمونہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن یہ لڑکے اسکی خواہش اور تربیت کے مطابق نہ ہو سکے، بلکہ ہر ایک نے اپنی راہیں علحدہ اختیار کیں ایک بہت ہی ضدی ہو گیا، دوسرا اشترا کی تخیل سے متاثر ہو گیا، اور تیسرا ہر فن مولا ہو گیا،

ضرورت سے زیادہ اور کم انضباط کے علاوہ ایک اور قابل غور اور اہم چیز ہے، عام طور سے والدین نادری حکم اور تحکم، استبداد اور انضباط میں فرق نہیں کرتے، اس سے زیادہ یہ کہ وہ بچوں کے لئے جو کیل معیار بناتے ہیں، اس پر ہر وقت قائم نہیں رہتے، جس سے بچوں میں بددلی اور ناانصافی کا جذبہ پیدا

ہوتا ہے، کیونکہ بچوں میں فطری طور پر عدل و انصاف کا جذبہ موجود رہتا ہے، یہ تو انسانی طبیعت کی نہایت ضروری شے ہے، انصاف ہی کی قوت سے ایک بے بس اور کمزور بچہ جی سکتا ہے، اور اگر باپ جس کو بچے عدل و انصاف کا مجسمہ سمجھتے ہیں، اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، تو بچہ کی امیدوں پر پانی پڑ جاتا ہے، وہ اپنے باپ بلکہ دنیا سے اعتماد کھو بیٹھتا ہے، اور ایک نئی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے، اور یہیں سے اس میں اپنی پستی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے، اب وہ کسی تحکم کو فی نفسہ ناپسند نہیں کرتا، بلکہ تحکم کرنے والے کے حق تحکم کو مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے، باپ جب اپنے تحکم کے فرض کی ادائگی میں ناکام ثابت ہوتا ہے، تو بچہ پھر کسی اور کے تحکم کے سامنے سر خم کرنا مطلق پسند نہیں کرتا، اس طرح اس میں جنگ جوئی، اخفا پسندی، کج بحثی اور ضد کی ناخوشگوار عادتیں پڑ جاتی ہیں اور وہ متشکک، جھوٹا اور چرب زبان بن جاتا ہے، ان تمام خصوصیات کو مایوسی اور فقدان اعتماد کی نشانی اور کمزوروں کا طاقتوروں کے خلاف آلۂ جنگ سمجھنا چاہئے،

جہانتک کام کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ مذکورہ بالا دونوں مسائل سے زیادہ اہم نہیں کیونکہ ان کا انحصار ان ہی اسباب اور حالات پر ہے، جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ہر شخص کے لئے خواہ بچہ ہو یا جوان کام کرنے کے لئے کوئی سبب ہونا چاہئے، گو عمر کے ساتھ یہ سبب بھی بدلتا جاتا ہے، شروع میں ایک بچہ کسی کو خوش کرنے کے لئے کوئی کام کرتا ہے، "کسی کو" سے مطلب والدین ہی ہیں، اگر والدین اس کے کام سے خوش نہیں ہوتے، یا خوش نظر آنے کی کوشش نہیں کرتے تو اسکی دلچسپی کام سے جاتی رہتی ہے، اور بعض جوان اور سن رسیدہ اشخاص تو تمام عمر "کسی کو" خوش رکھنے کے لئے کام کرتے رہتے ہیں، ان کے "کسی کو" سے مراد ان کے بچے ہوتے ہیں، اس طرح ایک دائرہ ہے، جو خود بخود مکمل ہوتا رہتا ہے

اس کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے، جب بچے وہ کام کرتے ہیں جو ان کو کرنا پڑتا ہے، اس کام کو

ہم فرض" سے منسوب نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ زیادہ شعوری اور جبری نہیں ہوتا، بلکہ اس دور میں ان کے دماغ کے رجحانات ایسے ہوتے ہیں، کہ وہ اپنے اور ماحول میں اپنی فاعلیت اور انفعالیت میں اپنی ضرورتوں اور پابندیوں میں بالکل ہم آہنگی پاتے ہیں لیکن جب وہ سولہ برس کے ہوجاتے ہیں، تو یہ توازن باقی نہیں رہتا، بلکہ ان کے عنفوان شباب کیساتھ ان میں ایک نئی قسم کی ذہنیت پیدا ہوجاتی ہے وہ ہر چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں، ہر چیز کے اسباب جاننا چاہتے ہیں، اور اسی زمانہ میں ان کے سامنے زندگی کے مقصد کا سوال بھی پیدا ہوجاتا ہے،

اب اگر انکے کاموں پر خوشی کا اظہار کرکے ان کی کوششوں کی تعریف نہیں کی جاتی، ان کو کام کرنے کا احساس نہیں دلایا جاتا، اور ان کو ان کی زندگی کا مقصد نہیں بتایا جاتا، تو ایسے لڑکے اسکول میں عموماً ناکام رہتے ہیں۔ ان کی ناکامی کے اسباب یہ نہیں ہوتے، کہ ان میں کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، بلکہ یہ سبب ہوتا ہے کہ کام کرنے کے لئے مندرجہ بالا اسباب میں سے کوئی سبب بھی ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ کام کی خرابی، دلچسپی یا توجہ کا فقدان، جسم یا ذہن کی گندگی، اسکول کے کاموں میں غفلت یہ سب ان ہی اسباب کے فقدان کے نتائج ہیں،

سب سے اہم مسئلہ زندگی کے مقصد کا تعین ہے، کوئی مقصد اصلی اور حقیقی نہیں ہوسکتا، اگر وہ بیرونی طریقہ سے متعین کر دیا گیا ہو، مثلاً کوئی طالب علم جغرافیہ محض اس لئے پڑھے کہ اس کے کسی استاد نے پڑھنے کا حکم دیا ہے، کوئی شخص اپنے ملک سے محبت اس لئے کرے کہ ملک کے آمر نے حکم دیا ہے کوئی تجارت اس لئے کرے کہ اس کے باپ کی یہی خواہش ہے، کوئی دولت اس لئے جمع کرے کہ اس کو جمع کرنا ہے، تو یہ زندگی کے مقاصد نہیں کہے جا سکتے، زندگی کا مقصد تو وہ ہے کہ جس کی تکمیل کے لئے اندرونی قوتیں خود بخود بروئے کار آئی ہوں، اور یہ معجز نما قوتیں اسی وقت پیدا ہوسکتی ہیں، جب کہ وہ فطرت کی ذی روح اور غیر ذی روح چیزوں کی عظمت، عزت، اور قدر کرنا سکھیں

ہم ایک انسان کی عظمت اس سے محبت کرکے، ایک صنعتی چیز کی قدر اس کو استعمال میں لا کے اپنی عزت اپنے میں فطرت کی ودیعت کی ہوئی قوتوں کی تکمیل کرکے کر سکتے ہیں یہی عزت و عظمت کا جذبہ ہم میں زندگی بخشتا ہے، زندگی کو ولولوں سے معمور کر دیتا ہے مختلف قسم کی دلچسپیاں فراہم کرتا ہے اور مستقبل کی تاریکی کو روشن بنا دیتا ہے، اور یہی زندگی کا اصلی مقصد بھی عطا کرتا ہے،

تعلیم کی اصلی غایت یہ ہے، کہ بچہ کو مندرجۂ بالا مقصدِ زندگی بتایا جائے، اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے، کہ یہ محض فلسفیانہ خیالات ہیں، جن کے متحمل بچے نہیں ہو سکتے، لیکن یہ صحیح نہیں میں اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ سولہ سال کے بعد بچے نہ صرف ان خیالات کو سمجھنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ ان کو اس طرح سنتے اور ان پر غور کرتے ہیں کہ گویا وہ ان کے بہت دنوں سے منتظر تھے عزت و عظمت کرنا سکھایا نہیں جاتا، بلکہ خود بخود تجربہ سے سیکھا جا سکتا ہے، اور یہ عزت و عظمت کا تجربہ گھر کے سوا کہیں اور حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ والدین ہی اوّل اور آخر نظری اور عملی عظمت کے مالک ہوتے ہیں، یہ تعلیمی نفسیات کا اصول ہے، کہ جو بچے اپنے والدین کی عزت اور قدر و منزلت کرنا نہ سیکھ سکیں، تو وہ ایسی دنیا میں بھٹکتے پھریں گے جس کی تاریکی میں اپنے آپ اور بنی نوع انسان تک پہنچنے میں کوئی روشنی نہیں مل سکے گی،

"ص، ع"

سیرۃ النبی حصّہ پنجم تقطیع خرد

اسمیں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، بڑی تقطیع پر حسب دستور ۱۳۵۴ھ میں چھپی تھی، اسی وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ اسکی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، بحمد اللہ کہ اب وہ چھپ کر تیار ہو گئی ہے، حجم ۴۹۰ صفحے قیمت باختلاف کاغذ ۵ روپیہ،

"منیجر"

اخبارِ علمیہ

سائنس کی بے حقیقتی

ڈاکٹر سر شاہ سلیمان نے شملہ میں ایک لکچر دیتے ہوئے کہا، کہ

سائنس کے تمام نظریے محض قیاسات ہیں، انسان صرف قیاس ہی کر سکتا ہے، وہ بھی شروع میں لازمی طور سے غلط اور بالکل نامکمل، اس کو وسیع تجربوں سے اپنی غلطیاں معلوم ہوتی رہتی ہیں، لیکن غلطیاں معلوم ہونے کے بعد وہ ایک قیاس کو چھوڑ کر دوسرا قیاس کر لیتا ہے، اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہیگا، کیونکہ فطرت کے حقائق اس کے دسترس سے باہر ہین،

سائنس کے نظریون کی غیر اصلیت اس وقت واضح ہو جاتی ہے، جب ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک برقیہ (Electron) کا نصف قطر سینٹی میٹر کا ......$\frac{1}{٥}$ ہے، اور وہ اپنے مرکز کے گرد ایک سکنڈ میں کئی کھرب دفعہ گھوم رہا ہے، اگر اس کا رقبہ واقعی ایسا دقیق ہے، تو اسکی ہیئت اور ساخت کو معلوم کرنا ناممکن ہے! انسان کی بصارت بہت ہی محدود ہے، اور کیا معلوم کہ اس سے بھی چھوٹی دنیا کہین اور نہ ہو، جس سے انسان شاید کبھی واقف نہ ہو،

آفتاب کئی لاکھ گنا زمین سے بڑا ہے، لیکن یہ کائنات کے غیر محدود سمندر مین ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور ....۰۰ستارے ایسے ہین، جو آفتاب کے برابر ہین جن کو کہکشان گھیرے ہوئے ہے، کہکشان کا قطر اتنا بڑا ہے کہ اس کی روشنی اگر ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کی

رفتار سے چلے، تب کہیں ایک سمت سے دوسری سمت تک ۲۲۲۰۰۰ سال میں پہونچے گی، اور اس کہکشان سے ماورا لاکھوں اور کہکشاں ہیں، جو ۱۰۰ انچ والی دوربین سے معلوم ہوتی ہیں، اور اگر ۲۰۰ انچ کی دوربین سے دیکھی جائیں گی، تو اسکی روشنی آنکھوں کی روشنی سے لاکھوں گنا زیادہ معلوم ہوگی، پھر بھی کائنات کے متعلق معلومات تشنہ اور غیر یقینی رہینگی، ہمارے تخیلات ناقص، نامکمل اور ادھورے، اور ہمارے نظریے محض قیاسات رہیں گے، ہمارے خیالات بہت دور تک پہونچ سکتے ہیں لیکن ہمارے مشاہدات ان کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس لئے سائنس کی تحقیقات ہر زمانہ مین غیر اصلی رہیں گی،

سائنس کی معلومات ہمیشہ غیر اصلی اور غیر حقیقی چیزوں سے وابستہ رہی ہین، آئنسٹین کے نظریہ کے مطابق فضا محدود ہے، اور انسانی ذہن مین آسکتی ہے، اس نے فضا کے نصف قطر کا حساب بھی لگایا ہے لیکن یہ انسان کا محض بے باکانہ تخیل ہے کہ وہ کائنات کی لمبائی اور چوڑائی کا حساب لگانے کی کوشش کرے، کائنات کی حد مقرر کرنا محض تخیل کا اختراع ہوگا جس میں کچھ اصلیت نہ ہوگی، سائنس کے نظریے ہر قسم کے اور ہر حد تک قائم کئے جا سکتے ہین، ایڈنگٹن نے تو کائنات کے برقیہ کی کل تعداد بھی مقرر کر دی ہے لیکن کیا اس تعداد پر یقین اور سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے؟

دراصل فضا اور وقت دو آزاد چیزین نہیں ہین، بلکہ دونوں ایک ہی میں ملا دی گئی ہین جس میں چار ابعاد (Dimensions) ہیں لیکن وقت فضا کا ساتھ نہیں دیسکتا، اس لئے اس کو ایک خیالی اور حقیقی واحدہ قرار دیا گیا ہے، اور ان دونوں کی آمیزش سے ایک نئی ماورا فضا قائم ہوگئی ہے،

اضافیت کے نظریہ کے مطابق فضا مین کوئی مادی واسطہ یا ایتھر نہیں، پھر بھی یہ اس کے ساتھ ایک مخصوص عرض مثلاً انحنا (Curvature) وابستہ کرتا ہے، چنانچہ اس لحاظ سے فضا محض خلا نہیں بلکہ اس میں کچھ خاصے ہین، اور نئی قسم کی فضا محدود ہے، اس میں انحنا پیدا ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ ایک محدود دائرہ بن جاتا ہے، اسمیں لکیرین سیدھی نہیں جاتی ہین، بلکہ ٹیڑھی ہو جاتی ہین، اور جھکتے

جھکتے وہیں پہونچ جاتی ہیں، جہاں سے چلی تھیں لیکن یہ خیالی حساب یہ نہیں بتاتا ہے کہ یہ خیالی انحنا مثبت ہے یا منفی، اضافیت کے ماہرین اس پر ابھی تک متفق نہیں ہوئے ہیں، پھر اگر یہ ایک محدود دائرہ ہے تو اس سے ماورار کیا ہے؟

اضافیت کے نظریہ کے مطابق فضا غیر معمولی سرعت کیساتھ پھیلتی جارہی ہے، دراصل یہ وسعت کائنات میں پیدا ہو رہی ہے، ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ یہ فضا کس میں پھیلتی ہے، اگر غیر فضا میں پھیلتی ہے، تو یہ بھی فضا ہی ہے لیکن ماہرین اضافیت کا خیال ہے کہ یہ کسی پانچویں بُعد میں پھیل رہی ہے مگر یہ تو محض ریاضی کا مغالطہ ہے جس میں نہ کوئی طبیعاتی معنی ہیں، اور نہ کوئی حقیقت ہے، بلکہ فطرت کو غلط سمجھنے کی دلیل ہے،

روشنی سے متعلق جتنے نظریے قائم کئے گئے ہیں، وہ اور بھی پر اسرار ہیں، اڈنگٹن نے اقرار کیا ہے کہ طبیعات کے موجودہ اساسی تخیلات بالکل غلط ہیں، اس کو یہ بھی اعتراف ہے، کہ وہ ان غلط تخیلات کو صحیح بھی نہیں کر سکتا ہے، موجودہ تخیل کے مطابق روشنی مادہ اور واسطہ سے بالکل آزاد ہے، تو پھر فضا میں روشنی کی لہروں کا پھیلنا ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے، روشنی کی لہروں کے ماہرین نے اس تخیل کو بہتر بنانے کی ضرور کوشش کی ہے لیکن روشنی کی ہیئت کا کوئی طبیعاتی تخیل وہ پیش نہیں کرتے وہ تو ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں، انھوں نے مادہ کی بالکل تخریب کر دی ہے، برقیہ کو لہروں کی ایک قطار سمجھتے ہیں، جو ایک لامتناہیت سے دوسری لامتناہیت تک پھیلا ہوا ہے، اسکی رفتار تو معلوم ہے لیکن اس کی جگہ غیر معلوم ہی، لیکن اگر کوئی اس کو روشنی کی مدد سے دیکھنا چاہے تو یہ لامتناہی قطار نقطۂ صفر میں آکر سمٹ جاتی ہی، ایسی حالت میں جگہ تو معلوم ہو جاتی ہی لیکن رفتار غیر معین ہو جاتی ہی، یہ لہروں کی ایک جماعت ہوتی ہے، جو ہمیشہ آگے بڑھتی شکل بدلتی اور پھیلتی رہتی ہے، یہانتک کہ یہ نقطۂ صفر پر سمٹ جاتی ہی، اس وقت اسکو دیکھنے کی کوشش بھی کیجا سکتی ہے،

کہاجاتا ہے کہ روشنی یا برقیہ کی لہر جو ایک دور دراز ستارے سے چلتی ہے، زمین تک پہونچتے پہونچتے ناقابلِ پیمایش ابعاد میں پھیل جاتی ہے، جب تک یہ کسی چیز سے مس نہیں کرتی ہے، وہ پھیلتی جاتی ہے اور اگر کسی ذرہ سے یہ مس کرگئی تو یہ لامتناہی قطار پھر مجتمع ہوکر نقطۂ صفر میں سمٹ جاتی ہے تاکہ ذرہ میں داخل ہو سکے، لیکن اس قسم کا تخیل مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، یہ صرف روشنی اور مادہ کی علامتی تعبیریں ہیں،

سائنس کے جدید نظریوں میں مادّہ غیر اصلی چیزیں، محسوسات غیر محسوسات میں، حقیقت غیر حقیقت میں محض تبدیل ہوکر رہ گئی ہے، مادّہ ایک لامتناہی لہروں کی جماعت سمجھا جاتا ہے، جو لامتناہی طور پر پھیلتا جاتا ہے، اور جب کسی مادہ سے ملتا ہے، تو سمٹ کر ایک نقطہ پر آجاتا ہے، یہ لہریں قوت (. ψ g ε m ε) کی لہریں نہیں ہیں، لیکن ان کو ریاضی اور سائنس کی اصطلاح میں مختلف ناموں سے منسوب کرتے ہیں، بات یہ ہے، کہ وہ کوئی حقیقی لہریں نہیں، بلکہ وہ خیالی مصنوعی اور علامتی لہریں ہیں، اسی لئے مادّہ بھی ایک خیالی لہر کی تصویر ہے، جن کو ریاضی کے نشانات میں ظاہر کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، ان کا تصور ذہن میں نہیں آسکتا، اور چونکہ یہ محض خیالی ہیں، اس لئے فضار اور وقت میں ان کی جگہ بھی متعین نہیں کیجاسکتی ہے، اسی طرح موجودہ سائنس کائنات کی ہر چیز کی ایک خیالی تصویر پیش کررہا ہے، جس کا دیکھنا توکیا ذہن میں تصور قائم کرنا بھی ناممکن ہے،

"ص ع"

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

گذشتہ مہینے جگہ کی کمی کے سبب سے بہت سے رسائل اور اخبارات پر ریویو رہ گیا تھا، وہ اس مہینہ میں کیا جاتا ہے،

ہمدرد صحت دق وسل نمبر — مرتبہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ ہمدرد منزل دہلی،

دہلی کا مشہور طبی رسالہ "ہمدرد صحت" عالمگیر مہلک امراض پر نہایت مفید خاص نمبر نکالتا ہے جن میں ان امراض کے جملہ متعلقات، پر نہایت مبسوط اور محققانہ مضامین ہوتے ہیں، اس سے پہلے انہی خصوصیات کے ساتھ عورت نمبر نکال چکا ہے، اب اس نے دق وسل پر یہ خاص نمبر نکالا ہے، یہ نمبر اس موضوع پر اردو میں معلومات کا بہترین ذخیرہ ہے، اس میں دق وسل کی ماہیت، اس کے اقسام، مختلف اعضاء کی دق، مرض کے مراحل، تدابیر حفظ ما تقدم، اسکی تشخیص کے طریقوں، علاج و مجربات وغیرہ دق کے مرض اور علاج کے جملہ پہلوؤں پر ویدک، یونانی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، طب آبی، طب کونی وغیرہ مختلف طبوں کے ہندوستان اور بیرون ہند کے ماہر اور نامور اطبا کے مبسوط و محققانہ مضامین ہیں، اور دنیا کے مختلف ملکوں، قوموں اور نسلوں میں دق کی رفتار، ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ میں اس کے انسداد کی کوششوں، اس کے نتائج ان کی صحت گاہوں اور صحت و موت کے نقشوں کی تفصیلات ہیں، یہ اس نمبر کا سرسری خاکہ ہے، دق

اور سل کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس پر اس نمبر میں طبی اور بین الاقوامی حیثیت سے نگاہ ڈالی گئی ہو، تشخیص مرض سے متعلق چند فوٹو، اور دق سے متعلق چند افسانے بھی ہیں، اردو زبان میں اس موضوع پر معلومات کا اس سے بہتر مجموعہ نہیں مل سکتا، ہر طب کے اطبا کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے،

عالمگیر خاص نمبر، مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نے حسب معمول سنجیدہ مضامین دلچسپ افسانوں اور ستھری نظموں کا یہ ضخیم خاص نمبر نکالا ہے، ادب اور افسانے کے ساتھ متعدد علمی مضامین بھی ہیں، ان میں مولینا محمد امین صاحب عباسی چریاکوٹی کا "ناتمام مضمون" ہندی اور عربی کے ہم معنی اشعار" کامل رزاقی صاحب کا "نظامی عروضی" ماسٹر محمد تحسین صاحب کا "وسط ایشیا" اچھے، اور مفید مضامین ہیں، افسانوں میں آسی صاحب رام نگری کا افسانہ "بچا" بہت خوب ہے، اور بہت سے دلچسپ افسانے ہیں، عموماً خاص نمبروں میں مفید علمی مضامین کم ہوتے ہیں، اور اگر ہوتے بھی ہیں تو ان میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی، اگر مدیر صاحبان اس نظر سے مضامین کو دیکھ لیا کریں کہ ان میں کوئی جدت و اضافہ ہے، یا محض پرانی باتیں طرز بدل کر دہرادی گئی ہیں، تو رسالے بڑی حد تک حشو و زوائد سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ عالمگیر کا یہ نمبر بھی اس نقص سے خالی نہیں ہے، پھر بھی بہت غنیمت ہے، کچھ مضامین تو مفید نظر آتے ہیں، ورنہ عموماً وہی سیکڑوں مرتبہ کی لکھی ہوئی باتیں الفاظ اور طرز بدل کر دہرائی جاتی ہیں،

شاہکار جدید اردو شاعری نمبر | مرتبہ جناب حکیم عارف بلگرامی تقطیع اوسط ضخامت ۴۰۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۲، پتہ دفتر شاہکار گورکھپور،

رسالہ شاہکار نے جدید اردو شاعری پر یہ کامیاب اور مفید نمبر نکالا ہے، یہ نمبر تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں تاریخ ادب میں اردو شاعری کی مختصر تاریخ ہر دور کے اساتذہ کے کلام کی خصوصیات جدید دور کے

مشہور ناظمین، متغزلین، اور شاعر خواتین کے بقدر تعارف حالات ان کے کلام پر مختصر تبصرہ اور نمونہ کلام ہے، دوسرے حصہ "تنقیدی مقالات" میں موجودہ دور کے بعض مشہور شعرا اقبال، ریاض، جگر، سیماب اور جوش کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس حصہ میں اقبال کی فلسفیانہ منزلت" اور "کلام جگر" اچھے مضامین ہیں لیکن ان شعرار کے ساتھ، خرم انصاری کا کیا جوڑ تھا، یہ صحیح ہے کہ وہ ہونہار شاعر ہیں، اور ان کے کلام میں ترقی کے آثار نمایاں ہیں لیکن شادانی صاحب کا مضمون بہت مبالغہ آمیز ہے، ایسی شرح وتفسیر سے تو ہر رائی کو پہاڑ بنایا جاسکتا ہے، ایک طرف تو شادانی صاحب کے معیار کی بلندی کا یہ حال ہے کہ موجودہ دور کا کوئی ایسا بڑا شاعر نہیں ہے، جس کے کلام پر انھوں نے مضحک تنقید نہ کی ہو، دوسری طرف ایک نوخیز شاعر کو الہامی بنائے دیتے ہیں، تیسرے حصہ "تعمیری امکانات" میں فراق گورکھپوری کا مضمون "غزل اور نظم پر پریشان خیالات بہت اچھا ہے، "اردو شاعری کا مستقبل" بھی بعض پہلوؤں سے مفید مضمون ہے لیکن تغزل سے بیزاری کی کورانہ تقلید اس میں بھی ہے، یہ نیا انکشاف ہے، کہ غالب کمال فن اور مشق سخن کی بنا پر بڑے شاعر نہ تھے، بلکہ اس لئے بڑے ہو گئے کہ سوسائٹی میں ان کا درجہ بڑا تھا، اور حسرت موہانی محض اپنی لیڈری کی وجہ سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں" یہ تحقیق حسن مذاق کی کتنی اچھی مثال ہے، یہ جدت پسندی کی عجیب قسم ہے کہ خوش پوش بنگلوں" کا حسن دکھانے کے لئے "تاج محل" کی مذمت ضروری سمجھی جاتی ہے، بہرحال اس نمبر میں جدید اردو شاعری اور اسکے آیندہ رجحانات کے متعلق کافی معلومات ہیں،

نیرنگ خیال افغانستان نمبر، مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۳۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸ر پتہ دفتر نیرنگ خیال بیڈن روڈ لاہور،

نیرنگِ خیال نے اسلامی حکومتوں پر ایک ایک خاص نمبر نکالنے کا اچھا اور مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے عام لوگوں کو اسلامی حکومتوں کے ضروری حالات سے سرسری واقفیت ہو جاتی ہے

یہ نمبر افغانستان پر ہے، اس میں افغانستان کی موجودہ حکومت کی ترقیوں کے حالات ہیں امان اللہ خان کی حکومت کا زوال، موجودہ حکومت کا قیام اسکی سیاسی علمی تعلیمی اقتصادی اور مختلف تمدنی ترقیاں، ارکان وعمائد سلطنت کے حالات ان کے کارنامے، افغانستان کا مختصر جغرافیہ، اسکی پرانی سیاسی تاریخ مختلف حکومتوں کے ساتھ اس کے تعلقات اور معاہدے، افغانستان اور ہندوستان کا تعلق وغیرہ افغانستان سے متعلق اور بہت سے معلومات ہیں لیکن "رسالۂ کابل" کے خاص نمبروں کو سامنے رکھکر اس سے زیادہ کامیاب نمبر نکالا جاسکتا تھا،

مصر نمبر تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۵ر

یہ نمبر مصر کے حالات میں ہے، اس میں مصر کا مختصر جغرافیہ طبعی حالات، عہد فراعنہ اور قدیم اسلامی دوروں اور حکومتوں کی بقدر تعارف تاریخ اور جدید دور کے کسی قدر تفصیلی حالات ہیں، جدید دور میں مصر کے سیاسی انقلابات، آزادی کی جدوجہد اس کے نتائج اور موجودہ حکومت کے اجمالی حالات ہیں، اکابر مصر کا مختصر تعارف بھی ہے، ضمناً یوں ہی سے کچھ علمی وتمدنی حالات بھی آگئے ہیں، مصر کے قدیم وجدید دونوں دوروں کے متعلق تنہا عربی میں اتنا کافی مواد موجود ہے کہ اسکی مدد سے مصر کی پوری تاریخ لکھی جاسکتی ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر بہت ناکافی ہے لیکن عام لوگوں کے لئے جنکو مصر کے حالات سے بالکل ناواقفیت ہے، بُرا نہیں ہے،

عصمت سالگرہ نمبر، مرتبہ جناب راز ق الخیری صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۰ر پتہ:- دفتر عصمت دہلی،

عورتوں کے مقبول عام رسالہ عصمت کی تیسویں سالگرہ کی تقریب میں راز ق الخیری صاحب نے یہ سالگرہ نمبر نکالا ہے، اس میں مختلف ذوق کے دلچسپ مضامین اور مفید معلومات ہیں لیکن رسالہ کے موضوع کے لحاظ سے نسوانی ضروریات کے مضامین نسبۃً کم ہیں ابتدا میں تیسویں سال کی مضمون نگار

خواتین کے مضامین پر تبصرہ ہے، اس سے ہماری خواتین کے ذوق اور انکی علمی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے، ڈاکٹر ممتاز حسین صاحب کا مضمون "بچے کی غذا" نسوانی ضروریات کے مضامین میں مفید مضمون ہے، انکی بلند "مکان کی آرایش" کی کم عورتوں کو ضرورت ہوگی، غریبانہ آرایش اور صفائی کی تعلیم ناظرات عصمت کے لئے غالباً زیادہ مفید ہوتی، لیکن کچھ خواتین کے لئے یہ بھی کام کی چیز ہے، صالحہ عابد حسین صاحبہ کا ڈرامہ "آنکھ کا ڈاکٹر" بہت خوب ہے، "کنجوس بھی" دلچسپ افسانہ ہے، نظم کے مضامین کے علاوہ متعدد ستھری نظمیں بھی ہیں، مجموعی حیثیت سے کامیاب نمبر ہے،

نئے رسالے

برہان مرتبہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی فاضل دیوبند، تقطیع بڑی، ضخامت ۲، صفحہ کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ صہ، پتہ ۱- قرول باغ دہلی،

موجودہ علمی مقتضیات اور ضروریات زمانہ کے مطابق مسلمانوں کی علمی اور مذہبی خدمت کیلئے ندوۃ المصنفین کے نام سے دہلی میں ممتاز علمائ نے ایک علمی مجلس قائم کی ہے، اس کے حالات اخبارات میں نکل چکے ہیں، اس مجلس کے اغراض ومقاصد موجودہ ضروریات کے لحاظ سے نہایت مفید اور بڑی حد تک دار المصنفین سے ملتے ہوئے ہیں، برہان اسی مجلس کا علمی رسالہ ہے، ابھی اس کا صرف پہلا نمبر نکلا ہے، اس میں "نظرات" کے زیر عنوان برہان کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے، غالباً آیندہ سے اس میں مسلمانوں کے مسائل حاضرہ پر بحث ہوا کرے گی "نظرات" کے بعد مضامین ہیں، لطائف ادبیہ میں منظومات ہوتے ہیں "شؤن علمیہ" میں علمی خبریں، لیکن اس مہینہ کے مندرجہ واقعات کو علمی خبروں سے تعلق نہیں معلوم ہوتا، "نقد ونظر" میں مطبوعات پر ریویو ہوگا، مقالات میں مولینا محمد ادریس صاحب میرٹھی نے "سحر وصابئیت" کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے، مولانا حامد الانصاری نے "ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے مستقبل پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے، پروفیسر یعقوب الرحمن صاحب

عثمانی نے "انسانیت کے لئے مذہب کی ضرورت" دکھائی ہے، یہ مضامین فائدہ سے خالی نہیں ہیں، خصوصاً مولانا حامد الانصاری کا مضمون اچھا ہے، لیکن مجلس کے مقاصد کے لحاظ سے مضامین کی نوعیت اور معیار دونوں کے بدلنے کی ضرورت ہے، یہ پہلا پرچہ ہے، اس کی ترتیب میں دشواریاں زیادہ رہی ہونگی، امید ہی کہ ابتدائی مشکلات کے دور ہونے کے بعد پرچہ مجلس کے معیار کے مطابق ہو جائیگا، اس رسالہ کے اجراء سے اچھے علمی رسائل میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے،

قائد مرتبہ مولینا سید اختر اسلام صاحب قاسمی تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت باختلاف کاغذ سالانہ ۸؎ اور ۶؎، ششماہی ۵؎ اور ۱۲؎ پتہ قائد مراد آباد دیوپی،

یہ مفید رسالہ چند مہینوں سے مراد آباد سے نکل رہا ہے، اس کا مقصد سیر طیبہ اور سیر صحابہ کی روشنی میں مسلمانوں کی مذہبی سیاسی اور اقتصادی اصلاح، قدیم وجدید قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے مسلمانوں کے جذبات ترقی کو بیدار کرنا، عربی خوان طلبہ میں عربی زبان کا ذوق پیدا کرنا، اور ہندستان اور حجاز کے درمیان صحافتی رابطہ کا قیام ہے" اگرچہ یہ مقاصد نہایت اہم ہیں لیکن خوش قسمتی سے رسالہ قائد کو صاحب علم ونظر اور حالات زمانہ سے واقف علماء کی سرپرستی اور ان کی قلمی امداد حاصل ہے اس لئے ان مقاصد میں کامیابی کی توقع کیجا سکتی ہے، اس رسالہ میں مسلمانوں کی دینی ضروریات اور دنیوی مصالح کو نہایت ہم آہنگی کے ساتھ سمویا گیا ہے، مفید مذہبی اور تاریخی مضامین کیساتھ سیاسی حالات خصوصاً مسلمانوں کی سیاست پر سنجیدہ تبصرہ، اور لائق غور مشورے ہوتے ہیں، سیرت نبوی، سیر صحابہ رض، ترجمہ ابن کثیر فقہی مسائل اور بہت سے مذہبی موضوعوں میں مفید اور مسلسل مضامین نکل رہے ہیں "اسلام اور آئین حکومت" "اقتصادیات مسلم" اور "فلسفہ ایمان" کا سلسلہ زیادہ مفید ہے، "رنات الطرب" کے عنوان کے تحت مولینا عبدالحق صاحب مدنی کا عربی مضمون "السیاسیہ فی الاسلام" مسلسل نکل رہا ہے، یہ سب کے سب مضامین مفید اور اچھے ہیں لیکن اس تنوع اور کثرت کیساتھ ہر مہینہ ان کی پابندی سے نہ مضامین

کا معیار قائم رہ سکتا ہی اور نہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ہر نمبر میں بکثرت ناقص مضامین شائع کرنے سے بہتر ہے، کہ وقتاً فوقتاً ان موضوعوں پر مضامین ہوا کریں،

طلوعِ اسلام مرتبہ جناب حکیم ذکی احمد صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ صر فی پرچہ ۸ر پتہ قرول باغ دہلی،

رسالہ"طلوع اسلام" کئی سال تک جناب نذیر نیازی صاحب کی ادارت میں نکلنے کے بعد بند ہو گیا تھا، اب وہ دوبارہ نئے انتظامات کے ساتھ حکیم ذکی احمد صاحب کی ادارت میں نکلا ہے، اب اسکا انتظام واہتمام ایک جماعت کے ہاتھ میں ہے، اس کا مقصد ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعیہ کی نقابت اور مسلمانوں کی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن پاک سے پیش کرنا، اور پیام اقبال کی اشاعت ہے، یہ دونوں مقاصد نہایت مبارک ومحمود ہیں، اور طلوع اسلام اپنے خاص نقطۂ نظر سے ان مقاصد کے تحت مسلمانوں کے دینی مسائل اور مختلف اسلامی موضوعوں پر علمی مضامین پیش کرتا ہے، لیکن جمہور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مذہب اور سیاست دونوں میں خصوصاً بعض مذہبی پہلوؤں میں اس کے خیالات ومعتقدات خالص جماعتی اور عام مسلمانوں کے مسلک سے بالکل علٰحدہ ہیں، اور بعض اصول تو بالکل ناقابل فہم اور بعید از قیاس ہیں، مثلاً فہم وتفسیر قرآن میں صحابہ کرامؓ کی روایات، عربی زبان، لغت اور قواعد سے نہ صرف بے نیازی، بلکہ اس عجیب وغریب ادعا کی بنیاد پر ان کی بے اعتمادی کہ"روایات صحابہ رضی اللہ عنہم ظنیہ اور غیر یقینی ہیں، لغات سماعی ہیں، ان کے جامع تمامتر عجمی تھے، زبان کے قواعد نزول قرآن کے مدتوں بعد مدون ہوئے" سمجھ میں نہیں آتا، کہ فہم قرآن کے ان تمام وسائل کی بے اعتباری کے بعد پھر قرآن سمجھنے کا ذریعہ اور کون رہ جاتا ہے" زید، عمرو وبکر کے اجتہادات ؟ نہ صرف قرآن اور عربی زبان بلکہ لغت اور قواعد زبان کو نظر انداز کر دینے کے بعد دنیا کی کونسی زبان سمجھی جا سکتی ہے "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" کی یہ تفسیر آجتک کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی، اس قسم کے بظاہر صحیح اور خوشنما اور بہ باطن

بے معنی دعوون کے متعلق حضرت علیؓ نے فرمایا تھا "کلمۃ حق ارید بھا الباطل" اسی اصول یا بے اصولی کا نتیجہ ہے، کہ قرآن کی آیات کے ترجمہ تک میں غلطیاں ہیں، اور ان سے استدلال تو اور غلط در غلط ہے، افسوس ہے کہ اس مختصر تبصرہ میں ان خود ساختہ اصولون پر تفصیلی تنقید کی گنجایش نہیں، کہ یہ بحث ایک مستقل مضمون کی طالب ہے، یہی حال طلوع اسلام کی سیاسی تعلیمات کا ہے، بیشک اسلام خود ایک مستقل قومیت ہے لیکن اسے اتنا محدود کر دینا کہ اسلام اور مسلمانون کے فائدہ کے لئے بھی غیر مسلمون کے ساتھ اشتراک عمل کی گنجایش باقی نہ رہے، نہ اسلامی نقطہ نظر سے صحیح ہے، اور نہ مسلمانوں کیلئے مفید، ان غلط اصولوں کو چھوڑ کر علمی حیثیت سے طلوع اسلام میں اچھے اور مفید مضامین بھی ہوتے ہین،

انقلاح مرتبہ مولوی منیر احمد صاحب نعمانی تقطیع اوسط ضخامت ۳۱ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۲ر پتہ انقلاح پلٹن بازار پرتاب گڈھ،

یہ مفید مذہبی اور اصلاحی رسالہ چند مہینوں سے نکل رہا ہے، عام مسلمانوں کی مذہبی واقفیت اور اصلاح کے لئے اچھا رسالہ ہے، مختلف مذہبی پہلوؤں پر عام فہم سادہ دلنشین اور موثر مضامین ہوتے ہیں، مئی اور جون کا مجموعی نمبر ہمارے سامنے ہے، قریب قریب سب مضامین مفید اور سبق آموز ہین، مولینا منظم علی صاحب کا مضمون "وحی نبوت" مولوی ادریس صاحب نگرامی کا "یاد رفتگان" اور مولوی نجم الحسن صاحب وکیل کے سادہ اور دلنشین مضامین خاص طور سے عام مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہیں، لیکن رسالہ کی ترتیب ابھی مزید توجہ کی محتاج ہے،

فردوس مرتبہ جناب حکیم حبیب اشعر صاحب دہلوی تقطیع اوسط ضخامت ۴۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اچھی قیمت سالانہ فی پرچہ ۲ر پتہ دفتر فردوس دہلی،

یہ رسالہ حال میں دہلی کے خوشگو شاعر حبیب اشعر صاحب کی ادارت مین نکلا ہے، بیشتر مضامین ادبی اور بعض اصلاحی اور تاریخی بھی ہوتے ہین، ابھی اسے اوسط معیار پر لانے کے لئے بھی کافی توجہ کی

ضرورت ہی حبل اللہ "اصلاحی نقطہ نظر سے اچھا افسانہ ہے لیکن زبان کی تلخی کے بغیر بھی اسے پیش کیا جا سکتا تھا، مولانا ابوالکلام کا مضمون "قصر حسنی" غالبًا ان کی طالب علمی کے زمانہ کا ہے، جسے کسی پرانے پرچہ سے بلا حوالہ نقل کر دیا گیا ہے،

ترجمان مرتبہ جناب سید معین الدین صاحب ایم اے تقطیع اوسط ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی قیمت سالانہ سے، پتہ انجمن اتحادیہ مہاجرین بخارا و ترکستان مرکزیہ دہلی،

روس کی اشتراکی حکومت کے مظالم سے تنگ آکر ترکستان کے لاکھوں مسلمان ترک وطن کرکے مختلف ملکوں میں بس گئے ہیں، ان کی ایک جماعت ہندوستان میں بھی آباد ہو گئی ہے، "انجمن اتحادیہ مہاجرین بخارا و ترکستان" کے نام سے دہلی میں انکی ایک انجمن ہے، رسالہ مذکور اسی کا ترجمان ہے، اپنی جماعت کی ترجمانی کے ساتھ اس میں مذہبی، اخلاقی اور اسلامی پہلوؤں پر معمولی درجہ کے مضامین ہوتے ہیں، اس کا امتیازی وصف ترکستان کے مسلمانوں کے حالات ہیں، اگر ان کے حصول کا کوئی معقول اور قابل وثوق ذریعہ ہو تو یہ مفید چیز ہوگی، اڈیٹر کے قلم سے "زندگی کا اسلامی تصور" اچھا مضمون ہے، اس لحاظ سے زبان کے اغلاط کی شکایت بے کار ہے، کہ یہ رسالہ غیر ہندوستانی جماعت کا ہے، لیکن اڈیٹر صاحب کی توجہ سے یہ خامی آسانی کے ساتھ دور ہو سکتی ہے،

سادات مرتبہ سید زاہد حسین صاحب کاظمی تقطیع اوسط ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۲ر، پتہ سادات دواخانہ جامع مسجد دہلی،

یہ رسالہ سادات دواخانہ کیجانب سے نکلا ہے، اصل میں طبی رسالہ ہے لیکن عام دلچسپی کیلئے طبی مضامین کیساتھ معمولی درجہ کے ادبی مضامین بھی ہوتے ہیں،

اخبارات

مسلم لیگ، مرتبہ جناب شاہ خلیل الرحمٰن صاحب بی اے تقطیع بڑی اخباری ضخامت

۱۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ صہ ششماہی سے، سہ ماہی ۱۲ فی پرچہ ۴ مرتبہ

مراد پور، بانکی پور، پٹنہ

یہ سہ روزہ اخبار پٹنہ سے نکلا ہے، اس کی پالیسی اسکے نام سے ظاہر ہے، بہار میں مسلم لیگ کا پروپیگنڈا لیگی مسلمانوں کی ترجمانی اور ان کے نقطۂ نظر سے وہاں کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اس کا مقصد ہے، صوبہ بہار میں مسلم لیگ کی رفتار اور اسکی تفصیلی خبریں ہوتی ہیں، اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے حکومت بہار اور وہاں کے سیاسی حالات پر نقد وتبصرہ بلکہ مواخذہ ہوتا ہے، اب کانگریسی اور مسلم لیگی مسلمانوں کا اختلاف اس حد سے گذر چکا ہے، کہ اصولی حیثیت سے دونوں میں سے کسی کے مسلک کے صحیح یا غلط ہونے پر گفتگو یا انھیں ایک نقطہ پر متحد کرنے کی کوشش کیجائے موجودہ حالات میں فریقین کا جادۂ تہذیب ومتانت پر قائم رہنا ہی غنیمت ہے، ابھی اس اخبار کے صرف چند نمبر نکلے ہیں، اس لئے نہیں کہا سکتا کہ وہ کس قسم کا نمونہ پیش کریگا،

آگ مرتبہ جناب خلیق ابراہیم صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ للعہ پتہ دفتر آگ جھوائی ٹولہ لکھنو،

لکھنو کا سیاسی اکھاڑا آجکل اخبارات کا بھی دنگل بن رہا ہے آئے دن نئے نئے اخبارات نکلتے رہتے ہیں ان ہی میں یہ تازہ ہفتہ وار اخبار ہے، جدید ہندوستان کا ہر نوجوان لینن اور ٹراٹسکی بننے کی آرزو رکھتا ہے، اس کی رگوں میں جو آتش سیال بھری ہے اسی سے یہ شعلہ بھی پھوٹا ہے جس کی ہر سطر سے شرارے نکل رہے ہیں، چنانچہ اس کا اڈیٹوریل اس مصرع سے شروع ہوتا ہے، ع

گھبرا گیا ہوں نور سے ہے نار کی تلاش

آگے چل کر آگ کے مقاصد پر روشنی ڈالتا ہے" رجعت پسندی رسوم ورواج کی لعنت ہندوستان کو روز بروز تباہی سے قریب کرتی جاتی ہے..... مذہب کی آڑ میں انسانوں کے پوتر خون کی ہولیاں کھیلی جاتی ہیں....

آگ رجعت پسندی کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتا ہے،" اس آتش باری سے قیاس ہوتا ہے، کہ زمانہ پھر علاؤالدین جہانسوز کی مثال زندہ کرنے والا ہے، پریم نبد ہو کہ یہ شعلہ فشانی، اور ابراہیم ہو کہ یہ آتش پرستی، انقلاب کا یہ پہلا کرشمہ ہے! بہر حال یہ زمانہ کی رو ہے جس کا روکنا مشکل ہے لیکن افسوس یہ ہو کہ مسلمان نوجوان اس کا زیادہ شکار ہو رہے ہیں، اگر یہ انقلاب سیاسی خیالات تک محدود رہتا، تو غنیمت تھا، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ انقلاب کے یہ شعلے ان کے مذہب تہذیب و تمدن سب کو بھسم کئے ڈالتے ہیں، اس اخبار کا مقصد، بے مہار انقلاب اور روسی اشتراکیت کی تبلیغ ہے، ابھی اس کا صرف ایک نمبر نکلا ہے، اس لئے اس کے مضامین پر تفصیلی تنقید کا موقع نہیں ہے، یہ نمبر کارل مارکس کے مقالہ اور "باغی" کے ترانے سے مزین ہے،

الاصلاح مرتبہ علی جان صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت فی پرچہ ۱ر پتہ دفتر الاصلاح اسمٰعیلی پریس ڈونگری بمبئی،

خوجہ جماعت کا یہ اخبار کئی مہینہ سے بمبئی سے نکل رہا ہے، بڑا حصہ اردو کا ہوتا ہے، اور چند صفحات گجراتی کے، علمی، ادبی، تاریخی ہر ذوق کے ہفتہ وار اخبار کے معیار کے مضامین اور مختلف قسم کے مفید معلومات پیش کرتا ہے، سیاسی خبریں بھی ہوتی ہیں، اسلامی مسائل پر بحث و نظر کا خاص اہتمام ہے اگرچہ یہ اخبار ایک خاص جماعت کا ہے، لیکن اخبار کی پالیسی اور مضامین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے، بلکہ وہ ہر اسلامی فرقہ کا یکساں خیرخواہ ہے، مسلمانوں کے فرقہ وار اخبارات کو اس سے سبق لینا چاہئے،

سدا بہار مرتبہ اے ایچ انصاری صاحب و دیس راج دوھادن تقطیع بڑی ضخامت ۲۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ فی پرچہ ار پتہ:- موہن لال روڈ لاہور،

یہ ہفتہ وار اخبار عرصہ سے لاہور سے نکل رہا ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کیلئے آیا ہے، ادبی اخبار ہے، بڑا حصہ ادب افسانے و متفرق دلچسپ معلومات کا ہوتا ہے، کبھی کبھی سنجیدہ موضوع پر بھی مضامین نظر آجاتے ہیں، سیاسی خبریں بھی ہوتی ہیں، عام دلچسپی کیلئے خاص اخبار ہے،

"م"

مطبوعات جدیدہ

کمپنی کی حکومت مولفہ اشتراکی ادیب باری تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر مجلد قیمت عہ پتہ مکتبہ اردو لاہور،

ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت ہندوستان کی تباہی و بربادی کی خونچکان داستان ہے، اس دور کے حالات میں انگریزون نے اپنے نقطۂ نظر سے بہت سی کتابیں لکھیں، اس لئے ان کی صحت ظاہر ہے ہندوستانیون میں اس موضوع پر بی ڈی باسو کی انگریزی تصنیف "ہندوستان میں نصرانی اقتدار کا عروج" نہایت مشہور و مستند کتاب ہے، جس کا جواب آج تک انگریزوں سے نہ ہو سکا، اس کتاب میں انگریزی سیاست کو اچھی طرح بے نقاب کیا گیا ہے، اردو میں اس موضوع پر کوئی قابل ذکر کتاب نہ تھی، اشتراکی ادیب باری صاحب نے مذکورۂ بالا کتاب لکھکر یہ کمی پوری کی ہے، یہ کتاب زیادہ تر مسٹر باسو کی کتاب سے ماخوذ ہے، اس میں ہندوستان مین انگریزوں کے داخلہ سے لیکر ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ تک ہندوستان کی تباہی کے حالات ہیں، کہ ابتدا میں کس طرح انگریز تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے، کس طرح انھوں نے اپنے حریف پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کو نکالا، پھر کس مکر و فریب اور ظلم و ستم سے ہندوستانی ریاستوں کو مٹا کر سارے ہندوستان پر قابض ہو گئے، اور کس بے دردی اور ظلم سے ہندوستان کی دولت لوٹ کر اسکو مفلس بنایا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں نے حصول زر کے لئے ہندوستان کے امرا اور یہان کی رعایا پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے، اس سلسلہ مین دہلی کی حکومت، مرشد آباد، میسور، ارکاٹ اور اودھ کی نوابیون، پنجاب، سندھ، ملتان، مہاراشٹرا اور دکن

کی ریاستوں، روہیلہ، سکھ، مرہٹہ اور پٹھان وغیرہ ان تمام حکومتوں اور قوتوں کے زوال اور خاتمہ کی تاریخ آگئی ہے، جو تیموری حکومت کے زوال کے بعد طوائف الملوکی کے دور میں پیدا ہو گئی تھی، یہ کتاب انگریزوں کی پر فریب سیاست، دغا بازی، ان کے وحشیانہ مظالم، حرص و طمع اور شرافت انسانی سے عاری اخلاق کی بے نقاب تصویر ہے، اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے میں انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے ہیں اسکی مثال چنگیز و ہلاکو کی تاریخ میں بھی مشکل سے مل سکتی ہے، یہ کتاب مختلف حیثیتوں سے نہایت سبق آموز اور ہندوستانیوں کے مطالعہ کے لائق ہے، ایک پہلو سے یہ انگریزوں کے مظالم کی خونین داستان ہے، دوسرے پہلو سے ہندوستانی اُمرار کی ناعاقبت اندیشی، سادہ لوحی، باہمی رشک ورقابت، بزدلی، عمالان حکومت کی خودغرضی اور قوم فروشی کی شرمناک تاریخ ہے، تیسرے پہلو سے وہ اُن شہدائے ملّت کی اولوالعزمیوں اور جذبہ حریت کا زندہ جاوید پیام ہے، جو ہندوستان کی حفاظت کے لئے خود مٹ گئے لیکن جیتے جی اسکی عزت کا علم سرنگوں نہ ہونے دیا، ہر ہندوستانی کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے، انداز بیان دلچسپ اور انشا پردازانہ ہے، اس سے طرز بیان میں دلکشی تو ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن کہیں کہیں واقعات کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے، تاریخ کیلئے ہر موقع پر یہ انداز مناسب نہیں،

بیوہ مولفہ منشی پریم چند، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۹۰ صفحے، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ مجلد

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی،

یہ منشی پریم چند کا ایک اصلاحی افسانہ ہے، اس میں ہندو سوسائٹی کے ایک قابل اصلاح پہلو "عقد بیوگان" اور "بیوہ خانہ" کے قیام کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے، افسانہ کے اجزا کی تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس کی خوبی کے لئے منشی پریم چند کا نام کافی ہے، اس میں بیوہ کی الم ناک زندگی، اس کے گوناگون مشکلات و مصائب، اصلاح کی ضرورت، اس راہ کی مشکلات، ایثار و قربانی تمام پہلوؤں

کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے مختلف سیرتوں کی آمیزش نے اس دردانگیز افسانے کو دلکش بنا دیا ہے منشی جی کے افسانوں کی جملہ خصوصیات اس افسانہ مین بھی موجود ہے، زبان کی لطافت وشیرینی پلاٹ میں روزمرہ کی زندگی کے سادہ واقعات سے نتائج کا استنباط انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی مصوری ہر سیرت اپنی جگہ پر انسانی فطرت کا جاندار مرقع معلوم ہوتی ہے" امرناتھ" اور "پریما" کی سیرت کا مرحلہ نہایت نازک تھا لیکن منشی جی کے سحر نگار قلم نے نہایت خوبی سے نبایا ہے،

الکتاب الوحید، مترجمہ قاری محمد اسمٰعیل صاحب مجددی مدنی تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۰/ پتہ: مترجم خانقاہ معصومی متصل بازار نصر اللہ خان ریاست رامپور،

فن تجوید وقرأت میں شیخ عبد اللہ بن ابراہیم ،جمدرہ مکی کی کتاب "مفتاح التجوید" مستند کتاب ہے، قاری محمد اسمٰعیل صاحب مجددی مدرس مدرسہ عالیہ رامپور نے جن کی زندگی کا بڑا حصہ حجاز میں گذرا اور وہیں انھوں نے تعلیم وتربیت حاصل کی، اور شام ومصر وغیرہ کا سفر کرکے دنیاے اسلام کے مشہور قاریوں سے فن قرأت حاصل کرکے اس مین کمال پیدا کیا، ہندوستانی قاریوں کے استفادہ کے لئے "الکتاب الوحید کے نام سے مفتاح التجوید" کا مع اصل عربی کے ترجمہ کیا ہے، اس فن میں مصنف اور مترجم کے کمال فن سے کتاب کی اہمیت ظاہر ہے، ہندوستانی قرار اور قرأت کے طلبہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا

نغمۂ فردوس، مصنفہ ماہنامہ چودھری خوشی محمد صاحب ناظر تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت نفیس قیمت بے جلد عہ مجلد عہ پتہ: ناظم انجمن ارباب ذوق لائل پور،

اردو شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سابق منسٹر ریاست کشمیر کے نام اور کلام سے ناواقف نہ ہوں گے، ان کی بے مثل نظم "جوگی" نہایت مشہور ومقبول اور اردو شاعری میں سادگی اور تاثیر کا بہترین نمونہ ہے، چودھری صاحب کی مشق سخن طالب علمی ہی کے زمانہ سے جاری تھی، وہ مولینا حالی سے زیادہ متاثر تھے "نغمۂ فردوس" ان کے مجموعۂ کلام کا پہلا حصہ ہے،

یہ حصہ کئی اجزا پر تقسیم ہے "سروش غیب" اخلاقی اور صوفیانہ کلام "افکار ملی" قومی اور ملی نظمیں جو قومی جلسوں میں پڑھی گئیں "یادرفتگان" مراثی اور قطعات تاریخ وفات "تہنیات درباری" مدحیہ قصائد وغیرہ "سہرے" "مناظر قدرت" "مطائبات" ظریفانہ کلام "متفرقات" "غزلیات" "مثنوی ہیرورانجھا" "رباعیات" ان کے کلام کی خصوصیات یعنی سادگی و تاثیر ان تمام نظموں میں موجود ہے، ارباب ذوق کو ان کا لطف اٹھانا چاہئے

مرقاۃ العربیہ (عربی کی پہلی کتاب) مؤلفہ مولوی محمد عبد اللہ صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ :- انجمن ارباب ذوق لائل پور،

عربی کے طلبہ کو قرآن کے معنی سمجھنے کی استعداد تک پہونچنے کے لئے عرصہ لگتا ہے، مولوی عبد اللہ صاحب نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، اس کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے، کہ صرف ونحو کے قواعد کی مثالوں کو قرآن پاک کی آیات سے جمع کیا گیا ہے، کہ طالب علم شروع سے کلام اللہ کے معنی سے آشنا ہوتا جائے لیکن ایک بڑا نقص اس میں یہ ہے، کہ صرف مثالین دی گئی ہیں، ان سے متعلق قواعد نہیں بتائے گئے ہیں، اس لئے تنہا ان مثالون کے معنی سے قرآن کے معنی سمجھنے کا منشا پورا نہیں ہوتا، اس لحاظ سے ان مثالون کے معنی سمجھنا اور ترجمۂ قرآن پڑھنا دونوں برابر ہے، یہ کتاب صرف اسی صورت میں مفید ہوسکتی ہے، کہ پڑھانے والا صرف ونحو کے قواعد بتاکر ان مثالوں کو ان پر منطبق کرکے دکھاتا جائے، کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہو کہ کسی دوسری کتاب "کلید قرآن" میں جو غالبًا اس کے بعد کا حصہ ہے، اس کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اگر اسی کتاب میں مختصر قواعد بھی دیدیئے جاتے تو بہت مفید ہوجاتی تعلیمی ترتیب کے لحاظ سے کتاب کی ترتیب بھی مزید توجہ کی محتاج ہے،

دہلی مؤلفہ جناب محمود علی خان صاحب جامعی تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت :- ۴ر پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

یہ دلچسپ کتاب جناب محمود علی خان صاحب نے بچوں کے لئے تالیف فرمائی ہے، اس میں آسان زبان اور دلپذیر انداز میں دلی کی پرانی تاریخ، ان فرمانرواؤں کا مختصر ذکر جن کے آثار دلی میں ہیں، اور دلی کی تمام مشہور تاریخی عمارتوں کے مختصر حالات ہیں، بچوں کی دلچسپی کے لئے بعض عمارتوں کے فوٹو بھی دیدیئے گئے ہیں، یہ کتاب بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی،

پریم سوگ مؤلفہ جناب حسام الدین خان صاحب غوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

یہ کتاب مصنف نے منشی پریم چند کی یادگار میں تالیف کی ہے، اس میں منشی جی کی سیرت، اُن کی علمی و ادبی زندگی کے مختصر حالات اور فنی نقطۂ نظر سے ان کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی خصوصیات پر نقد و تبصرہ ہے، آخر میں ان کی تصانیف کی فہرست، مصنف کے نام ان کے چند خطوط اور "جواہر پارے" کے عنوان سے ان کے کچھ حکیمانہ اقوال ہیں،

انعامی مقابلہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی اڈیٹر پیام تعلیم تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۳ر، پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی،

اس کتاب میں مولوی حسین صاحب صاحب نے "اُلّو" کی دانائی اور بچوں کی شرارت کے بُرے نتائج کے دو دلچسپ قصے لکھے ہیں، یہ دونوں قصے چھوٹے بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی، قصہ سے متعلق تصویریں بھی دیدی گئی ہیں، ان سے کتاب کی دلچسپی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، زبان نہایت سہل اور بچوں کے مذاق کے مطابق ہے،

"م"

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۱

سنہ ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۴۲ | ماہ رجب المرجب ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء | عدد ۳

مضامین

شذرات

ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی ملی جلی زبان کا نام ہندوستانی رکھا گیا، اور جس کو کانگریس نے بار بار دیس کی عام زبان کے نام سے پکارا، اور جس کی تعریف یہ کی گئی کہ جو شمالی ہندوستان میں عام طور سے بولی جاتی ہے، اور جو عربی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے پاک ہے، راجندر عبدالحق معاہدہ میں یہی لفظ ہیں، گاندھی جی نے یہی کہا، جواہر لال جی نے یہی بتایا، مولانا ابوالکلام نے یہی فرمایا، اور ہم کو اطمینان ہوگیا کہ کانگریس کے "ہائی کمانڈ" کے حکم کے آگے اب کسی کانگریسی گورنمنٹ کے ممبر کو سرتابی کی جرأت نہ ہوگی ڈاکٹر کھرے کی نظیر بھی سامنے تھی،

مگر معلوم ہوا کہ وردھا کے پایۂ تخت سے ناگپور جتنا قریب ہے لکھنؤ اس سے بہت دور ہے، اس لئے ہائی کمانڈ کی سرتابی کی جو سزا ناگپور میں مل سکتی ہے وہ لکھنؤ میں نہیں مل سکتی، یوپی گورنمنٹ کے عہدہ دار اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے افسر ہندوستانی کے بجائے علانیہ ہندی کے رواج پر تلے ہوئے ہیں خصوصیت کیساتھ آنریبل سمپورنانند جی وزیر تعلیم کے رویہ کی سخت شکایت ہے کہ وہ صاف صاف کانگریس کے حکم کو توڑ رہے ہیں، اور اپنی پبلک تقریروں میں وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو ان جیسے وفادار کانگریسیوں کو نہیں کہنا چاہئے،

اس وقت ہمارے سامنے ہمارے وزیر تعلیم کی وہ تقریر ہے جو بنارس میں انھوں نے ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء

کی شام کو ناگری پرچارنی سبھا کے ایڈریس کے جواب میں فرمائی، اور جس میں یہ ارشاد ہوا،

"ہندی نہ صرف شمالی ہند کی مادری زبان ہے، بلکہ وہ ہندوستان کی "لنگوا فرینکا" ہے، یہ ایسی ہونی چاہئے جس کو آسانی سے نہ صرف بنگال اور گجرات کے لوگ بول اور سمجھ سکیں، بلکہ وہ بھی جو دکنی ہند میں رہتے ہیں، اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ ہندی جس کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے (!) ہمارے دکھنی بھائی بھی آسانی سے سیکھ لیں تو یہ ضروری ہے کہ ہم بہت کافی بڑی تعداد میں سنسکرت لفظ استعمال کریں"۔ (اسٹیٹسمین ۱۲ راگست ۱۹۳۸ء)

اب یوپی کانگریس کی زبان حال ہفتہ وار ہندستان کا ایک ٹکڑہ ملاحظہ ہو:-

"مدراس کی کانگریسی وزارت نے طے کر لیا ہے کہ مدراس میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان کی ابتدائی تعلیم لازمی کر دیجائے گی، کیونکہ اس وقت یہی ایک زبان ہے جو ہندوستان کی مشترکہ زبان کہی جا سکتی ہے، ہندوستانی زبان سے وہ زبان مراد ہے، جو سنسکرت اور عربی فارسی کے بھاری لفظوں سے خالی ہے، تمام شمالی ہند اور دکن میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اردو ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے"

(۲۸ راگست ۱۹۳۸ء)

کیا یہ دونوں ٹکڑے کسی ایک سبھا کے ذمہ داروں کے بیان ہیں؟

کہئے یہ حکم رہے، کہئے وہ ارشاد رہے،

اگر یہ دلیل صحیح ہے کہ دکھن کے ہندوؤں کے سمجھنے کے لئے سنسکرت لفظوں کو کافی بڑی تعداد میں اس زبان میں ملانا چاہئے، تو یہ دلیل کیوں غلط ہوگی کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے ضروری

ہے کہ اس میں کافی بڑی تعداد میں عربی اور فارسی کے لفظ بولے جائیں، واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کو جتنا اس کے نادان دوستوں نے نقصان پہنچایا ہے، اتنا اس کے دشمنوں نے نہیں،

بمبئی کے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کا تذکرہ ان صفحوں میں کئی دفعہ آیا ہے، اس کی عمر کا یہ چھٹا سال ہے، اس نے اتنے عرصہ میں کئی رسالے اور کتابیں شائع کی ہیں جنمیں سے ایک مشہور صوفی ابو سعید خزار (۲۸۶ھ) کی عربی صوفیانہ کتاب، کتاب الصدق ہے، جو پچھلے سال چھپکر نکلی ہے، ایسوسی ایشن کے لائق سکرٹیری آصف فیضی صاحب پوری تندہی سے اس کو چلا رہے ہیں، مقدمۂ ابن خلدون کا انگریزی ترجمہ بھی جس کو پروفیسر داؤد پوتا کر رہے ہیں، اسی کی طرف سے چھپنے والا ہے،

ہمارے فاضل دوست پرنسپل محمد شفیع صاحب (لاہور) اپنے اورنٹیل میگزین کے ذریعہ سے ہمیشہ مفید کتابیں روشناس کرتے ہیں، ابھی حال میں انھوں نے آداب الحرب کے نام سے ہم کو اسلامی فن جنگ کی ایک فارسی کتاب سے آشنا کیا ہے، جو اسلامی ہند میں سلطان التمش کے زمانہ میں لکھی گئی تھی، اس کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اور دوسرا انڈیا آفس میں ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی فنی ترقی کا یہ گوشہ اب تک چھپا تھا،

مصر کی ایک اطلاع سے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ مولوی حافظ عمران خانصاحب ندوی جو جامع ازہر کے درجہ تکمیل میں تعلیم پا رہے ہیں، پہلے سال کے امتحان میں اول آئے ہیں، ۲۷ شریک امتحان میں سے ۹ پاس ہوئے، جن میں ۴ اول ہیں، انہیں ایک حافظ صاحب ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب واپس لائے،

مقالات

اقبال علیہ الرحمۃ کے چند جواہر ریزے

از جناب پروفیسر خواجہ عبد الحمید صاحب، لکچرار، گورنمنٹ کالج، ملتان،

(۲)

۱۲۔ ۱۹۲۶ء کے شروع میں ایک شام کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بحیثیت مدیر کریسنٹ (Crescent) (رسالہ اسلامیہ کالج لاہور) حاضر ہوا، اور ملتجی ہوا کہ نئے سال کا پہلا نمبر نکلنا ہے، براہ کرم کوئی پیغام یا ارشاد طلبہ کے لئے دیجئے، تاکہ پہلے ورق پر اسے چھاپا جائے، فرمانے لگے مضمون لکھنے کا توقت نہیں البتہ یہ شعر چھاپ دو،

پشیمان شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی   کجا عیش برون آور دن لعلے کہ در سنگ است

میں نے اسے چھاپ دیا، اس سے بہتر پیغام مسلمان طلبہ کے لئے تو شاید ناممکن تھا،

۱۳۔ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں جب مسٹر منوہر لال وزیر تعلیم پنجاب تھے، تو مسلمانوں میں اپنی حق تلفی کا بہت چرچا تھا، ڈائرکٹر صاحب محکمۂ تعلیمات پنجاب ان دنوں سر جارج اینڈرسن تھے، مسلمان ممبران کونسل کا ایک مختصر سا وفد اس معاملہ پر بحث کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب کے پاس گیا، ڈاکٹر صاحب چونکہ ان دنوں کونسل کے ممبر تھے، اور تعلیمی حالات سے واقف، وہ بھی وفد میں شامل

تھے، رسمی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں ہوئیں، ڈاکٹر صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا کہ میں ضرور اس معاملہ پر غور کروں گا، اور جہاں جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے، اسکی تلافی کی پوری کوشش کرونگا، ڈاکٹر صاحب نے فوراً ظرافت سقراط سے کام لیا، اور سر جارج سے فرمانے لگے، اجی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجئے گا، ہم لوگ تو مسلمان ہیں، آپ کے اس وعدہ ہی سے خوش ہوگئے ہیں، اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں،

۱۴- ۱۹۲۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ (Knighthood) کا خطاب ملا، تو اسلامیہ کالج کے کریسنٹ ہوسٹل کے طلبہ نے آپ کو چائے پر مدعو کیا، ڈاکٹر صاحب نے کمال مہربانی سے (جوان کا عمر بھر شیوہ رہی) یہ دعوت قبول فرمائی، چنانچہ وقت مقررہ پر آپ تشریف لائے، آپ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب بھی ساتھ تھے، چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی، کہ ان کی ہدایت کے لئے چند کلمات فرمائے جائیں، ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں سے ایک نہایت خطرناک بلکہ مہلک چیز وہ نظریہ ہے، جسے "فن برائے فن" (art for art's sake) کہتے ہیں، اس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیار صحت اور نصب العین مقرر کرے، اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیات کا کوئی اصول) اس فن کی راہبری کا حقدار نہ ہو، وہ فن خود اپنا راہبر ہو، اس کی ترویج یا ترتیب یا اس کا ارتقاء کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو، وغیرہ، مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے، اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے لئے تیار نہیں، یہ نظریہ آج کل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے، اور اسکی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان اقوام کو گرا کر رہیگا، میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے، اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ

کرتا ہون کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا، فن جب اخلاقیات اور حیاتیات سے علحدہ ہوتا ہی، تو وہ بہت جلد مخرب اخلاق بن جاتا ہے، اعلیٰ مقاصد کی تکمیل یا پیروی کے لئے جمالیات کے کسی فن کو لوگے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کریگا، اور قوم وملت میں ایک نئی روح پھونک دیگا، لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بچھڑ جائے گا، تو قوم وملت کے حق میں زہر قاتل بنے گا۔"

مین نے اوپر ڈاکٹر صاحب کی مختصر تقریر کا ماحصل (جو شاید دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ تھی) اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، بالخصوص اس نظریہ "فن برائے فن" کی تعریف کو واضح کرکے بیان کرنا مین نے مناسب سمجھا، گو یہ تقریر سنے مجھے کئی سال گذر چکے ہین لیکن بعد کے واقعات نے ان خیالات کو میرے ذہن سے محو ہونے نہیں دیا، ہر طرف "فن برائے فن" کی تباہ کاریان ایک وبا کی صورت اختیار کر رہی ہین، جرمنی اور اٹلی میں تو ہٹلر اور مسولینی کی کوششوں نے اس نظریہ کی اچھی خاصی بیخ کنی کی ہے، لیکن دوسرے مشہور مغربی ممالک میں اس کے خلاف کوئی منظم جہاد نہیں کیا گیا، ہندوستان میں کچھ عرصہ سے یہ نظریہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہو رہا ہے، آزاد خیال فینن (.........) اس کے مبلغ ہین اور عریانیت ان کے فن کے اسرار کی کلید، ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کے مہلک نتائج کو جگہ جگہ اپنی تصانیف میں مثلاً محکوم اور زوال پذیر اقوام کے جمالیات کے تذکرہ میں بیان کیا ہے، اس نظریہ کے برعکس انھون نے اپنی تعلیم اس شعر میں نہایت بلیغ طریقہ سے بیان کی ہے،

دلبری بے قاہری جادوگری است   دلبری با قاہری پیغمبری است،

۱۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں مین نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا، ممبران اسٹاف نے کمال مہربانی سے چائے کی ضیافت دی، ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی، اس لئے انھیں بھی مدعو کیا گیا (یعنی اساتذہ کے علاوہ صرف وہی مہمان تھے) وہ ازراہ ذرہ نوازی شامل ہوئے، باتین ہوتی رہیں، دوران گفتگو مین منتظم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا فرمانے لگے پروفیسر میرا دوست ہے، اس کے ملازمتی جنازہ کے لئے مجھے ضرور

وقت نکالنا تھا، (The professor is my friend - I had to find time for his official funeral) اس پر قہقہہ پڑا، فرمانے لگے، کہ میں نے ان الوداعی پارٹیوں کے لئے "ملازمتی جنازے" کی اصطلاح وضع کی ہے،

اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب، مسٹر یوسف علی (جو پرنسپل تھے) کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے، باتوں باتوں میں پردہ کا معاملہ زیر بحث آیا، یوسف علی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، کیوں صاحب، آپ کو تو پردہ کی مخالفت ضرور کرنی چاہئے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں تو پردہ کا بہت حامی ہوں، یوسف علی صاحب نے وجہ دریافت کی، تو فرمایا کہ پردہ سے، جنسیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے، بے پردگی اور عریانی سے وہ راز کھُل جاتا ہے، جو جنسیت کی جان ہے، اس مختصر سے جواب میں انھوں نے انسانی نفسیات کے ایک اہم اصول کو لطیف پیرایہ میں بیان کر دیا،

۱۶۔ ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا، کہ ان کا کلام اور ان کا کام باقی رہے گا، عرصہ ہوا، میں نے ایک روز عرض کی کہ یورپی زبانوں میں آپ کا کلام اگر ترجمہ کی صورت میں شائع ہو جائے تو نہ صرف خود یورپ کے حق میں مفید ہوگا، بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ اور تعلیم کے متعلق بھی اہل یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بہت حد تک دور ہو جائیں گی، آپ ترجمہ کی اجازت ضرور دیں، فرمانے لگے، کہ میرا کلام باقی رہے گا، (My work shall live) تراجم آہستہ آہستہ ہو ہی جائیں گے،

۱۷۔ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان میں ڈاکٹر صاحب کو اکابر اور فضلاء سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا، ایک بزرگ نے عیسائی پادریوں کا مشہور اور جھوٹا اعتراض اسلام کے خلاف دہرایا، اور پوچھا کہ "سر محمد کیا یہ سچ ہے، کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کے روح نہیں ہوتی"؟ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "کیا روح سے آپ کی مراد وہی شے ہے، جو آپ لوگوں کے خیال میں جسم سے بالکل علحدہ اور

مختلف ہوتی ہے" معترض صاحب نے کہا جی ہاں انھوں نے جواب دیا "تو پھر صاحب اسلام کے مطابق عورت کیا مرد میں بھی روح نہیں ہے" اس دقیق اور لطیف جواب کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نظریہ پر بہت زور دیا ہے، کہ روح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے، اور یہ پرانے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے، قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے جس میں روحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں لیکن روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں موجود نہیں ہیں جن سے وہ بنا ہو، روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے جس کی وجہ سے بیسیوں ناقابلِ حل مسئلے فلسفہ و مذہب میں پیدا ہو چکے ہیں، اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت (Spiritual and organic being) تصور کرتا ہے، اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے، بلکہ حشر اور حیات بعد الموت کے لئے بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ حیات بعد الموت میں انسان کے لئے جو جزا اور سزا مقرر ہے جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے، وہ روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی، ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا جواب میں اسی مسئلہ کو واضح کیا ہے، کہ اسلام کے مطابق روح جسم سے علٰحدہ کوئی شے نہیں، اس لئے نہ وہ عورت میں پائی جاتی ہے اور نہ مرد میں، کس بلاغت اور ظرافت سے ایک ہی بات میں نہ صرف ایک جھوٹے الزام کی تردید کی گئی ہے، بلکہ ایک اہم اصول کو بھی واضح کر دیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب کی روزمرہ کی گفتگو میں یہی خاصیت بار بار نمایاں ہوتی تھی،

۱۸- دوسری گول میز کانفرنس کے زمانہ میں انگلستان کی مشہور سیاح خاتون مس روزینا فوربس (Miss Rosita Forbes) نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، چنانچہ مس صاحبہ نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا، یہ خاتون شمالی افریقہ اور اسلامی ممالک میں بہت پھری ہیں، اور ان پر اس سیاحت کا بہت اچھا اثر پڑا ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے، کہ ان کا محل جو

لندن میں ہے، وہ ایشیائی بلکہ اسلامی طرز آرایش کا نہایت لطیف اور شستہ نمونہ ہے، سامان آرایش،
غالیچے، زیب وزینت کے انداز ہر لحاظ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہارون الرشید کے بغداد کے کسی محل کا خاکہ
ہے، اسی محل میں ڈاکٹر صاحب کی ضیافت ہوئی، اور پر لطف مجلس رہی، لیکن انھیں خاتون کے محل کی
تعریف کا موقع نہ ملا، روانگی کے وقت مس صاحبہ سے نہ رہا گیا، پوچھنے لگیں "سر محمد میرے اس مکان
کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے،" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "آپ نے اپنی بہشت دنیا میں پائی، میں
اپنی بہشت کا منتظر ہوں۔"

۱۹- دوسری گول میز کانفرنس کو واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں مسولینی سے ہوئی، اس
ملاقات میں موسولینی نے ان کی تعلیم سے دلچسپی کا اظہار کیا، اور اسکی تعریف کی، گفتگو آدھ گھنٹے سے زیادہ
رہی دوران گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اطالیہ کی موجودہ حالت
(اور اس کی حل طلب مشکل) بہت حد تک ایسی ہے، جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی، ایران کی
تہذیب فرسودہ تھی، اور قوم کے قوا شل ہو چکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی، ایران کی
خوش قسمتی سے اس کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی جس نے ایران کو اپنا تازہ اور
خالص خون دیا، نتیجہ یہ ہوا، کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، اور یہ قوم ایک پر شکوہ تہذیب
کی حامل اور علم بردار ہوئی، عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہل فن، اہل سیاست، اور اہل
سیف پیدا ہوئے، اسی طرح روما کے زوال کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اطالیہ کو اپنا خون
دیا، اور اسے قرون وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی، اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون
کی ضرورت ہے، ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے، کہ اس کے شمال میں جری اور نیم مہذب
ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندرون عرب کے جری قبائل، یہ قومیں اپنا خون دیکر ایران
کو پھر زندہ اور قوی کردیں گی، لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کی جیسی مہذب قومیں آباد ہیں،

جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں، اطالیہ تازہ خون کہاں سے لیگی"؟ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے، کہ موسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا،

۲۰۔ ڈاکٹر صاحب پر حُسن کا اثر بہت گہرا اور فوری ہوتا تھا، روما کے اسی قیام کے زمانہ میں (جو صرف چند روزہ تھا) ان کی ایک دوست خاتون نے (غالباً اسی خاتون نے موسولینی کی ملاقات کے لئے وقت مقرر کرایا تھا،) جو اطالیہ کے طبقۂ امراء سے تھی، ان سے دریافت کیا، اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دیکھنی ہے، تو فرمائیے،؟ تاکہ اس کا انتظام کیا جائے، فرمایا کہ اطالیہ کا حسن مشہور ہے، میں اس شہر روما کی حسین ترین خواتین دیکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ موصوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں، جن سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی، فرماتے تھے، کہ اطالیہ کا حسن یورپ میں بہترین ہے، اور اس ضیافت میں روما کے حسن کے بعض نہایت لطیف نمونے تھے،

۲۱۔ گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پیرس میں پروفیسر برگساں سے ہوئی، برگساں کی تصانیف کا اثر ان پر بہت تھا، اس کا نظریۂ "واقعیت زمان" (Reality of Time) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی نقطۂ نگاہ کے بہت قریب تھا، چنانچہ دوران ملاقات میں اس پر بحث ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو یہ حدیث سنائی، کہ "زمانہ کو برا مت کہو کہ زمانہ خدا ہے"، فرماتے تھے، کہ جس وقت برگساں نے یہ حدیث سُنی تو وہ کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور مجھ سے پوچھنے لگا کیا یہ سچ ہے"؟

۲۲۔ گول میز کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کا سفر کیا، اس سفر کے واقعات انھوں نے کمال مہربانی سے مجھے مفصل سنائے قرطبہ کے جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، اس کے مالک (منیجر) سے آپ نے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ کیا اس علاقہ میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں؟ اس نے جواب دیا، کہ بڑی تعداد میں، آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے،

منیجر مسکرا کر بولا، اس کام کے لئے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، میں خود مراکشی اصل سے ہوں (جنوبی ہسپانیہ کے ان باشندوں کو مورسکو (Morisco) کہا جاتا ہے) حسن اتفاق سے آپ کو پرانی عمارتیں دکھانے کے لئے جو راہبر مقرر کیا گیا تھا، (آپ نے شرط یہ رکھی تھی، کہ راہبر انگریزی جانتا ہو، کیونکہ میں ہسپانوی زبان سے آشنا نہیں) وہ بھی مراکشی اصل سے تھا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس علاقہ میں عربی مراکشی اثر چہروں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے، چنانچہ "مسجد قرطبہ" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے،

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال | اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے | رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اسی سفر ہسپانیہ میں آپ کو پروفیسر آسین (Asin) سے بھی ملاقات کا موقع ملا، یہ وہی پروفیسر ہیں، جنھوں نے قریبًا پندرہ سال یا شاید کچھ زیادہ ہوتے ہیں، ایک معرکۃ الآرا تصنیف کی تھی، جس میں یہ ثابت کیا تھا، کہ اطالوی شاعر دانتے پر عربی بالخصوص ان حدیثوں اور روایتوں کا اثر جو معراج نبوی صلعم اور عذاب دوزخ سے متعلق ہیں، کسی قدر غالب تھا، دانتے کی شہرۂ آفاق تصنیف ڈیوینا کامیڈیا میں یہ اثر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ پروفیسر آسین کی خواہش تھی کہ مسلمان طالب علم بالخصوص ہندوستان کے مسلمان طالب علم ہسپانیہ میں آئیں، اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بے شمار عربی مخطوطوں کا مطالعہ کریں، جو ہسپانیہ کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں، (خدا جانے اس خوفناک جنگ میں ان نایاب مخطوطوں کو کسقدر نقصان پہونچا ہو؛)

ڈاکٹر صاحب کو سفر ہسپانیہ میں معلوم ہوا، کہ اس ملک میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی، ملک میں ایسے نوجوان اور فضلا نکل آئے تھے، جو ہفت صد سالہ اسلامی

حکومت ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے، اور اس دور کو اندلس کا بہترین زمانہ کہکر یاد کرتے تھے، اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا، حالانکہ کئی سو سال سے ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادتگاہیں بنالی تھیں، وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے مسجد کو محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کردیا گیا، اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حکمت الٰہی کی ایک دلپذیر مثال یہ سنائی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ (جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادرترین عمارتوں میں سے ہے) عیسائی راہبوں کے قبضہ میں آئی، تو انھوں نے آیات قرآنی پر جو سنہری حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں، پلستر کرا دیا، آج قریبًا پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمۂ آثار قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا جاتا ہے، تو وہی نقوش اپنی پرانی شان میں دنیا کے سامنے آتے ہیں اگر پلستر نہ ہوتا، تو یہ نقوش غالبًا اس وقت تک بالکل محو ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن میں نقش ہے، کہ "مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھکر جو لذت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے متعلق میں نے حاصل کی، وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کرسکا"، ایک بات ڈاکٹر صاحب کو اسپین کے سفر میں خاص طور سے نوٹ کرنی پڑی، کہ اس وقت اس ملک میں پرانی مساجد کی تعداد بہت ہی کم ہے، ان کا خیال تھا کہ اسکی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، یا مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج کے بعد تعصب کی وجہ سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو سخت بے دردی سے گرادیا ہوگا، اور یا خود مراکشی اندلسی مسلمانوں کو بے ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ تھا، جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے، پہلا خیال غالبًا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے،

ڈاکٹر صاحب ہسپانیہ کی آب وہوا کی بیحد تعریف کرتے تھے، فرماتے تھے، کہ اس

ملک میں دو تین مقامات ایسے ہیں، اور ان کی فضا اس قدر پاک اور خستہ ہو کہ آج کا پکا ہوا سالن کئی مہینوں تک نہ بگڑے گا،

۲۳۔ دو سال کے قریب ہوئے جب اسپین کی موجودہ ملکی جنگ کا آغاز ہوا تو یہ خبریں بھی پہونچنا شروع ہوئیں، کہ جنرل فرانکو کی فوج کا زیادہ حصہ خصوصًا وہ حصہ جو یلغاروں میں اور فیصلہ کن لڑائیوں میں، (Storm Troops) صف شکنوں کا کام دیتا ہے، تمام تر مراکشی سپاہیوں اور رضاکاروں پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ کے بعد ان جفاکش اور جری سپاہیوں کی تصاویر بھی اخباروں میں چھپنا شروع ہوئیں، ان خبروں سے ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان پر گہرا اثر ہوا تھا اور ہے، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خیال کے اثر کا ذکر کیا، کہ سرزمین اندلس قریبًا بارہ سو سال کے بعد پھر مسلمان مراکشی بہادروں کے قوی بازوؤں سے سر ہو رہی ہے، ڈاکٹر صاحب فورًا بولے تمھیں میری نظم مسجد قرطبہ کا آخری بند یاد نہیں رہا، اس میں میں نے پیشینگوئی کی تھی،

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے، اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکیگا فرنگ میری نواؤں کی تاب

۲۴۔ ڈاکٹر صاحب پر جرمن مفکر نٹشے کا بہت اثر تھا "خودی" کے اسرار ان پر اس وضاحت اور جدت سے فاش نہ ہوتے، اگر نٹشے کی تصانیف سے وہ لاعلم رہتے، بال جبریل چھپنے کے کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ میں نے ان سے عرض کیا، کہ پچھلے دنوں میں نے نٹشے کی فلاں فلاں کتابوں کو کئی سالوں کے بعد اور شاید تیسری بار پڑھا ہے، لیکن اسکی فکر میں وہ تازگی جوش اور گہرائی ہے کہ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں، اس کے بنیادی خیالات اسلام سے اسقدر

قریب ہیں، کہ افسوس ہوتا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اسلامی نقطۂ نظر پیش نہ کیا، قرآن سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے فلسفہ میں "انکار الٰہیت" (Godlessness) کی تعلیم دینا پڑی، عیسائیت نے خدا کے بیٹے کو بکری کا "تُلّا" اور اخلاق کو روحانی پست ہمتی کے مترادف بنا کر اسے صحیح مذہب سے متنفر کر دیا، وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تمہارا یہ خیال بالکل صحیح ہے، اسی لئے تو میں نے نٹشے کے متعلق کہا ہے کہ ع

دلش مومن، دماغش کافر است،

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں شاہین کا فقیر و درویش ہونا نٹشے کے زردشت کے اس وعظ سے بہت قریب ہے، جس میں وہ اپنے کوہستانی نشیمن کو اس لئے پسند کرتا ہے، کہ وہاں اسے عقاب اور ستاروں کی ہمسایگی نصیب ہے،

۲۵- ڈاکٹر صاحب سے میں نے دو تین موقعوں پر مرزا بیدل کی شاعری کے متعلق پوچھا، بیدل کے متعلق ان کی رائے نہایت اچھی تھی، میں نے ایک بار کہا کہ اس کی فارسی میں بے ضرورت مشکل پسندی ہے، فرمانے لگے، کہ تھوڑی کاوش سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے، بیدل نے اپنی خاص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں، جنھیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے، اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی، بیدل اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ بغور کیا جائے،

۲۶- پچھلے سال اگست یا ستمبر میں ایک روز جب میں شام کے وقت حاضر خدمت ہوا تو آپ حسب معمول جاوید منزل کے صحن میں بستر پر لیٹے تھے، اس سے چند مہینے پہلے ایک دو مرتبہ انھوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک معلمہ یا اتالیقہ کی ضرورت کا ذکر کیا تھا، کچھ دیر سیاسی خبروں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں ایک یورپین خاتون بچوں کو لیکر گذریں میرے

دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ یہ خاتون بچون کی اتالیقہ ہیں، جرمن نسل سے ہیں، اور نہایت شریف الطبع ہین انھیں ہروقت بچوں کی پرورش کا خیال رہتا ہے، اور فرصت کا کوئی وقت بھی وہ بے کار نہیں گذارتین، کچھ کام نہ ہو تو کمرہ ہی جھاڑنا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ بچوں کی طرف سے تو میری طبیعت اب بالکل مطمئن ہے، البتہ مجھے کچھ عرصہ سے تنہائی بہت محسوس ہو رہی ہے، علی بخش میری ضروریات کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن میرے لئے اب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گذرتا ہے، لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، شام کا وقت بھی اسی طرح گذرتا ہے، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، پڑھنا بند ہو چکا ہے، اور سوئے انسان کب تک، میں نے عرض کی کہ موسیقی کا انتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین ہو گی، فرمایا کہ مجھے موسیقی کی بہت خواہش ہے، میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے، جس موسیقی کی مجھے ضرورت ہے، وہ ابھی شروع نہیں ہوئی،

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ہندوستانی موسیقی میں المیت کا عنصر بہت غالب ہے، اور ذوقِ حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا، میں نے کئی بار ان کی زبان سے سُنا، اس نتیجہ پر ڈبرسون پہلے پہونچ چکے تھے،

۲۷ ء ۱۹۳۷ء میں سید سر راس مسعود مرحوم کی وفات کی خبر اخباروں میں نکلی، اس کے چند روز بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے معلوم تھا کہ مرحوم ان کو بہت عزیز تھے، چنانچہ جب مین نے ان کی خدمت میں اظہار افسوس کیا تو انھوں نے مرحوم کی بہت تعریف کی، میں نے پوچھا کہ مرحوم میں خاص خوبیان کیا تھیں، فرمانے لگے کہ "دو باتین ان میں نمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ بیحد فیاض تھے، ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، کسی کی تنگدستی کو برداشت نہ کرسکتے

تھے، اسی لئے ان کی تنخواہ (اگرچہ معقول تھی) ان کے لئے کافی نہ تھی، کوئی سائل ان کے گھر سے خالی نہ جاتا تھا، میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں، ان کی بیماری سے کچھ عرصہ پہلے میں نے انھیں لکھا، کہ میں نے اپنی وصیت میں چار اشخاص کو اپنے بچوں کا سربراہ مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب فوت ہو گئے ہیں، مجھے بہت خوشی ہوگی، اگر آپ سربراہ بننا منظور فرمائیں، انھوں نے جواب میں لکھا کہ میں لاہور سے بہت دور ہوں، اس لئے بحیثیت سربراہ میں بچوں کو کیا فائدہ پہونچا سکوں گا، البتہ آپ براہ مہربانی اپنی وصیت میں یہ الفاظ ضرور درج فرمائیں کہ اگر بچوں کو خدانخواستہ کبھی مالی تکلیف ہو تو سب سے پہلے اطلاع کا حقدار مجھے سمجھا جائے، دوسری نمایاں خصوصیت مرحوم میں یہ تھی، کہ ان کا دسترخوان بہت فراخ تھا، اور ان کا کھانا بہترین، ان کے پاس بہترین باورچی ملازم تھے، اور عمدہ کھانوں اور ضیافتوں پر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے اسی غرض سے خالص عربی میزبانی کا سامان مکمل جمع کیا تھا، الغرض مرحوم ہندوستان کے خوش وضع اور مخیر اکابر میں سے تھے اب ان کا جانشین یا ثانی مشکل سے ملیگا!!

۲۸- ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات اخیر دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس وقت وہ خوابگاہ میں پلنگ پر بیٹھے تھے، کچھ دیر تک وہیں باتیں ہوتی رہیں، پھر علی بخش نے آکر اطلاع دی، کہ کھانا تیار ہے، (دوپہر کا وقت تھا) فرمانے لگے، چلو دوسرے کمرہ میں بیٹھیں، ڈاکٹر صاحب صوفا پر بیٹھ گئے، علی بخش نے کرسی سامنے رکھدی، اور کھانا اس پر چن دیا، میں کھانا کھا کر گیا تھا، اس لئے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، آپ اشتہا سے کھانا کھاتے رہے، اور باتیں بھی ہوتی رہیں، اتنے میں رحما (دوسرا ملازم) اندر آیا، اور اطلاع دی کہ مسٹر یوسف علی اور چھوٹے میاں (نواب سر ذوالفقار علی خانصاحب مرحوم کے صاحبزادے) آئے ہیں، آپ نے فرمایا یہیں بلالو، چنانچہ کرسیاں قریب ہی رکھدی گئیں، اور دونوں صاحب اندر تشریف لائے، مسٹر یوسف علی نے سلام علیک کے بعد مزاج پرسی کی، ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت فرمایا بہت اچھا ہوں، مسٹر یوسف علی نے فرمایا، میرا بھی یہ خیال ہے، کیونکہ کھانا کھانا خود صحت کی نشانی ہے!

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، بتائیے انگلستان سے کیسے آمد ہوئی، یوسف علی صاحب نے جواب دیا، کہ قرآن کریم کے آخری تین پارون کا ترجمہ زیر طبع ہے، یہ کام اپنی نگرانی میں کروانے کے لئے آیا ہون، کسی بات پر آپ نے مسٹر یوسف علی کو ایک لطیفہ سنایا، (جو میں بھول گیا اس میں دہابیون کی "یوست" کا ذکر تھا) میں مسٹر یوسف علی کے سامنے بیٹھا تھا، لیکن غالبًا وہ مجھے پوری طرح سے پہچان نہ سکے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا آپ پروفیسر حمید کو پہچانتے ہیں؟ اسلامیہ کالج میں دو سال آپ کے ماتحت کام کر چکے ہیں، مسٹر یوسف علی بولے ہان، ہان، بعد میں تمھیں گجرات میں بھی تو دیکھا تھا لیکن بھئی تم نے اپنے بال کیوں اس قدر سفید کر رکھے ہیں،؟ میں نے عرض کی کہ خاندانی رجحان سفید بالوں کی طرف زیادہ ہے، ڈاکٹر صاحب نے مسٹر یوسف علی کی طرف مڑ کر کہا آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ وہ بولے پہلے (اسلامیہ کالج میں) میں غلام تھا، آج کل آزاد ہون، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے لئے (میری طرف اشارہ کرکے) زمان (Time) کی رو آگے کی طرف بہ رہی ہے، اور آپ کے لئے پیچھے کی طرف (Time is moving forwards for the professor and backwards for you)

اس کے بعد حسب ذیل باتیں ہوئین،

یوسف علی صاحب۔ فرمائیے آجکل کچھ زیر تصنیف ہے،؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اردو اور فارسی دونوں میں کچھ کلام جمع ہو رہا ہے،

یوسف علی صاحب:۔ آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے، کہ آئندہ فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں گا،

میں:۔ بانگ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دو اور کتابین اردو میں شائع ہو چکی ہین،

ڈاکٹر صاحب جی ہان میں اردو میں چند ساقی نامے لکھ رہا ہوں،

یوسف علی صاحب :- موجودہ تصنیف کب مکمل ہوگی ؟

ڈاکٹر صاحب :- اگلے سال انشاء اللہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر،

یوسف علی صاحب :- آیندہ سال حج کو ضرور تشریف لے جائیے گا ؟

ڈاکٹر صاحب :- جی ہاں ارادہ تو یہی ہے، اطالوی کونسل جنرل نے مجھے دعوت دی ہے کہ اطالوی کمپنی لائڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز میں سفر کیجئے گا، یہ جہاز جدہ میں تو نہیں ٹھہرتے، لیکن جدہ کے سامنے اطالوی سمالی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں، وہاں سے وہ میرے لئے ایک خاص اگن بوٹ کا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، جو مجھے جدہ پہنچا دیگی، اس طرح سفر میں مجھے تکلیف نہ ہوگی، اسکے متعلق خط وکتابت جاری ہے،

یوسف علی صاحب :- بیشک، اطالوی حکومت کو اسلامی دنیا میں آپکی اہمیت کا پورا علم ہوگا اور وہ ہر طرح سے اسکو سہولت پہنچانے کی کوشش کرے گی،

ڈاکٹر صاحب :- میں بھی چاہتا ہوں کہ سفر کی کوفت سے بچوں، صحت کی موجودہ حالت میں اس کوفت کو برداشت نہ کرسکوں گا،

چند منٹ اور گفتگو ہوئی، اس کے بعد دونوں صاحب تشریف لے گئے، اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دوبار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفر حجاز کے متعلق اس تجویز کا ذکر کیا تھا انھیں حج کی اس قدر لو لگی تھی، کہ غالباً انتقال کے وقت انھیں اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا ہوگا،

دس پندرہ منٹ کے بعد میں بھی اجازت لے کر رخصت ہوا اسوقت میرے دل میں یہ خیال ہرگز نہ آسکتا تھا کہ چار مہینہ میں کے قلیل عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدت مندوں کو داغ مفارقت دے جائیں گے اس وقت ان کے چہرہ سے صحت ٹپک رہی تھی، خط تھوڑی

دیر پہلے بنوا کر بیٹھے تھے، موچھوں کو قدرے تاؤ بھی دے رکھا تھا، چہرہ کی شان جرمن جرنیلوں کی سی تھی، طبیعت بہت بشاش تھی، صرف دو تکالیف تھیں، ایک آواز جو کسی طرح کھلتی نہ تھی، اور دوسرے موتیا بند جو کچھ عرصہ سے اتر آیا تھا، آواز کے نہ کھلنے کا انھوں نے کبھی گلہ نہ کیا تھا، اور موتیا بند کا وہ مارچ ۱۹۲۹ء میں اپریشن کرانا چاہتے تھے، ان کی شکل وہیئت سے کوئی ایسے آثار ظاہر نہ تھے، جن سے میرے یا اور کسی شخص کے دل میں یہ وہم پیدا ہوتا، کہ خود ہی کا یہ دانائے راز سفر آخرت کے لئے تیار بیٹھا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایرانی مطبوعات

تتمہ ثعالبی المتوفی ۴۲۹ھ کی مشہور تصنیف یتیمۃ الدہر جو عربی شعراء اور ادبا کا قدیم تذکرہ ہے نہایت مشہور و معروف کتاب ہے، مصنف نے بیس برس کے بعد اس کا تکملہ خود لکھا تھا، جو اب ایران میں دو جلدوں میں طائپ میں چھپا ہے، قیمت جلد اول للعہ قیمت جلد ثانی للعہ

التوسل الی الترسل بہاء الدین محمد بن موید بغدادی نے جو چھٹی صدی ہجری میں علاء الدین تکش خوارزمشاہ کا میر منشی تھا، جو سرکاری مراسلے فارسی میں لکھے تھے، ان کا یہ مجموعہ ہے، اسمیں بہت سی تاریخی باتیں بھی ضمناً آگئی ہیں، ضخامت ۵۰۲ صفحے قیمت :۔ سے ر

تجارب السلف ہندو شاہ بن سنجر نخجوانی نے ۷۲۴ھ میں خلفاء اور وزراء کی فارسی تاریخ لکھی ہے، ضخامت ۳۰۰ صفحے، قیمت عہ ر

معالم العلماء رشید الدین ابو جعفر بن شہر آشوب المتوفی ۵۸۸ھ نے ایک ہزار شیعہ مصنفین اور رجال کے حالات میں یہ کتاب عربی میں لکھی ہے، ضخامت ۱۴۲ صفحے، قیمت سے ر

حیات سعدی مولانا حالی مرحوم کی مشہور کتاب کا فارسی ترجمہ ضخامت ۱۴۱ صفحے قیمت عہ "منیجر"

آخری سلاطین تیموریہ کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے رفیق دار المصنفین

بہادر شاہ ظفر

(۲)

ظفر کی اخلاقی شاعری گذشتہ صفحات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ظفر کی طبیعت پر حزن و ملال کس قدر غالب ہے، تلخیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کے ہجوم میں اسکی زندگی محض داغِ تمنا اور سراپا آرزو بنکر رہ گئی تھی، ظاہر ہے کہ ایسے حسرت زدہ اور ارمان سوختہ انسان کے دل و دماغ پند و نصیحت کے لئے کسقدر موزوں ہونگے،

ظفر نے اس سلسلہ میں جتنے اشعار کہے ہیں، وہ محض ایک فلسفی کے خیالات نہیں ہیں، بلکہ اپنی وارداتِ زندگی سے جو کچھ اس نے محسوس اور اخذ کیا ان کو اشعار کی سلک میں منسلک کر دیا ہے، وہ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور خیالات کے ہنگاموں میں اپنے اور اپنے ناظرین کو گم کرنا نہیں چاہتا ہے، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے، پیش کر دیتا ہے، اس کی تمام زندگی اور پھر اس کے اشعار آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں، تو پڑھنے والوں پر ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے، جو غیر ارادی طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے،

شاہجہاں اور جہانگیر کا آخری جانشین گویا اپنی سلطنت کی ویرانی کا یہ عبرتناک مرقع کھینچتا ہے،

جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں چٹیل ہے میدان اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن تھے اور شجریاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبریاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے نتھے یہاں یاقوت تودے تے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب کبھی رُلتے گُہریاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شریاں تھے

جہاں اب خاک پر ہے نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظریاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

اس ماتم میں دنیا کی بے ثباتی کا پورا نقشہ ہے، ظفر کی زندگی اور اس کا المناک خاتمہ کچھ ایسا تھا کہ وہی دنیا کی بے ثباتی کی مکمل اور پر درد تصویر کھینچ سکتا تھا، ایک جگہ کہتا ہے،

صبح گلشن میں صبا تیرا اگر ہووے گذر
کیو بلبل سے ذرا آ کہ اے شوریدہ سر

کر رہی ہے چہچے کیا شاخ گل پر بیٹھکر
یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور

اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائینگے

یہ تو شعر و شاعری کی زبان تھی، مگر اسی کو صاف صاف ایک پوری غزل میں دوسری جگہ بیان کرتا ہے،

جو تماشا دیکھنے دنیا میں تھے آئے ہوئے
کچھ نہ دیکھا پھر چلے آخر وہ پچھتائے ہوئے

فرش مخمل پر بھی مشکل سے جنھیں آتا تھا خواب
خاک پر سوتے ہیں اب وہ پاؤں پھیلائے ہوئے

جو صہبائے فنا ہستی میں ہیں مثل حباب
ہوتے ہیں اول ہی سے پیدا وہ کفنائے ہوئے

غنچے کہتے ہیں کہ ہوگا دیکھئے کیا اپنا رنگ
جب چمن میں دیکھتے ہیں پھول کمہلائے ہوئے

غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقش بر آب
موج کے مانند کیوں پھرتے ہو بل کھائے ہوئے

اسی لئے وہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں کو عبث اور ہیچ سمجھتا ہے، اس کی زندگی اور اس کی زندگی کی تمام نیرنگیاں عبرت کا پیام تھیں، ایک عظیم الشان سلطنت کی بیخ کنی، اوسکی نظروں کے سامنے ہورہی تھی، ایک پر جلال، پر ہیبت اور پرشکوہ خاندان کے خدم وحشم، عز وشان، اور سطوت و جبروت کا خاتمہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تخت طاؤس پر بیٹھنے والوں کا جانشین ہمالیہ سے راسکماری تک کے فاتح کا وارث، اور کوڑیوں کی طرح زر و جواہر لٹانے والے کی یادگار چند روپیوں کے محتاج ہورہی تھی، ایسی حالت میں دل اور جگر کے زخموں کی ٹپک سے یہ دردانگیز چیخیں کیوں نہیں نکلتیں کہ

سب کار جہاں ہیچ ہے سب کار جہاں ہیچ
اس ہیچ سے امید ہے لے ہیچداں ہیچ

مانند حباب ایک نفس میں ہے خرابی
اس منزل فانی میں ہے بنیاد مکاں ہیچ

اک عمر ہے مایۂ دنیا سے گراں بار
آخر کو جو دیکھا تو بجز بار گراں ہیچ

اس باغ میں تھوڑی سی بہار اور پھر آخر
اے نوگل خنداں مجھے تشویش خزاں ہیچ

ہو جنس تنک مایۂ ہستی کے نہ خواہاں
یہ جنس یہ بازار یہ گوہر یہ دکان ہیچ

آواز طرب گوش دل محزون سے،
جز نالۂ و فریاد و بجز آہ و فغاں ہیچ

پایا نہ بجز داغ سیہ کاری یک عمر
نقش قدم قافلۂ عمر رواں ہیچ

کیا دیکھیں ظفرؔ خانۂ ہستی کا تماشہ
اس وہم کدہ میں بجز وہم گماں ہیچ

مگر ظفرؔ جانتا تھا، کہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی کی داستان خواہ کیسی ہی دردناک اور عبرتناک ہو، وہ انسانیت کی دنیا میں گنہگار اور مجرم ہوگا، اگر وہ لوگوں کے لئے صرف الم و یاس اور حسرت و حرمان کا پیام چھوڑ جائے گا، وہ اس سے واقف تھا، کہ زمانہ انقلاب آفرین ہے، اس دنیا میں:-

نہ دائم غم ہے نہ ہے عشرت کبھی یوں ہے کبھی وں ہے
تبدل یاں ہے ہر ساعت کبھی یوں ہے کبھی وں ہے

کوئی دن ہے بہار گل پھر آخر ہے خزاں بالکل
چمن ہے منزل عبرت کبھی یوں ہے کبھی وں ہے

اسی لئے اس کا پیام ہے، کہ فلک کے تمام مظالم کے باوجود انسان کی ہمت مردانہ کا اقتضا یہ ہے کہ ضبط وصبر سے کام لے اور خدا پر بھروسہ کرے کہتا ہے،

ستم کرتا ہے بے مہری کیا کیا آسمان پیہم
دل اس کے ہاتھ سے پر درد ہے اور چشم ہے پرنم

کروں گا پر نہ شکوہ گرچہ ہوں گے لاکھ غم پر غم
کئے جاؤں گا میں ہر دم یہی جب تک ہے دم میں دم

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

اور جب انسان خدا پر بھروسہ اور توکل کرنے لگتا ہے، تو پھر دنیا کے تمام لوگوں سے مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے،

بلا سے اگر نہیں کوئی رفیق و آشنا میرا
خدا پر دھیان ہے میرا نگہبان ہے خدا میرا

خدا آسان کریگا گو ہے مشکل مدعا میرا
خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکل کشا میرا

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

مگر ظفر کا خدا پر بھروسہ کرنے سے مطلب ہرگز یہ نہ تھا، کہ انسان اپنی زندگی کو خود سنوارنے کی کوشش نہ کرے، ظفر جانتا تھا کہ انسان کو اسی دنیا میں زندگی بسر کرنا ہے، وہ اپنے لئے کوئی نیا عالم اور نیا آسمان پیدا نہیں کر سکتا ہے، مگر ہاں اس کے لئے خوشگوار راہیں کھلی ہوئی ہیں جن پر چل کر وہ اس دنیا میں مسرت و راحت کی زندگی گذار سکتا ہے، وہ کونسا راستہ ہے ملاحظہ ہو،

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

نخوت، پندار، تکبر اور غرور کی راہ میں صرف تباہیاں اور بربادیاں ہیں، اس لئے

کم ظرف پر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانند جوش غم نہ زیادہ ابل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوزِ دل کیساتھ اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل،

اس دنیا میں قدم قدم پر مکر و فریب کا جال ہے، ہوش و خرد کا تقاضا ہے، کہ انسان ان سے دامن بچاکر زندگی کی مشکل راہوں کو طے کرے،

یہ غول وش ہیں انکو سمجھ تو نہ رہنما، سایہ سے بچ کے اہلِ فریب و دغل کے چل

مگر اس کے باوجود انسان کی زندگی کی منزلیں اسی وقت طے ہوسکتی ہیں، جب وہ خود اپنے پاوں سے چلے، اور اسکو اپنے بازو کی قوت پر اعتماد ہو،

اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل بل ہے تو بل کے بل پہ تو اپنے بل کے چل

اور اسکے ساتھ ہی آنکھوں میں بصیرت کا نور چاہیئے، کہ اندھیری راہ گم نہ کرسکے،

پھر آنکھیں بھی دی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم کہتا ہے کون تجھکو نہ چل چل سنبھل کے چل

لیکن انسان کو اپنی تمام جد وجہد اور سعی و کوشش کے باوجود کارکنانِ قضا و قدر ہی کا بہرحال محتاج رہنا ہے،

انساں کو کل کا پتلا بنایا ہے اس نے آپ اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل

ظفر زندگی کے مسائل کو یہیں پر ختم نہیں کر دینا چاہتا ہے، بلکہ اس نے ایک عالمگیر لطف و کرم کا بھی پیام دیا ہے، جس کے ذریعہ سے اس کا خیال ہے کہ انسان نہ صرف اپنے کو اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ سے متصف کرسکتا ہے، بلکہ وہ کائنات کی تمام چیزوں کو اپنے قابو میں لاسکتا ہے، ایک الہامی شاعر بنکر کہتا ہے،

گوشِ دل میں مرے آئی سحر آوازِ سروش کہ کسی یار کے شکوہ سے نہ کر کچھ تو خروش

گر کہیں یار بُرا لطف سے تو ہو خاموش یار عیار ہے تو پھر یار ہے ای صاحبِ ہوش

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

پھر لطف کی سحر آفرینیوں پر رقمطراز ہے،

لطف سے وحشی صحرا ہی نہیں تہا رام لطف سے ماہی و مرغ آئے حلقۂ دام

لطف سے بنتے ہیں انساں ہی فقط کیا خدام لطف سے ہوئے پرستار پری دیو غلام

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

لطف سے کن کے ہوو ہی کہتے ہی دونوں عالم لطف سے روح ہوئی داخل جسم آدم،

لطف سے گرچہ ہو مشوق بھرے عشق کا دم لطف سے غیر ہے بندۂ بے دام و درم

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

آگے چل کر جو شاعرانہ انداز سے گل افشانیاں کی ہیں ان میں وقت نظر کیسا تہ زور بیان بھی ملاحظہ ہو،

حلقۂ موج ہوا قوس قزح قوس ہلال گردش چرخ برین گردش مہ گردش سال

گردش ساغر مے گردش فانوس خیال سب تجھے کہتے ہیں یہ حلقہ بگوشوں کی مثال

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اسی طرح بعض جستہ جستہ ناصحانہ خیالات دیوان میں بہت کچھ ملیں گے، مثلاً

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

عقل پر ناز ہے قدرت پر نظر کسکو ہی سب کو فکر آج کی ہی کل کی خبر کس کو ہی

فنا ہی ساتھ تو پھر زندگی سے کیا حاصل فنا سے پہلے فنا ہو کہ ہو بقا حاصل

جو دل کو صاف ہو کرنا تو خاکساری کر کرے ہی خاک سے دیکھ آئینہ صفا حاصل

خاک کا پتلا ہی انسان ای ظفر اس کیلئے سرکشی اچھی نہیں ہی خاکساری کیلئے

جب کوئی کہتا ہے ہستی کو کہ ہستی خوب ہے اسکی غفلت پر فنا اس وقت ہنستی خوب ہے

دنیا کا ہے مزا ظفرؔ انجام کار زہر ، میٹھا سمجھ کے لوگ اسے للچا گئے تو ہین

اے ظفرؔ چاہیئے بندی کو گنہ سے پرہیز ورنہ کچھ شک نہیں غفار کی غفاری مین

گلشن دنیا نہیں جاے قیام ای غافلو ۔ غنچہ ساں تم دوش پر رخت سفر باندھے رہو

جو کہ ہے قسمت مین ہونا ہو گا آخر کو وہی اے ظفرؔ کیا شکوہ اس کا یوں ہوا یا وون ہوا

برے ہیں یا بھلے ہم تم ظفرؔ لیکن غنیمت ہین، کہ یا آئیں گے پھر پھر کر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

دنیا ہے جس نے کھینچ لیا ہاتھ اے ظفرؔ پھیلاے پانوں کیوں نہ ہو کنج فراغ مین

آدمی کو چاہیئے آدم شناسی اے ظفرؔ ہے یہ فرمودہ ہمارے حضرت تیمور کا

منعم اس دولت دنیا پر نہ کر دیکھ غرور سیکڑوں گور میں کیا کیا نہیں بہرام دبے

ظفر کی صوفیانہ شاعری یہی ناصحانہ خیالات آگے چل کر صوفیانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے ہیں، حوادث زمانہ اور واردات زندگی نے ظفرؔ کے دل میں اپنے مالک حقیقی کی لگن ایسی پیدا کر دی تھی، کہ آخر میں وہ بادشاہ وقت ہونے کے بجائے ایک صوفی منش فقیر ہو گیا تھا، اس کی زندگی صبر، توکل، اور استغنار کی داستان ہے، طبیعت میں فقر و درویشی کا خمیر موجود تھا، ہجوم مصائب نے اس نشہ کو اور تیز کر دیا، عہد طفلی ہی مین مولانا فخرالدینؒ سے شرف بیعت حاصل کی، چنانچہ خود کہتا ہے،

مرشد پاک رواں فخرالدین ، قبلہ و کعبۂ جان فخرالدین ،

اک جہان فخر جہان کہتا ہے ، پر ہے فخر دو جہاں فخرالدین ،

میں گدا ہوں ترے دروازے کا جاؤں اس در سے کہاں فخرالدین

موجزن ہے ترا دریاے کرم از کراں تا بہ کران فخرالدین

ہے مدد تیری توانائی بخش میں ہوں بے تاب و توان فخرالدین

کیا کروں عرض عیان ہے تجھ پر میرا سب راز نہاں فخرالدین

رکھ ظفر ہر نفس و ہر ساعت، شغل دل و رد زباں فخر الدین

ایک جگہ اور کہتا ہے،

کیا خطر اس کو راہ دیں میں ظفر • رہنما جس کا فخر دین ہو جائے،

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے[۵]

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں لیکن اپنے فخر دین کے کفش برداروں میں ہوں

ظفر کو اس خاندان سے کچھ ایسی شیفتگی تھی، کہ مولانا فخر الدین رح کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے میاں قطب الدین رح سے بیعت لی، خود رقمطراز ہے،

مرید قطب دین ہوں خاکپائے فخر دیں ہوں میں گرچہ شاہ ہوں ان کا غلام کمترین ہوں میں

ان ہی کے فیض سے ہر نام روشن میرا عالم میں وگرنہ یوں تو بالکل روسیہ مثل نگیں ہوں میں

نہ کعبہ سے غرض مجھ کو نہ بتخانہ سے کچھ مطلب ہمیشہ گھستا ان کے آستانے پر جبیں ہوں میں

---

[۵] اس عقیدت کا اظہار اپنے دیوان میں متعدد بار کیا ہے، مثلاً

خاک پائے فخر دین ہے اپنے حق میں کیمیا اے ظفر کیوں خواہش اکسیر کرنی چاہیے

کہتا ہے ظفر جو کچھ اب جوش محبت میں اے فخر جہاں سب وہ تیری ہی عنایت ہے

جو خاک بھی ہوں تو ہوں فخر دین کے در کی ظفر چھوڑ آئے نہ مجھ سے اس آستاں کو چرخ

اللہ اللہ جلوۂ حسن و جمال فخر دیں ہے اسی پر اے ظفر گرویدہ دل گرویدہ آنکھ

مدد اے فخر جہاں تا ہوں ظفر کے دل میں سب ملال آپ کے الطاف و عنایات میں رفع

ظفر دشوار ہے ہر چند اہل معرفت ہونا مگر صدقے میں فخر الدیں کے ہاں ہو سکتا ہے کچھ

جس کا ہے سرمہ ظفر خاک در فخر الدین چشم بد دور وہ ہے، اور ہی تاثیر کی آنکھ

کوچۂ فخر جہاں کی اے ظفر خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے،

رہوں میں رند ہمیشہ پر رہوں انکی محبت میں | نہیں خواہش مجھے یہ صوفی خلوت نشیں ہوں میں
مجھے تو خانقاہ و میکدہ دونوں برابر ہیں | ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہوں کہیں ہوں میں
یہی عقدہ کشا میرے یہی ہیں رہنما میرے | سمجھتا ان کو اپنا حامی دنیا و دیں ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں | ولیکن اے ظفر ان کا گدای رہ نشیں ہوں میں

اورجب مولینا قطب الدین کا وصال ہوا تو ان کے صاحبزادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی جوش عقیدت اور قلبی تعلق قائم رکھا، حالانکہ موخرالذکر اپنے والد کے انتقال کے وقت محض خوردسال تھے، ظفر نے ان کی طرف سے اپنے احساسات کا اظہار اس طرح کیا ہے،

نظام خانۂ فخر جہاں تمھیں تو ہو | قیام سلسلہ و خاندان تمھیں تو ہو
نہ کیونکر تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین | خدا رکھے تمھیں ان کا نشان یہیں تو ہو
تمھارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق | کہے ہے کعبۂ امن و امان تمھیں تو ہو
نثار تم پہ ہیں پروانہ ساں ہزاروں دل | کہ شمع محفل صاحبدلاں یہیں تو ہو
تمھاری قوت باطن سے تقویت ہے مجھے | کہ میری باعث تاب و تواں تمھیں تو ہو
بغیر آپ کے ہوں کیوں نہ جان و دل بے چین | کہ راحت دل و آرام جاں تمھیں تو ہو
ظفر کی چاہیئے نصرت تمھیں نصیر الدین | کہ اس کے یار و مددگار تمھیں تو ہو،

ظفر کو نہ صرف اپنے مرشدوں سے یہ ارادت و عقیدت تھی، بلکہ باکمال صوفیاے کرام سے بھی یہی عقیدتمندانہ غلو تھا حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ایک مخمس لکھکر کہتا ہے،

تم ہوا ے خواجہ معین سروران حق پرست | تم ہو رمز آگاہ کن اور واقف سر الست
تم مددگار ظفر ہو کیوں ظفر کو ہو شکست | پر فلک کی دیکھ گردش کانپتے ہیں پاؤ دست
یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

اسی مخمس میں آگے چل کر لکھتا ہے،

خاک پر سے جو کہ ہل سکتا نہ ہو جوں نقش پا　　تم اٹھاؤ تو وہیں ہو وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا

عیسیٰ جان بخش ہو تم اور خضر رہنما　　دردمندوں کی دوا ہو ناتوانوں کے عصا

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

ظفر نے خود اپنے ہاتھوں پر بھی بیعت لینی شروع کی تھی، قلعہ معلیٰ کے لوگ پھر سرکار کمپنی بہادر کے دیسی سپاہی اس کے حلقہ بگوش تھے، آگے چل کر تصوف کی چاشنی اسقدر بڑھ گئی تھی کہ سعدی کی گلستان کی شرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے خود لکھی، اور اشغال واذکار مین ایک کتاب سراج المعرفت نام مفتی میرلال سے لکھوائی[1]

ظفر کی متصوفانہ طبیعت کے اثرات اسکی شاعری سے بھی ظاہر ہیں، لیکن وہ تصوف کا کوئی فلسفی نہیں، اس لئے خیالات اور مسائل کے اظہار میں تو وہ نکتہ آرائی اور جدت طرازی کرتا ہے اور نہ غالب کی طرح تصوف کے عقدہا ے سربستہ کی تحلیل اور تشریح میں دقیق اور نکتہ آفریں الفاظ استعمال کرکے خیالات کو ادق اور مشکل بنا تا ہے، بلکہ اپنے قلب کے تاثرات اور احساسات کو سیدھے اور سادے الفاظ میں پیش کر دیتا ہے، جن کو پڑھنے کے بعد مفہوم کو سمجھنے کے لئے غور و فکر کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ بے اختیارانہ طور پر اس کے اثرات خود بخود دل پر قائم ہوتے جاتے ہیں، اس کی شاعری مادی خیالات سے ملوث ضرور ہے، عشق مجازی کی تمام کیفیتیں بھی اس پر طاری ہیں، لیکن اس عشق مجازی کی شراب سے اس میں عشق

---

[1] یہ معلومات امیر احمد علوی صاحب بی اے کی کتاب بہادر شاہ ظفر سے لی گئی ہیں، بہادر شاہ ظفر کی ایک اور تالیف موسوم بہ "لغت و اصطلاح دکن" تین جلدوں میں ہے، لیکن یہ مفقود ہے، اس کا اشارہ شرح گلستان سعدی کے دیباچہ میں ہے، شرح گلستان ۱۲۵۹ھ میں مطبع سلطانی دہلی سے شائع ہوئی تھی،

حقیقی کا نشہ پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر اس نشہ کی سرمستی، بے خودی، اور خود فراموشی اس پر اس قدر غالب آجاتی ہے، کہ شعر کہتے کہتے خود اس میں گم ہو جاتا ہے اور بیخود ہو کر کہتا ہے'

مے وحدت کی ہم کو مستی ہے ۔ بت پرستی خدا پرستی ہے،

اس "مے وحدت" کے خمار میں اس کو عالم ناسوت کی تمام چیزیں عالم لاہوت میں نظر آتی ہیں' اور ایک وجدانی کیفیت میں تصور کرتا ہے کہ

شعلہ ہو وہی شمع وہی ماہ وہی ہے ۔ خورشید وہی نور سحر گاہ وہی ہے،
حور و ملک و دیو پری انس و بنی جان ۔ سب صورتوں میں ماہی دلخواہ وہی ہے
یوسف ہو وہی وہی زلیخا وہی یعقوب ۔ کنعان ہے وہی مصر وہی چاہ وہی ہے
رہرو وہی رہبر وہی وہی رہ مقصود ۔ گمراہ وہی راہ سے آگاہ وہی ہے
کیا حسن میں کیا عشق میں سب میں ہے وہی نور ۔ یہ موجب غمزہ سبب آہ وہی ہے
مجنون خراباتی و دیوانہ وہشیار ۔ درویش و گدا شاہ و شہنشاہ وہی ہے

خارا میں شرر ہے وہ ظفر لعل میں وہ رنگ
واللہ وہی سب میں ہے باللہ وہی ہے

اسی کو اپنی ایک فارسی غزل میں کہتا ہے،

اینکہ بینی ہمہ ہا قالب و جان ہمہ اوست ۔ بلکہ ہم قالب و ہم روح روان ہمہ اوست
انچہ بیرون و درون ست ہمانست ہمان ۔ راز فاش ہمہ او ستر نہان ہمہ اوست
در پس پردہ و بے پردہ در آید از دل ۔ بے نشان و سبب نام و نشان ہمہ اوست
نیست دیر و حرم از شیخ و برہمن آباد ۔ ہمہ مہمان و مکینے مکان ہمہ اوست
اے دل آن گوہر یکتا کہ نیرزد بدو کون ۔ چشم بکشا و ببین زیب دکان ہمہ اوست

شعلۂ نارِ جحیم و گل گلزارِ نعیم، یک تجلی است کہ در جلوۂ شان ہمہ اوست

می زند اے ظفر امروز بباغ توحید،

ہمچو بلبل دلِ شوریدہ فغان ہمہ اوست

یہ شاید استاد غالب کے اس سوال کا جواب ہے کہ

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے،

لیکن اس حقیقت مستور کا احساس ہوا تو اس کا مشاہدہ بھی ضروری ہے، تصوف کی راہ میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب کہ طالبِ حقیقت وادی تحیر میں گم ہو کر رہ جاتا ہے،

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر

تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر (غالب)

اور پھر وہ ایسا حیرت زدہ ہو جاتا ہے، کہ ساری حقیقتیں سامنے ہوتی ہیں لیکن وہ دیکھ نہیں سکتا ہے

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے (غالب)

ظفر پر بھی ایسی کیفیت طاری ضرور ہوتی ہے، وہ کہتا ہے،

میں ہوش میں ہوں یارب یا کہ مجھ کو وحشت ہے گہ جوش ہنسی کا ہے گہ گریہ کی شدت ہے،

مجذوب ہوں یا سالک غافل ہوں کہ دیوانہ کیا جانئے میں کیا ہوں اور کیا میری حالت ہے

پھر کہتا ہے:۔

دکھاتا یار ہے ہر رنگ میں جلوہ ہمیں لیکن کہاں سے لائیں وہ آنکھیں کہ جن آنکھوں سے ہم دیکھیں

مگر وہ مشاہدۂ جمال سے محروم نہیں ہوتا ہے، بلکہ حُسنِ عالم افروز اور جمالِ جہان آرا کو دیکھتا ہے،

گہ شعلہ میں گرمی ہو تو گل میں نزاکت ہے ہر شے میں نظر آتی اللہ کی قدرت ہے،

جلوہ تجھے وہ اپنا ہر شے میں دکھاتا ہے پردہ تری آنکھوں کا پر تیری ہی غفلت ہے،

اور جب وہ دیکھ سکتا ہے تو بے خود اور سرمست ہو کر نعرہ زن ہوتا ہے،

ترا حسن ہم جلوہ گر دیکھتے ہیں ، جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں،

کریں کیونکر دل کی نہ ہم پاسداری کہ ہر دل میں ہم تیرا گھر دیکھتے ہیں،

طالب حقیقت جب مطلوب کے دیدار سے شرف اندوز ہوتا ہے، تو اس موقع کی لذت کی کیفیت جو ظفر نے کھینچی ہے . وہ ملاحظہ ہو،

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ خواب تھا کہ خیال تھا

کہو اس تصور یار کو کہوں کیوں نہ خضر خجستہ پے کہ یہی تو دشت فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو دل پہ رنج و ملال ہے وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہے بے وفا وہ ہے پر جفا وہاں لطف کیسا فغاں کہاں فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امر محال تھا

پس پردہ سن کے تری صدا ترا شوق دید جو بڑھ گیا مجھے اضطراب کمال تھا یہی وجد تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھٹ کے جو جست کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی

فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا،

ظفر اس قرب وصال کو اہل تصوف کی طرح ایک راز ضرور سمجھتا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ یہ راز ایسا نہیں جو صرف محدود طبقہ ہی کو معلوم ہو سکے ، خودی کو مٹا کر جس کسی نے دیدۂ بینا، اور دل مصفا اور پھر سرگرمی جستجو اور جوش جنوں پیدا کر لیا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا دل حقیقت آشنا نہ ہو، کتنے سادے الفاظ میں اوس نے حقیقت کے راز کو ہمارے سامنے کھول کر رکھدیا ہے

جو عرش سے ہے فلک تلک سب کچھ اسی میں ہے دیکھو آنکھ کھول کر،

کیا کیا نہیں ہے آئینہ کہ سب کچھ اسی میں ہے — پر چاہیے نظر
دل اپنا پہلے زنگِ کدورت سے صاف کر — مانندِ آئینہ
پھر تو بغور دیکھ کہ اس آرسی میں ہے — کیا حسن جلوہ گر
پیدا نگاہ کر کہ تجلّیِ حسنِ یار — سب جا ہے آشکار
شعلہ سے طور کے نہیں کم روشنی میں ہے — ہر سنگ کا شرر
کیوں کعبہ و کنشت میں سر مارتا ہے تو — سرگرمِ جستجو
تو جس کو ڈھونڈھتا ہے چھپا وہ تجھی میں ہے — پر تو ہے بے خبر
جوشِ بہارِ حسن سے کس گل کو اے صبا — ہے یہ جنون کا جوش
مصروف اسقدر جو گریباں دری میں ہے — ہر غنچہ ہر سحر
ہے دورِ جام و صحبتِ یارانِ زندہ دل — کیفیتِ حباب
کچھ ہے اگر مزا تو یہی زندگی میں ہے — باقی ہے دردِ سر
اے خود پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ — ہے وہ بہت قریب
گم کردہ راہ آپ تو اپنی خودی میں ہے — اس سے ہے دور تر
صد داغ سوزِ عشق سے کھا بلکہ صد ہزار — ہر داغ دل پہ تو
لذت تجھے نصیب اگر عاشقی میں ہے — اے سوختہ جگر
افشائے رازِ عشق نہ کر کہکے جی کی بات — پردہ ہی خوب ہے
جی ہی میں اپنے رہنے دے جو کچھ کہ جی میں ہے — خاموش اے ظفر

ظفر کا خیال ہے کہ حقیقت مستور نہیں، ہم اس کو دیکھتے نہیں محض اس لئے کہ ہماری آنکھوں پر خودی اور نفس کا پردہ پڑا ہے، اگر یہ پردہ ہٹ جائے تو تمام رموزِ سربستہ اور اسرارِ پوشیدہ ظاہر

ہو جائیں، اور دل انوار الٰہی کا مظہر بن جائے، پھر ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی تفاوت باقی نہ رہی اسی کو واضح کر کے کہتا ہے، ؎

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

ایک جگہ اور کہتا ہے،

اگر ہے دیکھنا اس کو اٹھا دے اپنی ہستی کو اگر تجھ میں اور اس میں پردہ حائل ہی تو بس یہ ہی

پھر کہتا ہے،

ہر جائے ہے قدرت کا تماشا مرے آگے لیکن مری غفلت کا ہے پردہ مرے آگے

اب اس کے لئے ظفر کے یہاں عرفی کی طرح شعار ملت اسلامیان[1] چھوڑنے اور نہ غالب کی طرح رسوم و قیود کے ترک کرنے[2]، اور نہ عام صوفیوں کی طرح حال و قال اور مقام و قیام پر پابند ہونے کی ضرورت ہے، ظفر کے نزدیک تصوف کی راہیں پیچ در پیچ نہیں،

راہیں ہیں دو مجاز و حقیقت ہی جن کا نام رستے نہیں ہیں عشق کی منزل کے چار پانچ

چنانچہ اس کے یہاں انوار معرفت حاصل ہوتے ہیں تو اس طرح کہ

پردہ دوئی کا بیچ میں حائل اگر نہ ہو
کیجے جدھر نگہ وہی پیش نگاہ ہے، (باقی)

---

[1] عرفی نے کہا ہے،

شعار ملت اسلامیان بگذار اگر خواہی کہ در دیر مغاں آئی و اسرار نہاں بینی

[2] مرزا غالب کہتے ہیں،

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزای ایمان ہو گئیں

بنگال کی علمی سعی وجہد

اور

تعلیمی رفتار پر اہم تبصرہ

از

جناب مولینا عبد الرب صاحب ہاشمی سلہٹی (فاضل دیوبند)

"یہ مضمون زمیندار کے بنگال نمبر میں شائع ہوا ہے، مضمون کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ حلقہ تک پہنچایا جائے، اس لئے اس کو معارف میں شائع کیا جارہا ہے، یہ اس صوبہ کا حال ہے، جہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ہے"

(معارف)

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط ہونے سے قبل صوبہ بنگال کی تعلیمی و اقتصادی حالت جیسی بھی تھی، اسے ہمیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لہذا یہاں صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری سے مابعد کے احوال پر بحث ہوگی، نیز بنگال و آسام اگرچہ علٰحدہ علٰحدہ دو صوبے ہیں، مگر مغربی آسام یعنی "سورماویلی" اور بنگال کی تہذیب و تمدن یک ہی ہے، لہذا لفظ بنگال سے "سورماویلی" (آسام) اور بنگال دونوں سمجھنا چاہئے، بنگال کی تعلیم تین قسموں پر تقسیم کیجا سکتی ہے (۱) بنگلہ تعلیم (۲) انگریزی تعلیم (۳) عربی تعلیم، ان میں سے ہر ایک پر علٰحدہ علٰحدہ تفصیل سے بحث کیجاتی ہے،

صوبہ بنگال کی بنگلہ تعلیم لفظ بنگلہ کا اطلاق اس وقت تین زبانوں پر ہونے لگا ہے، بنگالی بولی، پرانی

بنگلہ نئی بنگلہ (یا اصلی بنگلہ) لہذا پہلے ان تینون پر تبصرہ ہونا چاہئے، تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو،

بنگالی بولی | اکثر ممالک اور خود ہندوستان کے اکثر صوبجات میں یہ دیکھا گیا ہے، کہ جو زبان ان کے روزمرہ کے باہمی معاملات میں مستعمل ہوتی ہے، وہی انکے لکھنے پڑھنے کی زبان بھی ہوتی ہے، مگر بدقسمتی سے یہاں لکھنے پڑھنے کی زبان اور ہے، اور بول چال کی اور، پھر بولیوں میں باہم اس قدر اختلاف ہے، کہ شاید ہی کسی اور خطہ میں ہو، ضلع سلہٹ اور ضلع کچھاڑ کی بولی اور ہے اور باقی اضلاع کی اور، اسی طرح میمن سنگہ کی بولی الگ ہے، اور کمرلا اور ڈھاکہ کی الگ الگ، کلکتہ اور ندیا شانتی پور کی بولی ایک اور رنگ اپنے اندر رکھتی ہے، اسی طرح تقریباً تمام اضلاع کی بولیاں الگ الگ نوعیت کی ہین، الگ الگ لب ولہجہ کی ہیں، اور پھر اکثر اضلاع ایسے ہیں، جن مین تین تین چار چار مختلف لب ولہجہ کی بولیان ہیں، مگر اسلام آباد (چاٹگام) اور برما کی بولی، اس طرح ان تمام بولیون سے مختلف اور اجنبی ہے، کہ خود بنگال کے دیگر اضلاع کے باشندے اسے بالکل نہیں سمجھ سکتے، کاتب الحروف کو جب جب ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، تو اردو میں یا پرانی بنگلہ مین گفتگو کی ہے،

یہ ضلع وار بولیان لکھنے پڑھنے کی نہیں ہیں، ہان ندیا شانتی پوری بولی کچھ مہذب و شایستہ ہونے کی وجہ سے آج کل تحریر و تقریر میں آنے لگی ہے، بنگال کے بعض مقامات میں اردو بھی بولی جاتی ہے، اور سمجھتے تو ہر جگہ کے لوگ ہیں،

پرانی بنگلہ | پرانی بنگلہ کے ساتھ اُس کے نام رکھنے میں بڑا ظلم کیا گیا ہے، اس کا نام "اصلی بنگلہ" ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ یہی وہ زبان ہے، جو ہندو مسلم اتحاد اور ملاپ سے پیدا ہوئی تھی یعنی جس طرح ہندو مسلم ملاپ سے شمالی ہند میں اردو جیسی ہمہ گیر اور فصیح و بلیغ زبان کی بنیاد پڑی تھی، بعینہٖ اسی طرح بنگال میں ہندو مسلم میل جول سے "پرانی بنگلہ" کی بنیاد پڑی تھی، اس کے اکثر الفاظ فارسی اور عربی

کے ہیں، اور باقی سنسکرت کے، یہ زبان نہایت سہل الفہم ہونے کے ساتھ ساتھ فصیح اور بلیغ ہے، اگرچہ اردو کی جیسی سلاست اس میں نہیں ہے، تاہم "نئی بنگلہ" کی نسبت ہزار گونہ سلاست وروانی اپنے اندر رکھتی ہے، اس میں بڑی بڑی تاریخی، اصلاحی اور اقتصادی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر منثور کی نسبت اکثر تصانیف منظوم ہین، جو اس قدر دلکش اور پُر کیف انداز میں لکھی گئی ہیں، کہ ایک کتاب کو شروع کر لینے کے بعد آخر تک پہنچانے پر انسان مجبور ہوتا ہے، یہ زبان اس قدر عام فہم ہے، کہ معمولی ان پڑھ آدمی بھی صرف حروف کے پہچان لینے کے بعد بآسانی اس میں لکھ پڑھ سکتا ہے، اور اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہے، کہ پورے بنگال میں وہ سمجھی جاتی اور بولی بھی جاسکتی ہے،

نئی بنگلہ (یا اصلی بنگلہ) جس بنگلہ زبان کو ہمارے ہندوستانی اصلی بنگلہ کہتے ہیں، اور اسکولون میں جس کی تعلیم دیجاتی ہے، وہ اصل میں سنسکرت کی اولاد میں اس کی "سب سے بڑی صاحبزادی" ہے، مگر سخت و دشوار ہونے میں یہ کسی طرح بھی اپنی مادر محترمہ سے کم نہیں، نیز جس طرح سنسکرت دنیا کے کسی خطہ کی انسانی بولی نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح بنگلہ بھی بنگال کے کسی علاقہ میں روزمرہ کے باہمی معاملات اور گفتگو میں استعمال نہین کیجاتی، صرف اسکولوں کی چار دیواریوں کے اندر اور پنڈتوں کی ہی پوتھی میں پائی جاتی ہے، اور اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے، کہ جب کوئی لکچرار صاحب کسی پبلک جلسہ یا جلوس میں بزبان نئی بنگلہ تقریر کرتے ہوتے ہیں، تو خدا جانتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے کسی کانگریسی جلسہ میں کوئی مہا بھائی ہندو تقریر کر رہا ہے اور بلا لحاظ ترتیب الفاظ و ترتیب معانی سنسکرت کے بے جوڑ الفاظ تقریر کے درمیان میں ٹھوس رہا ہے، اور سامعین خواہ مخواہ اسے تبرک سمجھ کر سُن رہے ہیں، اور دل کو یہ کہکر تسلی دے رہے ہیں کہ تقریر تو آخر آزادی ہند ہی پر ہوگی،

اب جب کہ تینوں زبانوں کا حال قدرے معلوم ہوگیا، تو اس کی تعلیم کی طرف رجوع کرنا

چاہئے، انگریزون نے جب بنگال میں انگریزی تعلیم کیساتھ بنگال کی مادری زبان میں بھی تعلیم دینے کو منظور کیا، اور ابتدائی تعلیم کے لئے چار سال کا نصاب اور اعلیٰ تعلیم کے لئے چار سال یا تین سال کا نصاب مقرر ہوا، تو چونکہ صوبہ بنگال کی مادری زبان یعنی بنگالی بولی لکھنے پڑھنے کی زبان نہ ہونے کیساتھ ساتھ ہمہ گیر و جامع بھی نہیں تھی، لہذا پرانی بنگلہ ہی کو یہ شرف نصیب ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ یہی ہندو مسلم مشترکہ زبان ہے، اور اسکولوں میں جیسے ہندوؤں کے بچے تعلیم پائین گے ویسے مسلمان بچے بھی تعلیم پائیں گے، بلکہ مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے مسلم بچوں کی بھی اکثریت ہوگی، مگر ایک طرف انگریزون کی ہندو نواز پالیسی تھی، کہ وہ پاٹ شالے جو مدتوں سے صرف ہندوؤں کی خاص مذہبی درسگاہیں تھیں، اور جن میں صرف سنسکرت کی مذہبی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، ان کو ہندو مسلم مشترکہ درسگاہیں بنانا شروع کر دیا اور ہندوون نے بھی اسکو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے مذہبی پاٹ شالوں کو سرکاری پاٹ شالوں میں تبدیل کرانا شروع کر دیا،

دوسری طرف کچھ مسلمانون کی بے توجہی تھی، کہ اس موقع پر انھوں نے کوئی مؤثر کارروائی بھی نہیں کی، بلکہ انگریزی تعلیم کی طرح اس سے بھی کنارہ کش رہے، اور ان کے پاس معقول وجہ بھی تھی، اس لئے کہ وہ ہندؤن کی ایک مذہبی زبان کو کس طرح اختیار کر سکتے تھے، مگر ہندوؤں کا تعصب اور ان کی تنگ نظری ملاحظہ فرمائیے، کہ بجائے اس کے کہ اپنے برادران وطن کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے، اور مشترکہ زبان (پرانی بنگلہ) کو اسکولوں میں رائج کرنے کے ہم خیال ہوتے، اسلئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر خوب جی کھول کر اپنے تعصب اور مذہبی دیوانگی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا، اور ان اسکولوں کے لئے جو کتابیں تصنیف کیجانے لگین، ان میں زبردستی سنسکرت کے نامانوس الفاظ ٹھونسنے لگے، اور فارسی وعربی کے الفاظ کو نکال باہر کرنا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگلہ تعلیم سے مسلمانون کا تنفر اور بڑھتا گیا، ادھر ہندوؤن کا ادر محکموں کی نسبت محکمۂ تعلیم پر پورا قبضہ ہوگیا، اور اس عرصہ

میں انھوں نے میدان خالی پاکر سنسکرت کی ترویج میں خوب ہاتھ پاؤں مارے، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں سنسکرت کی ایک اور لڑکی نے جنم لیکر شہرت حاصل کی جس کو مشکل اور دشوار ہونے میں سنسکرت کی بڑی صاجزادی کہنا بالکل موزون ہے، مگر تعصب کی حد ہوگئی، کہ اب ہمارے ہندو بھائی اس کو اصلی بنگلہ کہکر اپنی ہندو ذہنیت کا پورا پورا ثبوت دیتے ہیں،

بنگلہ کے ذریعہ ہندو تہذیب کا پرچار

صرف یہی نہیں کہ ہندؤوں نے فقط سنسکرت کا رواج دیا، بلکہ اس عرصہ میں اس زبان کے ذریعہ ہندو تہذیب، ہندو کلچر اور ہندو مذہب کے پھیلانے مین کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ہندو دیوتاؤں اور راجاؤں کی جھوٹی تعریفون کے پل باندھ کر اسکولون کی کتابون میں لکھی گئیں، ان کی زندگی کے کارنامے رتل سے تال بنا کر لکھے گئے، ہندو مسلمانوں میں ناچاقی اور عداوت پھیلانے کے لئے سلاطین اسلام کو لیٹرے اور ڈکیت ثابت کرنے کی ناجائز اور ناکام کوششیں کی گئین، ہندوؤن کے احسانات مسلمانوں پر اور ان کے بدلہ میں مسلمانوں کی نمک حرامی اور غداریان دکھلائی گئین، کبھی کبھی مسلمان بادشاہون اور مذہبی راہنماؤں کی سخت توہین کی جاتی تھی جس سے مسلمانون کا قلب اس بُری طرح مجروح ہوتا تھا، کہ وہ ہر امکانی صورت سے اس کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر مجبور ہوجاتے تھے جس سے آپس میں جھگڑے اور فساد کی خلیج وسیع ہوتی جاتی تھی، اور تیسری اجنبی قوم کی قوت میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا، مسلمانوں کا یہ حال مدتون رہا، اب کوئی نصف صدی سے مسلمانوں نے بنگلہ تعلیم کی طرف پھر رُخ کیا ہے، جس کی اصلی وجہ یہ تھی، کہ انگریزی تعلیم کے ابتدائی درجوں میں بنگلہ کی اعلیٰ تعلیم لازمی ہے، اب اگر پاٹ شالوں سے سرٹیفکٹ حاصل نہ کئے جائین، تو انگریزی اسکولوں میں داخل ہونا دشوار ہے،

علاوہ ازین حکومت کی ہندو نواز پالیسی سے یہ زبان سرکاری اور دفتری تسلیم کر لی گئی تھی لہذا طوعاً وکرہاً بنگلہ کی طرف رُخ کرنا ہی پڑا، مگر اب کیا ہوتا جب چڑیا چک گئی کھیت، تاہم مسلمانون

نے مختلف اوقات مین مذکورۂ بالا گندگیون کے خلاف طرح طرح کے احتجاجات کئے، مگر پھر بھی ابھی
تک اسکولوں میں ایسی کتابیں داخل درس رہتی ہیں جن میں مذکورۂ بالا گندگیان بعینہٖ پہلے کی طرح
باقی ہیں، یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، تاہم اسکول میں مسلمان بچون
کی تعداد ۲۰ یا ۲۵ فیصدی سے متجاوز نہ ہوسکی،

بنگلہ تعلیم کی ایک اور خرابی موجودہ بنگلہ کی جہان اور خرابیان ہیں، وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس کی تحصیل
میں کم از کم آٹھ سال صرف ہوتے ہیں، اور پھر اس کے بعد کچھ حاصل بھی نہیں اگر طالب علم خوش نصیب ہوا
تو پاٹ شالوں میں دس بارہ روپیہ کی ملازمت مل گئی، یا پٹواری گیری یا اسی قسم کی اور کوئی ملازمت
اور بس، ورنہ بیکاری ہی زیادہ ہوتی ہے،

اصلاح کیونکر ہوسکتی ہو آج چند سال سے مسلمانانِ بنگال کا ایک طبقہ پھر بیدار ہوا ہے، اور "پرانی
بنگلہ" کی طرف مسلمانون کی توجہ مبذول کرا رہا ہے، مگر افسوس! معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلمانون
میں احساس خودداری پیدا نہیں ہوا، چنانچہ اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے بہت کم لوگ
نظر آتے ہیں، ضرورت ہے کہ سب متحد و متفق ہو کر اس تحریک کو کامیاب بنائیں، اور حکومت
کو نئی بنگلہ کے بدلنے پر مجبور کریں، نیز ہندو مسلم اتحاد کے دم بھرنے والے ہندو بھائیون کو بھی
چاہئے، کہ وہ تعصب و تنگ نظری کے پردوں کو آنکھوں سے ہٹا کر دیکھیں، کہ ہندو مسلم
اتحاد "پرانی بنگلہ" کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتا، نئی بنگلہ تو خالص ہندوؤن
کی مذہبی زبان ہے۔

میرے نزدیک اصلاح کی سب سے بہتر اور کارآمد تدبیر یہ ہے کہ خذ ما بالموت حتی
یرضی بالحمی کے اصول پر عمل کیا جائے، اور میں نے چند اصحاب سے اس کا استصواب بھی کیا ہے
وہ اس طرح ہے، کہ مسلمانان بنگال خوب تندہی کیساتھ اردو کی ترویج و اشاعت میں لگ جائیں

اردو میں اخبارات و رسائل شائع کرنا شروع کریں، لائبریریاں قائم کرکے اردو اخبارات اور رسائل منگوا کر پبلک کو مطالعہ کے لئے دیئے جائیں، ترقی اردو کی انجمنیں قائم کریں وغیرہ وغیرہ، میرے اصحاب اگر میری مساعدت کریں، تو خدا پر بھروسہ کرکے میرا ایک اخبار شائع کرنے کا ارادہ ہے، جس پر میں بہت دنوں سے غور کر رہا ہوں، اس تدبیر کو کامیاب بنانے کے لئے ہمارے علمائے کرام کی توجہ کی سخت ضرورت ہے، یہ خود اخبارات کا مطالعہ ہمیشہ کریں، دوسروں کو اس کی طرف توجہ دلائیں، نیز مدارس عربیہ میں اردو کی تعلیم کی طرف خاص توجہ کیجائے،

انگریزی تعلیم مسلمانانِ ہند اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھے، کہ انگریزی تعلیم ہندوستان کی غلامی کی رسی کو اور مضبوط کرنے اور عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پھیلائی جارہی ہے، چنانچہ ان کے اس دوسرے منصوبہ کو یہ چیز واضح کر دیتی ہے کہ جب انگلستان میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے مسئلہ پر ۱۸۲۹ء یا ۱۸۳۰ء میں بعہد گورنری لارڈ ولیم بنٹنگ غور کیا گیا تو دو رائیں پیش ہوئیں، ایک یہ کہ عربی اور سنسکرت کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے، دوسری یہ کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے، آخری رای کی منظوری صرف اس لئے ہوئی، کہ عیسائی پادریوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ انگریزی زبان تبلیغ عیسائیت کیلئے مؤید و معاون ثابت ہوگی، چنانچہ اسی چیز کے پیش نظر علمائے اسلام نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ بھی دیا تھا، اور اسی انجام کی طرف نظر کرکے جس طرح تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم سے بے توجہی کی تھی، اسی طرح مسلمانانِ بنگال نے بھی، مگر یہ ذرا سب سے چند قدم آگے تھے، اسلئے کہ کچھ تو علما کے فتوی کا اثر ان پر زیادہ تھا اور کچھ اس لئے کہ انگریزی ابتدائی تعلیم کے ساتھ بنگلہ کی اعلی تعلیم لازمی ہے، ساتھ ساتھ حکومت نے بھی ہندو نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے، بنگال کے مشرقی اضلاع میں جہاں مسلم آبادی ۸۰ اور ۹۰ کے درمیان ہے تعلیم کو عام کرنے میں بہت کم توجہ کی،

انگریزی تعلیم سے بے توجہی کے وجوہ مذکورۂ بالا وجوہ کے ساتھ ایک معقول وجہ یہ بھی تھی، کہ انگریزی تعلیم

حقیقت میں کوئی سچی تعلیم نہیں ہے، اس لئے کہ کسی اجنبی زبان یا لغت کے سیکھنے کی غرض یہ ہوتی ہے، کہ اس زبان میں کچھ علوم ہیں، جو اس کے ذریعہ حاصل کئے جائیں، کچھ صنعت وحرفت ہیں جو اس زبان کے توسط سے سیکھی جائیں، تاکہ انسان اپنی سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی ضروریات میں خود اپنا پروگرام مرتب کر سکے محض زبان کا سیکھنا مقصود بالذات نہیں ہوتا، بلکہ زبان دوسری چیزوں کے حصول کے لئے آلہ اور ذریعہ بنتی ہے، مگر انگریزی تعلیم تو صرف زبان ہی کو سکھاتی ہے، اور زیادہ سے زیادہ نوکری وملازمت کے چند طریقے، جس کا دوسرا نام "غلامی" ہے، اب وہ مسلمان جنھوں نے آٹھ سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی ہے، اور ابھی ان کے دماغوں میں اسکی حرارت اور تمازت باقی ہے، وہ کہاں اس چیز کو برداشت کر سکتے تھے، کہ اجنبی تاجروں کے چند ٹکڑوں پر صرف ان کے کرایہ کے ٹٹو بنے رہیں،

مگر ان سب سے معقول اور زبردست وجہ یہ تھی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ یورپ کی تہذیب اور مغربی کلچر کا ہندوستان پر حاوی ہوجانا لازمی تھا، اور ساتھ ساتھ یورپ کی فضا سے دہریت اور لامذہبیت کا جو سیلاب چلا آرہا تھا، اس میں ہندوستانیوں کا بہہ جانا ایک لابدی امر تھا، درانحالیکہ عمر اور دیگر ایسے چند قیود کی وجہ سے انگریزی تعلیم میں جانے سے پہلے چھوٹی عمر میں مذہبی امور سے واقف ہوجانا اور پھر انگریزی پڑھنا غیر ممکن ہوگیا تھا، چنانچہ آخر میں ایسا ہی ہوا، بچے ابتدا ہی سے عقائد اسلام اور احکام شریعت سے واقف ہوئے بغیر انگریزی تعلیم میں لگ گئے، اور شروع ہی سے ان کے دماغوں کے اندر دہریت ونیچریت کے جراثیم مرکوز کر دیئے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان ہی نام نہاد مسلمان نوجوانوں نے مذہب اور خصوصاً اسلام کے خلاف ایک عالمگیر جنگ چھیڑ رکھی ہے، اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے، ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

دوسرے موقعہ پر ارشاد ہوتا ہے، ؎

ہم سمجھتے تھے، کہ لائیگی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ الحاد بھی آجائے گا، (؟)

غرض ان سب وجوہ کی بنا پر مسلمانون نے مدتوں انگریزی تعلیم سے کنارہ کشی کی، شاذونادر جو کوئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہو جاتا تھا، تو وہ قوم وملت کے نزدیک ذلیل وحقیر سمجھا جاتا تھا،

اب اس بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازمتیں اور عہدے سب ہندؤں کو ملنے لگے، تمام سرکاری محکموں پر ہندؤوں کا قبضہ ہوگیا اور مسلمان ہاتھ ملتے ہوئے رہ گئے، ادھر مسلمان محتاج ومفلس بھی ہونے لگے، چنانچہ اسی طرح ایک مدت تک حیران وسرگرداں رہنے کے بعد پھر بنگلہ کی طرح انگریزی کو بھی تقریبًا نصف صدی سے قبول کرنا شروع کیا، اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی تعلیم کی موجودہ اسکیم کے خلاف احتجاجات بھی کئے چنانچہ حکومت نے "نیو اسکیم" کے نام سے انگریزی تعلیم کا ایک جدید نصاب مرتب کیا، جس میں عربی کی مختصر چند کتابیں بھی رکھی گئیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ "اولڈ اسکیم" کے مذکورہ بالا عیوب کل کے کل اس اسکیم میں بھی موجود ہین،

فی الحال کالجون اور یونیورسٹیون میں مسلمان لڑکے فی صدی ۴۰ اور ۴۵ کے درمیان ہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانان بنگال ابھی تک تعلیم میں بہت پیچھے ہیں، علاوہ ازین ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کی طرف اس وقت رُخ کیا، جب کہ برادرانِ وطن نے تمام محکموں کی ملازمتوں کو پُر کر دیا تھا، اب جو مسلمان تعلیم یافتہ ہوئے، تو چونکہ طریقۂ ملازمت کے سوا کچھ اور سکھایا نہیں جاتا، اس لئے بیکار بھی مسلمان زیادہ ہوئے، یعنی مسلمان اکثریت کیساتھ ان پڑھ بھی ہیں، اور اکثریت کیساتھ تعلیم یافتہ بیکار بھی،

عربی تعلیم صوبہ بنگال میں عربی تعلیم کے دو نصاب رائج ہیں، ایک مشہور درس نظامی، اور دوسرا مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے سلسلہ کا نصاب، ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری کے زمانہ میں کمپنی کے دفاتر میں محررین

کی ضرورت پڑتی تھی، اس لئے کچھ تو مسلمانوں کو اس کے ذریعہ پھنسانے کے لئے اور کچھ اپنی ضرورت دفع کرنے کے لئے عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی، جس کی شاخیں سلہٹ وغیرہ دیگر مقامات میں بھی قائم ہوگئیں،

اسکا نصاب سولہ سترہ سال کا ہے جس میں عربی و فارسی کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اور جو فارسی پڑھنا نہیں چاہتا، اسکو انگریزی لینے کا اختیار رہتا ہے، اسکی ابتدائی تعلیم کا نصاب قدرے تغیر کے ساتھ درس نظامیہ کے نصاب کی طرح ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا، درجات اوسط میں فقہ، اصول فقہ، بلاغت، فلسفہ، منطق، نحو، صرف، حدیث، تفسیر اور عقائد وغیرہ کی کتابوں کے خاص خاص حصے شامل ہیں، دو ایک کتابوں کے علاوہ کوئی بھی پوری کتاب نصاب میں داخل نہیں ہے، اور جتنے حصے داخل ہیں وہ بھی کامل پڑھائے نہیں جاتے ہیں خصوصاً علم فقہ کے ساتھ سخت ظلم کیا گیا ہے، اس کے مخصوص ابواب صوم وصلوٰۃ وغیرہ کے علاوہ کتاب الجہاد وغیرہ نہیں پڑھائی جاتی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان ابواب کے پڑھنے سے لڑکوں میں سچے اسلامی جذبات کے متحرک ہونے کا اندیشہ ہے،

اعلیٰ تعلیم کے لئے ٹائٹل کورس کھولا گیا ہے جس میں دو سال کا نصاب ہے، ہر سال اس میں کافی تعداد میں طلبہ پڑھتے ہیں، ٹائٹل کورس پہلے صرف کلکتہ ہی میں تھا، اب چند سال سے دیورائل (سلہٹ کا ایک علاقہ) میں بھی جاری ہوا ہے، اور اب کے آئین جدید کے نصاب کے بعد آسام کا جو پہلا کابینہ وزارت بنا تھا، اس میں شمس العلما، مولینا ابونصر وحید صاحب وزیر تعلیم مقرر ہوئے تھے، انکی کوششوں سے سلہٹ شہر میں بھی ٹائٹل کورس جاری ہوگیا ہے،

ٹائٹل میں خاص طور سے تاریخ اور حدیث پڑھائی جاتی ہے، مگر حدیث کے لئے صحاح ستہ کے معدودے چند ابواب منتخب کر لئے گئے ہیں، اور کتاب الجہاد وغیرہ کو یہاں بھی نظرانداز کر دیا گیا ہے، جس طرح علمانے انگریزی اور بنگلہ تعلیم کو ناجائز قرار دیا، اسی طرح حکومت کے مدارس میں بھی تعلیم

حاصل کرنے کو ناجائز سمجھا، اس لئے کہ ان مدارس سے اکثر شمس العلما، اور فخر المحدثین وغیرہ خطابات لیکر نکلتے ہیں، اور برٹش ایمپائر کے حامی بن کر اس کو ظل اللہ اور خدا جانے کیا کیا ثابت کرکے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیتے ہیں، ہاں ان میں بعض قابل تعریف شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں، جو شاذ و نادر ہیں،

اور پھر اب تو دفتری زبان بنگلہ اور انگریزی میں تبدیل ہو گئی ہے، جس کے بعد ان مدارس کے فضلا کو موقع ملازمت نہیں ملتی ......

درس نظامی | مسلمانان بنگال انگریزی اور بنگلہ تعلیم سے کنارہ کش ہو کر خاموش نہیں بیٹھے رہے، بلکہ اپنے علماے کرام کی سرکردگی میں جگہ جگہ قومی عربی مدارس قائم کرنا شروع کر دیئے، کچھ مدارس تو شاہی زمانہ سے تھے ہی، اب ان میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا، چنانچہ مشرقی بنگال کے اضلاع سلہٹ، کچھار، میمن سنگھ، ڈھاکہ، کمرلا، اسلام آباد (چاٹگام)، نواکھالی وغیرہ کے قصبہ قصبہ، قریہ قریہ میں مدرسے قائم ہو گئے، اس کا اندازہ اس چیز سے ہو سکتا ہے کہ سلہٹ کا ایک چھوٹا سا علاقہ بہتہ کے نام سے مشہور ہے، جو ایک چھوٹے سے قصبہ اور چند پرگنوں پر مشتمل ہے، فی الحال اس میں ابتدائی و متوسط تعلیم کے بیسیوں مدارس ہیں، جن میں ۵۰ سے ۱۰۰ تک طلبہ تعلیم پاتے ہیں، اور چھ مدارس عالیہ ہیں، جن میں اعلیٰ تعلیم اور بعض میں دورۂ حدیث کا بھی اچھا انتظام ہے، اور ہر ایک میں ۲۰۰ سے ۵۰۰ تک طلبہ تعلیم پاتے ہیں، اسی طرح ضلع اسلام آباد میں بمقام ہاٹہزاری ضلع رنگپور میں بمقام سید پور اور ڈھاکہ خاص، اور دیگر مقامات میں دورۂ حدیث کا اعلیٰ پیمانہ پر اہتمام ہو گیا ہے، مگر افسوس کہ مغربی بنگال میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں،

یہ مدارس قومی چندوں پر چلتے ہیں، بعض مقامات میں مٹھی کا بھی ایک خاص انتظام ہے، یعنی ہر گھر میں کھانا پکاتے وقت اپنی معینہ مقدار میں سے ایک مٹھی چاول ہر وقت علحدہ کرکے مدرسہ کے لئے رکھ دیا جاتا ہے، اور کسی مقررہ تاریخ پر مدرسہ کے محصلین اکر اُسے لیجاتے ہیں،

مدارس میں جو طلبہ تعلیم پاتے ہیں، ان کے قیام و طعام کی ذمہ داری مدرسہ کے قرب و جوار کے مسلمانوں پر ہوتی ہے، ہر وہ گھرانہ جو محنت و مزدوری کرکے خود کھا سکتا ہو، اپنے مکان میں ایک جگہ طالب علم کے لئے خالی کر دیتا ہے، اور وہی اسکے طعام کا بھی کفیل ہوتا ہے،

ان میں جو مدرسین درس دیتے ہیں، ان کو نہایت چھوٹی چھوٹی تنخواہیں ملتی ہیں، مثلاً بہت سے صرف پانچ چھ روپیے پر قناعت کرکے تعلیمی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں، اور جہاں کچھ بہتر انتظام ہے، وہاں زیادہ سے زیادہ تیس پچیس روپے کے وظیفے ملا کرتے ہیں، حالانکہ ان میں اکثر اعلیٰ قابلیتوں کے مالک ہوتے ہیں، اور اگر کبھی قحط سالی وغیرہ کی وجہ سے چندے وصول نہیں ہوئے تو مہینوں بلا تنخواہ پڑھاتے رہتے ہیں،

مدارس کے ذریعہ دیہات کی اصلاح

صرف یہی نہیں کہ مشرقی بنگال میں مدارس ہی کثرت سے قائم ہوئے بلکہ ان مدارس کے ذریعہ ان اضلاع کے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اس قدر ہوئی کہ دیہاتوں کے مسلمان تک احکام شریعت سے واقف ہو کر صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوئے اس کا صحیح اندازہ حضرت شیخ الہند مولانا مدنی مدظلہ کے ایک بیان سے ہو سکتا ہے، آپ دیوبند کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "سلہٹ کے ایک علاقہ کا نام جہتہ ہے، وہاں کے مسلمان اس قدر متقی و پرہیز گار ہیں، کہ ان میں سے فی ہزار ایک بھی بے نمازی نکالنا مشکل ہے، یہ ایک خدا کی دین ہے، جو ہر خطہ کو نصیب نہیں ہوتی، یہ چیز موجودہ دور میں نہ مکہ میں پائی جاتی ہے نہ مدینہ میں" الخ مگر افسوس کہ مغربی بنگال کے دیہاتی مسلمانوں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے جو آئندہ بیان ہوگی،

مگر ایک چیز آج چند سال سے وبا کی طرح پھیل رہی ہے، کہ حکومت ان قومی مدارس کی مالی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر آہستہ آہستہ ان پر اپنا قبضہ جما رہی ہے، بعض مدارس کو بالکل

سرکاری بناکر اس کے نصاب کو بدل کر "ضغث علیٰ ابالہ" کے مصداق بنا دیا ہے، اور بعض کیلئے قدرے امداد منظور کر کے زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے رہی ہے، مسلمانوں کو بیدار ہو کر قومی مدارس کی مالی حالتوں کو درست کرنا چاہئے، اور حکومت کے دسترس سے ان کو محفوظ رکھنا چاہئے،

دیہات میں مکاتب مشرقی بنگال کے اضلاع میں جسطرح عربی تعلیم کے مدارس کثرت سے قائم ہوئے ویسے ہی بچوں کی تربیت کے لئے مکاتب بھی کثرت سے قائم ہوئے، چنانچہ دیہات کی تقریباً ہر مسجد میں ایک ایک مکتب قائم ہے جس میں اس گاؤں کے بچے قرآن اور ضروری ایک دو کتابیں بھی پڑھتے ہیں، نماز روزہ کے مسائل اور انکے طریقے سیکھتے ہیں، اکثر یہ خدمت ائمہ مساجد انجام دیتے ہیں، مگر حفظ قرآن کی طرف مسلمانان بنگال نے بہت ہی کم توجہ کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں اب حفظ قرآن کے مدارس قائم ہوئے ہیں، تاہم جیسے اسکی ضرورت ہے ویسے ہرگز نہیں، علمائے کرام کو اسکی طرف بہت جلد توجہ کرنی چاہئے،

درس نظامی کا نصاب پہلے پہل بنگال میں صرف ابتدائی و متوسط تعلیم کا بندوبست تھا جس کے لئے درس نظامی کا دس سالہ نصاب تھا جن میں فارسی اور عربی کی کتابیں، صرف، نحو، فقہ، اصول فقہ، منطق، عربی ادب فارسی وغیرہ وغیرہ فنون پڑھائے جاتے تھے، چونکہ اس نصاب کی ابتدا شاہی زمانہ سے ہوئی اور اس زمانہ میں دفتری زبان فارسی تھی، اس لئے نصاب میں فارسی ادب پر بہت زور دیا گیا ہے، اور بہت سی غیر مفید کتابیں بھی اس میں داخل ہیں، پھر جب انگریزوں کی عملداری میں دفتری زبان بنگلہ اور انگریزی میں تبدیل ہوگئی، تو یہ نصاب اور بھی بیکار ہوگیا، اسلئے کہ فارسی میں اسلامی کتابیں بھی زیادہ نہیں ہیں، اور جو دو ایک کتابیں ہیں، ان کے لئے دوسری ضروریات کو چھوڑ کر فارسی کی اعلیٰ تعلیم میں پانچ چھ سال ضائع کرنے کی ضرورت کیا ہے، زبان سے قدرے واقفیت حاصل ہو جانی کافی ہے، مگر اس کے باوجود بھی یہ نصاب نویں صدی کی ابتدا تک تقریباً تمام مدارس میں رائج رہا، ہاں اس کے بعد بعض مدارس کے ارباب حل وعقد کی آنکھیں کھلیں، اور

انھون نے بعض جدتین کین، چنانچہ بعض مدارس سے فارسی کی غیر ضروری کتابین نکال دی گئیں، اور ان کی جگہ دوسری مفید کتابیں داخل کردی گئیں، نیز عربی کی غیر مفید کتابین بھی بعض مدارس سے خارج کردی گئین اور بعض مدارس میں بنگلا و انگریزی بھی داخل نصاب کردی گئین، بعض مدارس نے دار العلوم دیوبند کے نصاب کی تقلید کی، مگر پھر بھی بعض مدارس میں درس نظامی کے نصاب کو متبرک سمجھ کر باقی رکھا گیا ہے، علاوہ ازین باوجود اصلاح کے تمام مدارس میں حسب ذیل چند اصولی خرابیان موجود ہیں، جن کی اصلاح کی بے حد ضرورت ہے،

عربی تعلیم میں پہلی اصولی خرابی ایک بنیادی خرابی تو عربی تعلیم مین یہ ہے، کہ نصاب تعلیم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کو صرف نماز روزہ وغیرہ چند عبادتوں میں محدود سمجھا گیا ہے، نعوذ باللہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ عبادت کوئی چیز نہیں ہے، عبادت تو مقصود بالذات ہے، مگر جن چیزون کو مقصود بالعرض کے طور پر اسلام نے اپنے اندر داخل کیا ہے، اور جن کو قرآن نے مذہب کے اندر شمار کیا ہے، اور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تیئیس سالہ تبلیغی زندگی میں ان عبادتوں کے ہم پلہ بلکہ بعض وقت ان پر مقدم رکھا ہے، کیا ان چیزوں کو نظر انداز کر دینے کے بعد یہ عبادتیں چند بے معنی اور بے حقیقت چیزین نہیں رہ جاتیں، یہ ایک حقیقت ہے، جس پر ہمارے علماے کرام کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے،

دوسری اصولی خرابی یہ ہے کہ عربی و فارسی زبانوں کے سکھانے کا ایسا بھدا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، جس کی نظیر دنیا کی کسی تعلیم میں ملنی مشکل ہے، تعلیم کا اصل طریقہ یہ ہے کہ جس زبان یا لغت میں تعلیم دینا ہو، اولاً بچون کو وہ زبان سکھائی جاتی ہے، اور جب انھیں اتنی مہارت حاصل ہو جائے کہ وہ اس میں تحریر و تقریر پر قادر ہو جائیں، تب اس کے بعد اس زبان میں جو علوم و فنون ہین وہ سکھائے جاتے ہیں، مگر عربی تعلیم کا یہ انوکھا طریقہ سن کر آپ تعجب کرین گے، کہ یہاں عربی و

فارسی زبان کی تعلیم کیساتھ ہی ساتھ ابتدا ہی سے وہ علوم بھی شروع کرادیئے جاتے ہین، جو عربی وفارسی مین ہین، اور وہ بھی ایک دو نہیں، بلکہ چار چار، پانچ پانچ فنون کی پانچ چھ کتابیں ابتدائی درجوں میں اور آٹھ آٹھ دس دس فنون کی اتنی ہی کتابیں متوسط اور اعلیٰ درجات میں اور یہ طریقہ ابتدا سے انتہا تک باقی رہتا ہے، بلکہ فنون کی تعلیم ختم ہوجاتی ہے، مگر زبان کی تعلیم ختم ہی نہیں ہوتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنگال کے طلبہ دس بارہ سال کی تعلیم اپنے وطن میں پاتے ہیں، اور اکثر طلبہ وہاں سے فارغ ہوکر شمالی ہند کے عربی مدارس میں آکر اپنی پڑھی ہوئی اکثر کتابیں پھر سے پڑھتے ہیں، غرض اٹھارہ بیس سال کی عربی تعلیم کے باوجود ۹۵ فیصدی ایسے نکلتے ہیں، جو نہ عربی زبان میں تحریر و تقریر پر قادر ہوتے ہین، اور نہ اس زبان کے ذریعہ جو علوم اس طویل عرصہ میں حاصل کرتے ہین، ان پر عبور ہوتا ہے، بلکہ میں تو یہان تک دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ۰ ۵ فیصدی ایسے ہوتے ہیں، جو عربی کتابوں کی صحیح عبارت پڑھ کر مطلب بھی نہیں سمجھ سکتے، اور یہ سب خرابیاں صرف طرز تعلیم کی لائی ہوئی ہین، جب سیکڑوں سال کے تجربہ سے یہ طریقہ غیر مفید ثابت ہوچکا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اس طرز کو تبدیل نہ کر دیا جائے؛

تیسری اصولی خرابی یہ ہے کہ ان مدارس میں اردو کی تعلیم کی طرف کچھ بھی توجہ نہیں کیجاتی، اور پھر درس دیتے وقت عربی وفارسی کتابوں کا ترجمہ اور تقریر اردو ہی میں کیجاتی ہے، اور چونکہ لڑکے اردو سے واقف ہوتے نہیں، اسلئے نہ اردو ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور نہ عربی فارسی، ضرورت اس کی ہے کہ اردو کی اشاعت کے ذرائع پر غور کیا جائے، اور جتنی صورتین اس کے حلقۂ اشاعت کو وسیع کرنے کی ممکن ہون، وہ سب اختیار کیجائیں، نیز ابتدائی درجوں میں اردو کی باقاعدہ تعلیم دیجائے اور اسکو عربی وفارسی کے لئے ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے، اگر ایسا نہیں کیا جاسکتا تو پھر عربی وفارسی کی کتابوں کا ترجمہ و تقریر بزبانی بنگلہ ہی میں کیجائے،

شمالی ہند میں بنگالی طلبہ | پہلے چونکہ صوبہ بنگال میں اعلیٰ تعلیم کا بندوبست نہیں تھا، اسلئے ابتدائی و متوسط تعلیم حاصل کرنے کے لئے بعض طلبہ شمالی ہند کے مختلف عربی مدارس میں جاکر آٹھ دس سال تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن اس طول طویل سفر میں بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، بہت زیادہ مصارف برداشت کرنے پڑتے تھے، اسلئے علماء نے اسکی طرف توجہ کی، اور آہستہ آہستہ ہر جگہ اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے مقامات میں دورۂ حدیث کا بھی انتظام ہوگیا، تاہم چونکہ شمالی ہند میں کچھ دن بسر کرنا ایک رسم ہوگئی تھی، اور بغیر اس کے مولویت کی تکمیل نہیں ہوتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں عربی مدارس جتنے زیادہ ہوتے گئے، شمالی ہند میں جانے والے طلبہ کی تعداد اتنی ہی روز بروز بڑھتی گئی اور اب یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے، کہ پچھلے سال ایک تخمینی اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے، کہ بنگال کے کم و بیش پانچہزار طلبہ شمالی ہند کے مختلف اضلاع میں تعلیم پاتے ہیں، جن کی عمریں ۲۵ اور ۴۰ کے درمیان ہیں، سب سے بڑی تعداد ریاست رامپور میں ہے، جو سات سو سے کسی طرح بھی کم نہیں تجربہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ شمالی ہند میں آکر تعلیم حاصل کرنے میں چند خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں،

ایک تو یہ ہے کہ چونکہ بنگال کے نصاب اور یہاں کے نصاب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس لئے جو کتابیں اپنے وطن میں وہ پڑھ چکے ہوتے ہیں، اکثر ان ہی کو دوبارہ پڑھنا پڑتا ہے جس سے دوگنی عمر ضائع ہوتی ہے،

دوسری یہ ہے کہ ایسا کرنے سے تعلیم کا ایک مقصدِ عظیم یعنی تبلیغ و اشاعتِ اسلام فوت ہوجاتا ہے، اس لئے کہ بنگال میں تبلیغ کرنے کے لئے نئی بنگلہ یا پرانی بنگلہ میں قدرت ہونی چاہئے، کہ مقامی مادری زبان اپنے ہی ضلع یا علاقہ تک محدود ہوتی ہے، علاوہ ازیں تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ پسندیدہ بھی نہیں ہے، اور یہ تعلیم یافتہ نہ نئی بنگلہ پڑھکر آتے ہیں نہ پرانی بنگلہ جانتے ہیں، اور نہ اردو ہی

میں انکو پوری مہارت ہوتی ہے،

ایک خرابی یہ بھی ہے کہ آب و ہوا کے مختلف ہونے اور چاول و گیہوں کی تفاوت کی وجہ سے طلبہ کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے،

ان سب میں بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں آکر اپنی جوانی کے آٹھ دس سال کچھ اس قدر ناگفتہ بہ حالت میں گذارتے ہیں، کہ ان میں احساس غیرت حمیت خودداری، اور روح کی حرارت وگرمی باقی نہیں رہتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ باطل کے مقابلہ میں کبھی اعلان حق نہیں کر سکتے، بلکہ اس کے سامنے ہمیشہ ان کا سر جھکا رہتا ہے،......

بنگال کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علماے کرام کے سیاسی و مذہبی حالات بھی قدرے لکھدینا مناسب معلوم ہوتا ہے،

علماے بنگال کی مذہبی حالت | بنگال میں عربی مدارس کی کثرت کی وجہ سے بفضلہ تعالیٰ مشرقی بنگال میں علم دین کا ایسا چرچا ہے کہ بہت کم گانوں ایسے نظر آئیں گے، جن میں شمالی ہند کا کوئی سند یافتہ عالم دین نہ ہو، اور ویسے تو بعض بعض دیہات میں آٹھ آٹھ دس دس حضرات ایسے ہیں، مگر ان کی مذہبی حالت بحیثیت مجموعی کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں ہے، ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے کہ علماے کرام میں پانچ فی صدی ایسے حضرات ہوتے ہیں، جو اعلیٰ قابلیت کے مالک اور عربی و فارسی اور اردو میں تحریر و تقریر پر قادر ہوتے ہیں، اعلیٰ دماغ رکھتے ہیں، عالی ہمت ہوتے ہیں، غرض ایک عالم دین میں جتنے صفاتِ حمیدہ ہونے چاہئیں، وہ سب ان میں موجود ہوتے ہیں، اور باقی ۹۵ فیصدی سے مخلوقِ خدا کو نفع بہت کم پہنچتا ہے، مگران پانچ فی صدی کی حالت یہ ہے کہ چونکہ ان کے سامنے تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی مستقل تعمیری پروگرام، اور ان کا کوئی لائحۂ عمل یا خاص نصب العین نہیں ہوتا، اس لئے وہ اپنی قوت کو زیادہ تر آپس کے جھگڑوں

میں صرف کرتے ہیں، فروعی مسائل میں بحث و مباحثہ کرنے میں ان کے اوقات ضائع ہوتے ہیں، اور ان مناظروں میں کبھی کبھی قتل و قتال تک نوبت پہونچ جاتی ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ ضلع سلہٹ کے علاقہ میں ضیؒن کے تلفظ کے مسئلہ پر لڑائی میں ایک یادو آدمی ایک موقع پر شہید بھی ہوگئے،

بعض حضرات مدارس عربیہ میں درس و تدریس دینے میں مشغول ہوجاتے ہیں، مگر چونکہ بنگال میں ایسا کوئی کتب خانہ نہیں ہے جس میں علم کے پیاسے بڑے بڑے علوم و فنون کی کتابوں کے مطالعہ سے اپنی پیاس بجھائیں، اور اپنے معلومات میں اضافہ کریں، اسی لئے علماے بنگال باوجود علمی استعداد رکھنے کے تصنیف و تالیف میں ابھی تک کوئی قابلِ قدر ترقی نہیں کرسکے، علماے بنگال شمالی ہند سے جاتے وقت متفرق طور پر جتنی کتابیں اپنے ساتھ لیجاتے ہیں، اگر ان میں سے ہر ایک صاحب ایک ایک کتاب جمع کرنا شروع کردیں تو ہر ضلع میں بڑے بڑے کتب خانے قائم ہوسکتے ہیں،

ادھر مشرقی بنگال میں علماے کرام کا یہ مشغلہ ہے، اُدھر مغربی بنگال کے مسلمانوں کی حالت کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، وہاں اوّلاً مسلمان اقلیت میں ہیں، اور پھر تقریبًا اونکی کل آبادی دیہات میں ہے، جو جہالت و گمراہی کی گران بار زنجیروں میں گرفتار ہے، یہ محض نام کے مسلمان ہیں، ان کے سب رسم و رواج ہندوانہ ہیں، چوٹی وہ رکھتے ہیں، دھوتی وہ پہنتے ہیں، ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں انکی محفلوں کی رونق وہ بڑھاتے ہیں، نماز روزہ کے نام سے بہت کم واقف ہیں، ان کے پاس یا ہندو سنیاسی اور برہمن جاتے ہیں، یا شرابی کبابی مسلمان پیر و فقیر، علماٗ کی صورت سے بھی بعض جگہ لوگ گھبراتے ہیں، کم و بیش یہی حال آسام کے مشرقی اضلاع (آسام ویلی) کے مسلمانوں کا ہے، سلہٹ کے نیم تعلیمیافتہ مولوی اور بعض فضلار بھی "آسام ویلی" میں چلے جاتے ہیں اور وعظ و نصائح کرکے کچھ کما لاتے ہیں، یہ لوگ ان کی مسجدوں میں امامت بھی کرتے ہیں، مگر ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی گئی، اور نہ اسلام کی اصلی صورت ان کے سامنے پیش کیگئی

کوشش کی گئی،

قادیانی فتنہ مشرقی بنگال میں علما کی بڑی کثرت ہے، اس کے باوجود برہمن باڑیہ (ضلع کمرلا کے ایک علاقہ) میں قادیانیون نے جنم لیا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی زندگی میں علاقۂ مذکور کے ایک مولوی صاحب ان سے مناظرہ کرنے کے لئے قادیان گئے، مگر ان پر بدبختی اور نحوست ایسی چھائی کہ خود غلام احمد کے ہاتھ اپنی متاع ایمان فروخت کرکے واپس آئے، مرزا صاحب نے ان کو "خلیفہ بنگال" کا خطاب دیا، پہلے پہل تو لوگوں نے اس کو بہت بُرا سمجھا، مگر آہستہ آہستہ کچھ لوگ ان کے دام فریب میں پھنس گئے، اور اب تو بنگال میں مرزائیوں نے ایسی ادھم مچائی ہے کہ سارے بنگال مین اپنے جال بچھا دیئے ہیں، اور یہ سب کچھ علماے کرام کی بے توجہی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے، جو نہ خود اس فتنہ کی حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اور نہ اوروں کو آگاہ کرتے ہین، ایسی حالت میں مقابلہ کیا خاک کرین گے، قادیانیوں کے علاوہ عیسائی مشنریاں تو ہر جگہ ہیں، جو غریب مسلمانوں کو جاہل پاکر، انھیں طرح طرح کی دنیاوی طمع دیکر ان کی متاع ایمان کو لوٹتی رہتی ہین، دوسری طرف ہندو سنگھٹن مغربی بنگال میں اپنی کارروائیوں میں مشغول ہے جو ہر سال جاہل دیہاتی مسلمانوں کی کافی تعداد کو دھوکہ اور فریب میں پھنساتا ہے، اور علما ہین کہ خاموش بیٹھے ہیں۔

علماے کرام کی سیاسی حالت علماے کرام جس طرح مذہبی امور میں عوام کے قائد و رہنما ہوتے ہیں اسی طرح سیاسی امور میں بھی، مگر بنگال کے علمار کی یہ حالت ہے، کہ وہ خود دیدہ و دانستہ سیاست ملکی سے کنارہ کش رہتے ہیں، تحریک خلافت میں انھوں نے ایسا حصہ لیا تھا کہ شاید ہی کسی اور صوبہ کے علما نے لیا ہو، مگر چونکہ عدم تشدد کی حدود سے کچھ باہر نکل آئے تھے، اس لئے حکومت نے بھی اس کو دبانے میں اس قدر ظلم و تشدد کو استعمال کیا کہ تمام مسلمانان بنگال

خصوصاً یہاں کے علماء پر ایسا خوف و ہراس طاری ہوا، کہ تحریک خلافت کے ختم ہوتے ہی وہ میدان سیاست سے اس طرح بھاگے کہ اب اس کا نام لینے سے بھی گھبراتے ہیں، مسلمانانِ بنگال کے ہاتھ میں اولاً اخبارات ہی نہیں ہیں اور جو دو ایک ہیں انکا مطالعہ بھی علمائے کرام نہیں کرتے اور خود ان میں سے کسی صاحب کے ہاتھ میں کوئی اخبار بھی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کر سکے، .....

اگر مسلمانانِ بنگال میں پھر سے سیاست کی روح پھونکنی ہے، تو یہ کام صرف علمائے کرام ہی کی توجہ سے ہو سکتا ہے، اس لئے کہ عوام پر ان ہی کا کنٹرول ہے، انگریزی خواں طبقہ کا اثر ان پر بہت کم ہے، علمائے کرام کو چاہئے، کہ وہ اپنے فریضہ کا احساس کریں، اور مسلمانوں کی رہنمائی کی طرف بہت جلد توجہ دیں، ....

مذہبی وسیاسی جماعتیں اور علماء ہم نے علمائے کرام کے مذہبی و سیاسی حالات جو اوپر بیان کئے ہیں، وہ اکثریت کے اعتبار سے ہیں، ورنہ ان میں بہت سے ایسے حضرات بھی موجود ہیں جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی خدمات کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے، بعض حضرات پرجا پارٹی میں بھی شریک ہیں، اور بعض مسلم لیگ کے ساتھ بھی اشتراک عمل کرتے ہیں، اور علمائے کرام کی خاص جماعت جمعیۃ العلماء دہلی کی شاخ بھی بنگال میں قائم ہے، علاوہ ازیں بعض مقامات میں تبلیغی انجمنیں بھی قائم ہیں مگر چونکہ انکی تعداد بہت کم ہے اسلئے وہ اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، بلکہ مزاحم قوتوں سے ٹکرا کر ہمت ہار دیتے ہیں، علماء کی جماعت میں سب سے اعلیٰ خدمات جمعیۃ العلماء جمعیۃ نے انجام دی ہیں، اور دے رہی ہے خصوصاً علاقہ جمعیۃ کے دیہاتی مسلمانوں کو نماز روزہ وغیرہ کے مسائل اور احکام شریعہ سے واقف کرنے میں جو خدمات اس نے انجام دیئے ہیں وہ تاریخ کے اوراق میں سنہری حرفوں سے لکھی جائینگی،

مضمون کے بعض حصے اگرچہ بعض حضرات کو ناگوار خاطر ہونگے، مگر میں نے محض مسلمانوں کی اصلاح کیلئے خالصاً لوجہ اللہ سچی سچی باتیں لکھی ہیں، جس سے کسی کو ناگواری نہ ہونی چاہئے،

تلخیص و تبصرہ

دنیاے فلسفہ

گذشتہ چند مہینوں میں فلسفہ کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں پروفیسر سی، ڈی، براڈ کی "میک ٹگارٹ کے فلسفہ کا جائزہ" (EXAMINATION OF MCTAGGART'S PHILOSOPHY) نہایت اہم ہے، مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب کے موضوع پر جو قدرت اس کو ہے، وہ خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، اس نے میک ٹگارٹ کے آخری زمانہ کی تحریروں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے، میک ٹگارٹ کی کتاب "وجود کی فطرت" (NATURE OF EXISTENCE) کی پہلی جلد ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی، اسکی دوسری جلد ڈاکٹر براڈ نے مرتب کرکے ۱۹۲۷ء میں یعنی میک ٹگارٹ کی وفات کے دو سال بعد شائع کی، پہلی جلد میں ہر اس چیز کی خصوصیات قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی جو وجود رکھتی ہے، اس پر بھی ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر براڈ نے ایک کتاب لکھی تھی، زیر نظر کتاب میک ٹگارٹ کی دوسری جلد سے متعلق ہے،

میک ٹگارٹ نے اس کتاب میں مادہ اور خدا کے وجود اور عدم وجود، روح اور ذات کی فطرت، جذبات خصوصاً محبت کی نوعیت، فنا اور بقا، اور زمانہ کی حقیقت اور غیر حقیقت کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے، ان مختلف موضوعوں پر پروفیسر براڈ نے اپنی کتاب میں جو بحثیں کی ہیں وہ بہت ہی مدلل اور مکمل ہیں، مابعد الطبعیاتی نقطۂ نظر سے زمانہ کی توضیح بہت ہی ضروری شے ہے، کیونکہ زمانہ کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ ہیگل سے نکل کر براڈلے تک طریق تصوریت کا بنیادی

اصول رہا ہے لیکن میک ٹگارٹ نے جن اسباب کی بنا پر زمانہ کی حقیقت کا انکار کیا ہو وہ عام نظریوں سے بالکل مختلف ہیں،

عام طور پر زمانہ میں حال، ماضی اور مستقبل یعنی تقدم اور تاخر کے ذریعہ سے امتیاز پیدا کیا جاتا ہے، تقدم زمانہ کے ساتھ لازمی ہے، کیونکہ تاخر میں تغیر نہیں ہو سکتا، مگر میک ٹگارٹ کے دلائل یہ ہیں کہ زمانہ میں تقدم متضاد چیز ہے۔ کیونکہ ماضی حال اور مستقبل میں متباین خصوصیات ہیں اور اس تضاد اور تباین سے گریز کرنے کی کوشش میں ایک لامتناہی رجعت پیدا ہو جاتی ہے، پروفیسر برووڈ نے ان براہین کو اپنے دلائل سے اس طرح رد کیا ہے کہ تضاد سے گریز کا موقع ہی نہیں آتا ہے، اس لئے لامتناہی رجعت کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی ہے، یہ سچ ہے کہ ماضی، حال، اور مستقبل اس معنی میں متباین ہیں کہ کوئی چیز ایک ساتھ ان تینوں زمانوں میں یا ان کے علاوہ کسی زمانہ میں واقع نہیں ہوتی لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض چیزیں یکے بعد دیگرے ظہور میں آتی ہیں، اس سے وقت کے تعین میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا، زمانہ کی حقیقت کے انکار سے تغیر و تبدل کی حقیقت سے بھی انکار کرنا ہے، میک ٹگارٹ سے یہ بھول ہوئی ہے کہ وہ قائم بالاصل کو بھی لائق تغیر و تبدل سمجھتا ہے، اسی لئے ان میں زمانی ربط کے بجائے غیر زمانی ربط اور زمانی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے،

"زمانہ اور اس کی اہمیت جدید تخیل میں" TIME & ITS IMPORTANCE IN MODERN THOUGHTS کے نام سے ایک دوسری اہم کتاب ڈاکٹر ام۔ اے، کلیو کی شائع ہوئی ہے، زمانہ کے مابعد الطبیعاتی مسائل کا تجزیہ کرنے سے پہلے ڈاکٹر موصوفہ نے زمانہ سے متعلق نفسیاتی، طبیعاتی اور منطقیانہ مباحث پر نظر ڈالی ہے، اس کا خیال ہے کہ ہم کو حال کا احساس حال کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ماضی اور مستقبل کے مقابلہ میں ہوتا ہے، نفسیاتی طور سے زمانہ کی پرواز اور عدم رجعت پذیری پر یقین

تجربہ سے آتا ہے، جب کہ حال ماضی میں منتقل ہو جاتا ہے، یہ تجربہ اتفاقیہ واقعات کے نتیجہ سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ماضی اور حال کا تسلسل برابر قائم رہتا ہے طبعیاتی پہلو سے واقعات پر غور صرف ان کے ظہور پذیر ہونے اور اُن کی ترتیب پر کیا جاتا ہے، اس لئے یہاں پہلے اور بعد میں کوئی زمانی ربط نہیں ہے، اگرچہ ان کے متعلقہ عناصر زمانی ہوتے ہیں،

منطقیانہ اصول سے بحث کرتے ہوئے، مصنفۂ مذکورہ نے اس پر زور دیا ہے کہ پہلے وقت کے شعوری اور تصوری احساس میں تمیز کر لی جائے، زمانہ جس کا تصور ہم کرتے ہیں، غیر محدود ہے، جو لامتناہی سلسلہ کی طرح برابر جاری ہے لیکن اس کے تسلسل میں تقدم اور تاخر ہے جو ضروری طور پر ماضی، حال اور مستقبل کے مساوی قرار نہیں پا سکتا ہے،

اس کے بعد زمانہ کے مابعد الطبعیاتی مسائل پر پانچ ابواب ہیں جن میں کانٹ، برگسان، الگزنڈر، میک ٹگارٹ اور ڈن کے نظریوں پر مباحث ہیں، ڈاکٹر برگسان زمانہ کو ایک تخلیقی وجود قرار دیتا ہے جس کو ڈاکٹر کلیو صحیح اور درست سمجھتی ہے، برگسان کی اس چیز کی وہ تعریف کرتی ہے کہ وہ زمان اور مکان کی تمثیل کو مغالطہ آمیز سمجھتا ہے، کیونکہ اس سے زمانہ کی عدم رجعت پذیری اور وجود کی خصوصیات نظرانداز ہو جاتی ہیں، الگزنڈر کا نظریہ ہے کہ زمانہ اور ذہن میں مماثلت ہے، اس تخیل کو ڈاکٹر کلیو بہت ہی ذہن رسا قرار دیتی ہے، مگر اس تخیل سے زمان اور مکان کے ربط میں جو اغلاق واقع ہے، وہ دور نہیں ہوتا، اور یہ ایسا اغلاق ہے جو بہت ہی طباع اور ذہین تمثیل بھی دور نہیں کر سکتی ہے، میک ٹگارٹ کا نظریہ کہ ماضی، حال اور مستقبل نفس ربط ہیں، جن میں واقعات زمانہ سے ماورا ظہور پذیر ہوتے ہیں، ڈاکٹر کلیو کے نزدیک قابل قبول نہیں کسی ذات یا وجود کے زمانہ سے ماورا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایک حقیقت زمانہ کے بغیر قرار پا سکتی ہے، جو بلا شک وشبہہ تسلیم کرنے کے لائق نہیں،

اس کتاب کے دوسرے حصہ میں بعض مابعد الطبعیاتی مسائل مثلاً "پیشین گوئی" "عدم رجعت پذیری" "وجود" "اتفاقی واقعہ" اور "حقیقت" پر روشنی ڈالی گئی ہے، اول الذکر مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے بتایا ہے کہ ایک واقعہ کا ہونا بالکل غیر متعین اور غیر ممکن الاثبات ہوتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ ہوگا اور وہ ہو جائے، لیکن پیشین گوئی میں واقعیت قرار دیجائے تو پھر یہ پیشین گوئی باقی نہیں رہتی، واقعات کے ہونے اور یقینی ہونے میں تضاد ہے، زمانہ کے ناقابلِ رجعت پذیر ہونے کے سلسلہ میں ڈاکٹر کلیو کا خیال ہے کہ اگر زمانہ کو جوہر مطلق نہیں بلکہ واقعات کے سلسلہ کی ترتیب تصور کر لیا جائے تو صحیح طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ زمانہ رجعت پذیر ہو سکتا ہے یا نہیں،

پروفیسر جے. ال. اسٹوکس کی کتاب "زمانہ سبب اور بقا" (TIME CAUSE & ETERNITY) میں بھی اسی قسم کے موضوع سے بحث ہے، پروفیسر موصوف کی اصلی بحث اس نظریہ پر ہے کہ زمانہ کا انحصار ایک لامتناہی بقا پر ہے، اس تخیل کی توضیح کرتے ہوئے اس نے سبب کے تخیل پر زیادہ توجہ دی ہے، اگر زمانہ کا انحصار بقا پر ہے تو ان دونوں میں کوئی علتی ربط ضرور ہونا چاہئے لیکن بظاہر ابدیت اور زمانہ میں کوئی زمانی ربط نہیں ہو سکتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ ہمارے سبب کا تخیل ہی بہت محدود ہو اور زمانی قیاسات کی رو سے اس کی تشریح کافی نہ ہو،

اس کتاب کے پہلے باب میں زمانہ اور سبب کے یونانی نظریہ پر بحث ہے، ارسطو نے چار اسباب بتائے ہیں، چنانچہ اس باب میں ان ہی چار اسباب پر زیادہ توجہ دی گئی ہے ارسطو نے مرورِ ایام سے زیادہ عوارضِ موجودہ پر زور دیا ہے، دنیا کو ایک عظیم الشان منظم ہیئت تصور کیا ہے، جو محض قائم ہے،

دوسرے باب میں زمانہ اور سبب کے موجودہ تخیل پر بحث کی گئی ہے، جدید عہد کی دو چیزیں

پیش نظر رکھی گئی ہیں، فطری سائنس اور تاریخی نقطۂ نظر انیسویں صدی کا سائنٹفک عقیدۂ جبرل
کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، مل نے اس کو اصول موضوعہ کی طرح تسلیم کیا تھا کہ حال سے مستقبل
اور جزء سے کل بنتا ہے، اس کے نظریہ کے مطابق انسانی ذہن، خیال اور قوت ارادی محض
ایک نظام کا تطابق کرتی ہیں، انیسویں صدی میں تاریخی نقطۂ نظر پر زیادہ زور دیا گیا، بری نے
یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ترقی کا تخیل ضرورت پر تو مبنی تھا، لیکن دنیا کی ہیئت، ترتیب اور
نظام میں اس سے انسان کا محض عروج اور بلندی مقصود تھا، یہ سائنس کے نظریہ کے لحاظ سے
بالکل نئی چیز تھی، پروفیسر اسٹوکس کا خیال ہے کہ برگسان کا فلسفہ اس مسئلہ سے بہت ہی قریب
ہے، لیکن اسکو ارسطو کے فلسفۂ غایات (یعنی یہ نظریہ کہ کائنات کے تمام تغیرات کسی غایت یا مقصد
سے واقع ہوتے ہیں) سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برگسان نہ صرف غایت
اور آخری سبب کو مورد بحث میں لانا چاہتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ ارسطو کے بقیہ اور تین اسباب
کو بھی متعارف کرنا چاہتا ہے، تیسرے باب میں مصنف "تعمیر" کے عنوان سے سائنس اور تاریخ
کے مابعد الطبیعیات میں ربط پیدا کرنا چاہتا ہے، اس قسم کے ربط کی شرائط آسانی سے پوری ہو سکتی
ہیں، اگر یہ نظریہ نظر انداز کر دیا جائے کہ مرور ایام بدیہی ہیں، اور پھر فطرت اور انسانی تاریخ کو ایک
ہی چیز تصور کر لیا جائے،

بہرحال مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی پہلو سے وہی بقا اہم اور ابدی ہے جس کا زمانہ کے ساتھ
علتی ربط ہو،

"بزم ارسطو کی روئداد" کی ایک نئی جلد لندن سے شائع ہوئی ہے، اس میں وہ تمام مقالات
ہیں جو اس کے اٹھانوے اجلاس ۳۶-۱۹۳۶ء میں پڑھے گئے تھے، اس اجلاس کی صدارت پروفیسر
انگزنڈر نے کی تھی، خطبۂ صدارت کا موضوع "آرٹ میں ہیئت اور مضمون" تھا، پروفیسر موصوف

کا خیال ہے کہ ایک آرٹسٹ اپنے ذہن سے بعض اجزاء کا اختراع کرتا ہے، جنکو وہ کسی ظاہری اور جسمانی شئے سے ممزوج کر دیتا ہے، اور اس طرح وہ ایک ایسی شئے تیار کرتا ہے جس سے وہی عناصر ظاہر ہوتے ہیں جن کا اختراع اس نے اپنے ذہن میں کیا تھا، ایک آرٹ کی ہیئت پہلے تصور کر کے قرار نہیں کرلی جاتی ہے، بلکہ ہیئت اور تصور میں امتزاج اتنا فوری ہوتا ہے کہ آرٹ کی شکل اور ہیئت فوراً تجربہ سے معلوم ہو جاتی ہیں، ایک ماہر فن جو سامان استعمال میں لاتا ہے انکو اس لئے ترتیب دیتا ہے کہ ذہن سے جدید عناصر ظاہر ہو جاتے ہیں، اور معنی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، فطرت کا حسن صرف ماہر فن کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، حسین فطرت اسی کی دیکھی ہوئی چیزوں کا نام ہے، ایک حسین تصور اسی کے سامان کی پرکاری ہوتی ہے، جو فطرت میں منتقل ہو جاتی ہے ایک ماہر فن تازہ فطرت پیدا کرتا ہے جس میں فطرت کی انفرادیت بہر حال قائم رہتی ہے،

اسی روئداد میں پروفیسر لینگلے کا ایک مقالہ "آزادی اور جدید سیاسی تخیل" کے عنوان سے ہے، پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ آزادی کی بنیاد ایک مختلف لاجزا اتحاد کی محرکات پر ہوتی ہے، ایک حکومت کا فرد خود قوانین بناتا ہے اور خود اس کا ماتحت ہو جاتا ہے، اس سے وہ اپنے نہج کے بعض مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا ہے لیکن یہ اس کا کوئی ایثار نہیں، بلکہ وہ ایثار کئے بغیر اپنے کو دوسرے کے ساتھ ایک عام قانون کے ماتحت متحد پاتا ہے، اسی اصول کی بنیاد پر وہ موجودہ عہد کی نسطائیت اشتراکیت اور جمہوریت کا جائزہ لیتا ہے، اور ان کا ردعمل انفرادی آزادی پر کیا ہو رہا ہے وہ بھی بتاتا ہے، اس روداد میں بعض اور پرازمعلومات مقالات ہیں، مثلاً اے. کے. اسٹوٹ کا "آزاد خواہش اور ذمہ داری" پروفیسر کیمبل کا "اخلاقی معیار کے نظریہ کا مقدمہ" وغیرہ وغیرہ،

مسٹر کونٹینس مونڈ کی کتاب ہیوم کے نظریۂ علم کا جائزہ" بھی بہت ہی اہم ہے، اس کتاب

مین ہیوم کی علمیات کا بہت ہی عمیق اور محتاط مطالعہ ہے جو ہیوم کے ہر طالبعلم کے لئے ضروری ہے، عام طور سے ہیوم کے متعلق یہ بدگمانی کیجاتی ہے کہ اس نے فلسفہ میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں کیا، بلکہ اس نے اپنے پیشرو کے جھوٹے دعوی کو محض منطقیانہ نتیجہ تک پہنچا دیا ہے، لیکن اس کتاب کی مصنفہ نے ہیوم کے معترضین کو مدلل جواب دینے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہیوم نے بعض ایسے مسائل کی بحث پہلی دفعہ چھیڑی ہے جو فلسفیون کے لئے آج تک بالکل معما ہیں،

اف، اس، مارون کی کتاب کامٹے، عمرانیات کا بانی" ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب مین فرانسیسی مفکر کے خیالات کا دلچسپ، ہمدردانہ اور ناقدانہ مطالعہ ہے، کامٹے کے دو نمایان کام ہیں، جن کو اس نے اپنی دو کتابون "ایجابی فلسفہ" اور "ایجابی سیاست" میں قلمبند کیا ہے، پہلی کتاب مین اس نے دکھایا ہے کہ عمرانیات سائنس کا حقیقی اصول ہے، اس کے یہی خیالات ہر جگہ موجزن ہوتے ہیں، مورون کی کتاب کا بھی موضوع یہی ہے، دوسری کتاب میں اس نے وہ نظریے پیش کئے ہیں جو آگے چل کر قوانین کی شکل میں رونما ہوئے، قوانین کے نظریہ کی ابتدا اسی سے شروع ہوئی،

گذشتہ سال "رسالہ فلسفہ" میں بعض دلچسپ مضامین نکلے ہیں، "افلاطون کی جمہوریت پر خیالات" کے عنوان سے ڈاکٹر اے۔ ای گاروی نے ایک مقالہ لکھکر یہ بتایا ہے کہ آجتک افلاطون کے تخیل پر کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی، اور نہ ہونے کی امید ہے، گو اس سے قریب تر حکومتین قائم ہوئین، اسی رسالہ مین ڈاکٹر ڈبلیو۔ ڈی لیمونٹ نے "فلسفہ اور سائنس" پر ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے، ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ فلسفہ سائنس کے نظریوں اور عام آدمیون کی یقینیات اور معتقدات کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے، اور ان کو دنیاوی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ بنانے کی

کی کوشش کرتا ہے، فلسفہ یہ نہیں حل کرتا ہے کہ یہ یقینیات اور نظریے عملی واقعات کے مطابق ہین یا نہین، بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل مطابق ہیں، "غیر متضاد چیزوں" کا منطقیانہ اصول اس کا اصلی معیار ہے،

رسالۂ مذکور میں وائی کونٹ سموئل نے "تمدن" پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ آیندہ تمدن کو مادیت سے آزاد ہونا چاہئے، ایک بلند پایہ تمدن صرف صنعت وحرفت کے آلات یا مشین اور کارخانون پر مشتمل نہیں ہوتا ہے، یہ تو انسان کی صرف جسمانی ضرورتوں کے کفیل ہوتے ہیں، تمدن میں ذہن کا نشو ونما بھی ضروری ہے، ذہن کا نمو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ کچھ سوچ سکے، سمجھ سکے، روحانیت میں کچھ اضافہ کر سکے، اور روحانی لذتوں سے لطف اندوز بھی ہو سکے، ایک ایسا تمدن جس مین معاشی اجزار دیوتا بنجائیں، انسانی روح کی مسرت کا باعث نہیں ہو سکتے ہیں، آیندہ فلسفہ اگر اپنے دیرینہ معتقدات سے پاک ہوا، سائنس اگر اپنی مادیت سے آزاد ہوا، اور مذہب اپنی ادعائی محکومیت سے مبرہ ہوا تو مستقبل کی روحانی اور ذہنی تعمیر صحیح معنون میں ہو سکتی ہے، "ص ع"

مکتبہ جامعہ کی ایک نئی شاخ

مکتبہ جامعہ کی بنیاد علیگڈھ میں ایک دوکان کی حیثیت سے رکھی گئی تھی لیکن اللہ کے فضل وکرم، کارکنوں کی پیہم جدوجہد اور ارباب ذوق کی ہمت افزائیوں کی بدولت اب وہ ہندوستان مین اردو کتابوں کی اشاعت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہی، پہلے اس نے ایک شاخ دہلی میں شہر والوں کی سہولت کیلئے کھولی، لاہور میں اہل پنجاب کی خاطر مستقل انتظام کیا گیا اور صوبہ متحدہ کے پایہ (امین آباد) تحت لکھنؤ میں بھی ایک شاخ یکم اگست سے کھول دی گئی ہی، امید ہے کہ لکھنؤ کے ارباب ذوق اس سے فائدہ اٹھا کر ہماری ہمت افزائی فرمائینگے، (صدر دفتر:- مکتبہ جامعہ نئی دہلی، شاخین:- دہلی، لاہور، لکھنؤ)

اخبار علمیہ

ایک قدیم جگہ کا انکشاف

زمانہ قدیم میں ارماگیڈون ایک مشہور جنگی میدان تھا، جہاں ہمیشہ لڑائیاں ہوا کیں، یہ ناصریہ سے ۱۰ میل جنوب کی طرف اور فلسطین کے ساحل بحر روم سے پندرہ میل پر واقع ہے، یہ نام اصل میں عبرانی لفظ ہرماگیدو تھا جس کے معنی "پھل دار پہاڑ" یا "پسندیدہ شہر" کے ہیں، آج کل یہ صرف میگیڈو نام سے مشہور ہے، ماہرین آثار قدیمہ نے پتہ چلایا ہے کہ اس کی جائے وقوع اس درہ کے دہانہ پر ہے جو مصر سے کرمل کی پہاڑیوں سے ہو کر دجلہ اور فرات کو جاتا ہے، یہاں مصر کے فراعنہ نے اسیریا کے بادشاہ کے خلاف جنگ کی تھی، یہیں شاہ جوسیا فراعنہ سے لڑا تھا، اور یہیں مصر کا تھٹموز ثالث میگیڈو کے بادشاہ اور اس کے حامیوں پر اپنے شہسواروں کی جانبازیوں سے غالب آیا تھا، یہیں جنگ عظیم میں جنرل اڈمنڈ ہنری الن بائی نے ترکوں کو زک دی تھی اور اس کارنامہ پر وہ میگیڈو کا لارڈ بنایا گیا تھا، انجیل کے قدیم مفسرین نے لکھا تھا کہ یہاں دنیا کی آخری تباہ کن جنگ ہوگی، اور عیسائی مذہب کے مخالفین کی فوجیں پسپا ہونگی،

اب سے سو برس پہلے فلسطین کا ایک ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ایڈورڈ رابنن اس مقام پر آیا تھا، لیکن صحیح جگہ کا پتہ نہ چلا، اس زمانہ میں صرف ظاہری اور سطحی آثار سے زمین کے نیچے

دبے ہوئے تاریخی مقامات کا اندازہ لگا ناہوتا تھا، لیکن اب تو یہ کام باضابطہ کھودائی سے آغاز کیا جاتا ہے، چنانچہ اس جگہ پر کھودائی کا کام ۱۹۲۵ء میں شکاگو یونیورسٹی کی طرف سے شروع ہوا، اور تعجب کی انتہا نہ رہی، جب اندر سے مصری بادشاہوں کے محل برآمد ہوئے، اس کے کمرے منقش ہیں اور غسل خانوں میں سیپ کا فرش ہے، پھر سونے، لاجورد، ہاتھی دانت اور گنگا جمنی کے کام کی صنعتیں کثرت سے موجود ہیں، شی شنک نامی فرعون کا ایک کتبہ بھی ہے، اسی نے یروشلم کی غارتگری کی تھی حضرت سلیمانؑ کا بنایا ہوا اصطبل بھی صحیح سالم ہے، اس کی وسعت اتنی ہے کہ اس میں تین سو گھوڑے رہتے ہونگے،

کھودنے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ آخری تہ تک پہنچ گئے ہیں، کل بیس تہیں ہیں، آخری تہ میں ایک عصر حجریہ کا غار ہے جس میں چقماق کے اوزار اور ہڈیاں ملی ہیں، انیسویں تہ میں جانوروں اور انسانوں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں، اٹھارہویں تہ میں ایک پتھر کی محصور دیوار ہے جو پندرہ فیٹ اونچی اور ۲۴ فیٹ چوڑی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ تین ہزار برس قبل مسیح بھی جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔

خوردبین کی ایک نئی ایجاد

جرمنی کے سائنس دانوں نے ایک نئی خوردبین ایجاد کی ہے جس سے خوردبینی کی قوت میں غیرمعمولی اضافہ ہوگیا ہے، اس نئے آلہ میں چھوٹی چیزوں کو بڑی دیکھنے کے لئے عام آلات کی طرح روشنی کی لہریں استعمال نہیں کیجاتی ہیں، بلکہ برقیہ (ELECTRON) کی شعاعوں کو کام میں لایا جاتا ہے، جدید طبعیات کی رو سے روشنی کی شعاعوں میں ذرات اور لہریں ہوتی ہیں، برقیہ کی شعاعوں میں بھی لہریں اور ذرات ہیں، لیکن ایک خوردبین میں جب مرئی چمک استعمال کیجاتی ہے تو روشنی کی لہروں سے اس کی خوردبینی کی قوت محدود ہوجاتی ہے، ذرات روشنی کی لہروں

سے چھوٹے ہوتے ہیں، اور وہ اس کے جال کے اندر سے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ بالکل معلوم نہیں ہوتے، برقیہ کی لہریں ایک لاکھ گنا کم چھوٹی ہوتی ہیں، برقیہ کسی دوربین کے شیشہ سے مرکز کی طرف مائل تو نہیں ہوسکتا، البتہ برقی اور مقناطیسی قوتوں کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے کیونکہ ان کا ردعمل برقیہ کی شعاعوں پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہ شیشہ کا روشنی پر،

برقیہ سے خوردبین کی تیاری کی کوشش دس سال سے جاری تھی، ۱۹۲۲ء میں جرمنی کے سائنس دانوں میں یہ خیال پیدا ہوا، اس سلسلہ میں بلجیم کے ماہرین فن نے بھی کچھ کام کیا، لیکن ڈاکٹر جنٹن جوزف ڈیوڈین نے اس کو بڑی ترقی دی، اس نے برقیہ میں لہروں کو ظاہر کرکے دکھایا ہے، چنانچہ گذشتہ سال اس کو نوبل کا انعام بھی ملا،

چند سال پیشتر اوٹاوہ کے ایک ہیئت داں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ستاروں کی دھیمی روشنی کو برقی تصویر کے ذریعہ سے برقی لہروں میں منتقل کرکے ایک برقیہ کی دوربین تیار کیجا سکتی ہے جس میں دو ہزار انچ کے شیشے کی دوربین کے برابر قوت پیدا ہوگی، لیکن اب اسی قسم کی خوردبین جرمنی میں تیار کرلی گئی ہے، اس میں آٹھ ہزار وولٹ یعنی برقی حرکت کی قوت ہے جتنے اب تک جتنی خوردبینیں استعمال میں ہیں ان سے پچیس گنا زیادہ طاقتور ہے، اس کے ذریعہ سے تصویریں بھی لیجا سکتی ہیں، چنانچہ ریم کے جراثیم کی تصویریں لی گئی ہیں جو انگریزی سکہ پنی کے برابر آئیں، حالانکہ اب تک خوردبینوں کے ذریعہ سے ان جراثیم کی جتنی تصویریں لی گئی تھیں وہ وہ آلپین کے سرسے زیادہ بڑی نہیں ہوتی تھیں،

برقیہ کی تصویر

کلیفورنیا کے ڈاکٹر کارل ڈیوڈ انڈرسن نے سائنس کی بعض عجیب و غریب چیزوں کا انکشاف

کیا ہے، اس نے ۱۹۳۲ء میں برقیہ کی تصویر لی جس کے صلہ میں اس کو نوبل کا انعام ملا، یہ تصویر سائنس کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، حال میں اسی قسم کے ایک دوسرے ذرہ کی تصویر شائع کی ہے، جو پہلے سے کم اہم نہیں، یہ ذرہ "وزنی برقیہ" کے نام سے منسوب ہی، ڈاکٹر انڈرسن نے اس ذرہ کی تحقیق ۱۹۳۴ء میں شروع کی تھی، اور اب اس کو دریافت کرلیا ہے، اتفاق سے ہارورڈ کے دو سائنس دانوں کو بھی اس کی تحقیق میں کامیابی ہوئی ہے،

یہ عجیب وغریب چھوٹے ذرے زمین سے دس میل اوپر کی سطح پر کائناتی شعاع اور ہوا کے ذرّوں کے تصادم سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، عام برقیہ سے ان کی ضخامت ایک سو دس سے چارسو گنی تک زیادہ ہوتی ہے، ڈاکٹر انڈرسن نے اس برقیہ کی تصویر لینے میں ! سینے کو ایک ایسے معمل میں بند کرلیا تھا جس کو اس نے مصنوعی ارگون (ایک گیس جو ہوا کی ترکیب میں داخل ہے) ہیلیم (ایک شفاف گیس جو فضائے آفتاب میں پائی جاتی ہے) اور الغومی بخارات سے بھر دیا تھا، یہاں ذرہ، برق (ions) میں گیس کے ذرہ سے باہر آکر ٹکراتا تھا، اور بخار برق کے اوپر آکر منجمد ہوجاتا تھا، اسی طرح اس کی تصویر کھینچنا آسان ہوگیا، چنانچہ ڈاکٹر مذکور نے اس کی تصویر بھی شائع کردی ہے، اور اندازہ لگایا ہے کہ اس میں ایک کرور وولٹ کی قوت ہے،

"ص ع"

فہم انسانی

ازمولنا عبدالباری ندوی

یعنی ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب "ہیومن انڈراسٹینڈنگ" کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کیساتھ اس کے خیالات فلسفہ پر بحث وتبصرہ، حجم ۲۲۰ صفحات، قیمت ۱-۸عہ

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

برہان مآثر

فارسی، مولفہ سید علی طباطبا، تقطیع کلان، صفحات ۶۲۲، مطبوعہ جامعہ ملیہ، قیمت عہ (دس روپیہ) غیر ممالک کے لئے ایک پونڈ انگریزی، پتہ: معتمد مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن،

حیدرآباد دکن کی علمی خدمات میں سے ایک اور مفید چیز "مجلس مخطوطات فارسیہ" کا قیام ہے، جو فارسی کی کئی قلمی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی اور اہتمام سے چھاپتی ہے، زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے،

یہ اسوقت تک چھپی نہ تھی، اس نے ہندوستان اور غیر ملکون کے کئی نسخوں سے مقابلہ کر کے اچھے کاغذ پر صفائی کے ساتھ ٹائپ کے حرفوں میں اسکو شائع کیا ہے،

شروع میں جناب سید ہاشمی صاحب معتمد مجلس کا دلچسپ مقدمہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے نسخے کہاں کہاں ہیں، اور عام مورخوں کے نزدیک اس کتاب کا کیا پایہ ہے، پھر اس کے عنوانوں کی فہرست ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے،

مصنف کا نام جیسا کہ اس نے آپ مقدمہ میں بتایا ہے، علی بن عزیز اللہ طباطبا، اور اس کتاب کا تاریخی نام "برہان مآثر" ہے[1] برہان مآثر کے اعداد ایک ہزار ہیں لیکن سنہ اسکی تالیف کی نہیں بلکہ

---

[1] مقدمہ کتاب ص ۴،

آغازِ تالیف کی تاریخ ہے، کیونکہ اس کا اختتام چاند سلطانہ کی اس جنگ پر ہے، جو شاہزادہ مراد سے ۱۰۰۴ھ میں ہوئی تھی[1]، اور اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ مصنف کی عمر کا پیمانہ اسی سنہ یا اس سے قریب تر سنہ میں لبریز ہوگیا، ورنہ برہان نظام شاہ کے بعد دوسرے پانچ بادشاہوں کا حال بھی وہ تحریر کرسکتا تھا، میرے اس خیال کی تائید فرشتہ کے اس بیان سے ہوتی ہے،

در وقائع نظام شاہیہ کہ سید علی ہمدانی	اور وقائع نظام شاہیہ میں جس کو
در عہد برہان نظام شاہ ثانی می نوشت	سید علی ہمدانی نے برہان نظام شاہ ثانی
و توفیق اتمام نہ یافت، فوت شد چنین	کے عہد میں تحریر کیا ہے، اور ناتمام چھوڑ کر
مرقوم است[2]	فوت ہوگیا، اس طرح لکھا ہے،

اس سے پتہ لگا کہ "وقائع نظام شاہیہ" کا مصنف یہی سید علی ہے، اور وہ برہان نظام شاہ کے حکم سے اس کو لکھ رہا تھا، کہ فوت ہوگیا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ گو تاریخی نام اس کا برہان مآثر ہے، مگر عام طور پر اس عہد میں اس کو "وقائع نظام شاہیہ" کہتے تھے، جیسا کہ خود تاریخ فرشتہ کا اصلی نام گلزارِ ابراہیمی چھوڑ کر اسکو تاریخ فرشتہ کہنے لگے،

فرشتہ ۱۰۳۶ھ تک زندہ تھا، اور یہ قلمی نسخہ جس سے یہ زیر تبصرہ کتاب مرتب کی گئی ہے، مصنف کے لڑکے ابو طالب بن سید علی طباطبا الحسنی محرم ۱۰۳۹ھ کا لکھا ہے، اور نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ ۱۰۴۶ھ میں ہوا، پس مصنف اگر زندہ ہوتا، تو غالباً نظام شاہی سلطنت کی تاریخ مکمل کرڈالتا،

وقائع نظام شاہیہ اور برہان مآثر دونوں ایک ہی کتاب کا نام ہونا، اس سے ظاہر ہے کہ فرشتہ نے جو واقعات وقائع نظام شاہیہ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں، وہ بجنسہ اس برہان مآثر میں موجود ہیں،

یہ کتاب تین طبقوں پر تقسیم کی گئی ہے، طبقہ اول میں ان سلاطین بہمینہ کا حال ہے، جن کا پایہ تخت گلبرگہ

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۱۵۹، [2] فرشتہ جلد دوم ص ۹۰ نولکشور،

۱۱ طبقہ دوم میں پایۂ تخت بیدر کے سلاطین بہمنیہ کا ذکر ہے، اور طبقہ سوم میں نظام شاہی سلطنت کا حال ہے جنکا پایۂ تخت احمد نگر تھا،

مصنف نے اپنی کتاب میں سلاطین بہمنیہ کا حال ابتدا سے سلطان محمود بن سلطان محمد بہمنی تک لکھا ہے، کیونکہ اسی عہد میں نظام الملک بحری کے لڑکے احمد نے جنیرا اور بعد میں احمد نگر کو پایۂ تخت بنا کر ایک جدید سلطنت نظام شاہیہ کی بنیاد رکھی، اور مصنف کو اسی سلطنت کا حال لکھنا مدنظر ہے، جس کے تاجدار فرماں روا برہان نظام شاہ ثانی متوفی ۱۰۰۳ھ کے حکم سے اس کتاب کی ابتدا کی،

مصنف نے غالباً اختصار کے خیال سے بعض اہم واقعوں کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً سلطان علاء الدین بہمنی کے حملہ گجرات کا کوئی ذکر اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے، حالانکہ اس واقعہ کی اہمیت اسلئے زیادہ ہے، کہ سلطان موصوف کی وفات اسی کے سبب سے وقوع میں آئی،[1]

ص ۱۰۹ میں سلطان مالوہ کا نام اس کتاب میں "الخان" (ال خان) لکھا ہے، خیال ہوا کہ شاید کاتب (کمپوزیٹر) کی غلطی ہو، لیکن جب غلط نامہ میں بھی یہی دیکھا، تو خیال گذرتا ہے، کہ اصل نسخہ ہی میں غلطی ہوگی، کیونکہ مالوہ کے سلطان ہوشنگ کا نام الپخان (الپ خان) تھا، ال خان نہیں،

مصنف نے سنین لکھنے میں بھی بڑے بخل سے کام لیا ہے، جس سے واقعات کا تسلسل نظر انداز ہو جاتا ہے، اسی طرح اپنے مآخذ کا ذکر بھی وہ اتفاقیہ ہی کرتا ہے، حالانکہ اسکی سخت ضرورت تھی،

بعض مقامات پر ایسی طبع زاد باتیں لکھی ہیں، جنکو نہ عقل قبول کرتی ہے، اور نہ کسی دوسری تاریخ سے اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ گجراتی بادشاہ محمود بیگڑہ کی نسبت کہتا ہے کہ اس نے خاندیس پر صرف اس لئے حملہ کیا، کہ وہاں کے حاکم نے اپنا نام محمود رکھا تھا، مصنف کی اصل عبارت یہ ہے،

"دریں وقت سلطان محمود گجراتی کہ بہ نخوت جاہ و غرور و شوکت موفور سپاہ مغرور بود

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۲۰۰، نولکشور،

از راہ عدالت وانصاف ددر .... چون استماع نمود کہ حاکم برہان پور (خاندیس) خویشتن

را محمود شاہ می نامد، از غیرت .... برخویشتن بہ پیچید وگفت، برہان پوری راچہ یارا ے

آن کہ با بندگان ما دراسم ولقب شرکت نماید، یا درمقام برابری درآید۔[ا۵]

گجراتی بادشاہوں میں سلطان محمود ہی سب سے زیادہ عادل اور بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ

گذرا ہے، اس نے خاندیس پر ۹۰۲ھ میں صرف اسلئے حملہ کیا تھا، کہ حاکم خاندیس نے خراج نہیں ادا

کیا، حالانکہ وہ کئی پشت سے گجراتی بادشاہوں کا باجگذار چلاآتا تھا،

مصنف نے ایک اور واقعہ اسی طرح کا سلطان محمود بیگڑہ کی نسبت لکھا ہے، کہ ۹۰۵ھ میں

حاکم خاندیس کی مدد کے لئے احمد نظام شاہ نے سلطان محمود گجراتی کے برخلاف فوج کشی کی، اور

چونکہ اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اس لئے گجراتی فیلبانون کو ملاکر رات کے وقت مست

ہاتھیوں کو کھول دیا، تاکہ گجراتی لشکر کو روند ڈالے، اور اس موقع سے فائدہ اٹھاکر خود اس نے شبخون

مارا جس سے گجراتی لشکر کو شکست ہوئی،[۵۲]

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جنگ میں ایسے واقعات رونما نہیں ہوتے، بلکہ بہ کثرت ہوتے

ہیں لیکن کوئی تاریخ اس واقعہ کی مؤید نہیں ہے، حالانکہ اسی قسم کا واقعہ احمد شاہ اول کے ساتھ جنگ مالوہ

کے وقت پیش آیا، وہ تاریخوں میں مفصل موجود ہے،

اس کتاب کے مطالعہ کے وقت پڑھنے والے پر جو خاص اثر ہوتا ہے، وہ یہ ہے، کہ مصنف

اپنے وقت کا بڑا ماہر ادیب ہے، شروع سے آخر تک اس کی عبارت یکساں ادیبانہ ہے بعض دفعہ تو اس

طرز کے سبب سے مطالب میں پیچیدگی آجاتی ہے، اور اسی باعث کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے،

---

۵۱ برہان ماثر ص ۲۲۰،

۵۲ کتاب مذکور ص ۲۲۴،

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ دکن کے لئے یہ بہترین مواد ہے، کیونکہ آخر کے تمام واقعات مصنف کے چشم دید ہیں،

آخر میں فاضل مرتب نے کتاب میں آئے ہوئے ناموں اور مقاموں کی فہرست بھی دیدی ہے، جو آج کل کے مہذب ملکوں کے مطبوعات میں ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے،

مجلس مخطوطات اور معتمد صاحب مجلس مخطوطات کا یہ کارنامہ اہل تاریخ کی طرف سے شکریہ کا مستحق ہے، "اظ"

انڈیا آفس کے کتب خانہ کی عربی قلمی کتابوں کی فہرست جلد دوم

کتب اصول و فقہ

انڈیا آفس کے مشہور کتبخانہ میں عربی زبان کی قلمی عربی کتابوں کی فہرست جلد وار شائع ہو رہی ہے، اس وقت ہمارے سامنے اس فہرست کی دوسری جلد کا تیسرا نمبر ہے، اس میں فقہ کی کتابوں کا تذکرہ ہے، اس کے مرتب ریبن لیوی ایم اے لٹ ڈی (REUBEN LEVY M.A. LITT.D) ہیں، جو کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر ہیں، پچھلے سال ۱۹۳۷ء میں یہ جلد چھپکر شائع ہوئی، اور کتب خانہ مذکور کی عنایت سے ہم تک پہنچی ہے، یہ صفحہ ۱۹۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۳۶ پر تمام ہوئی ہے اور نمبر ۱۴۲۲ سے لیکر نمبر ۱۸۰۸ تک کی کتابوں کو شامل ہے،

اصول فقہ کی جن کتابوں کے نام ہیں، وہ اکثر عام ہیں، لیکن بعض خاص اہمیت رکھتی ہیں، ان میں سے ایک [illegible] "التمهيد فی اصول الفقه" ہے، نسخہ ۵۵۳ھ کا ہے، لیکن اس میں مصنف کا نام نہیں، گولڈزیہر نے اس کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ مباحث کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب اس زمانہ کی نہیں ہو سکتی، (یہ فہرست اس کیٹلاگ میں دیگئی ہے)

اس کیٹلاگ کے فاضل مرتب کا بیان ہے کہ التمہید کے نام سے حاجی خلیفہ نے کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر واقعہ ایسا نہیں ہے، اصول فقہ میں حسب ذیل کتابوں کے نام حاجی خلیفہ نے لئے ہیں، ایک تمہید القواعد الاصولیۃ والفروعیۃ زین الدین العاملی المتوفی ۹۶۵ھ کی اصول امامیہ میں، دوسری تمہید فی تنزیل الفروع علی الاصول جمال الدین اسنوی شافعی المتوفی ۷۷۲ھ کی، مگر غالباً کتاب مذکور ان دو میں سے کوئی نہیں، یہ دونوں متاخرین، اور ان کے مضامین بھی الگ ہیں،

اصول کے بعد فقہ کی کتابوں کی تشریح ہے، جن میں زیادہ تر متاخرین کی تصنیفات ہیں، فاضل مرتب نے کتابوں اور مصنفوں کی تلاش میں محنت کی ہے، ہندوستان میں بانکی پور، آصفیہ اور بوہار کی لائبریریوں کی فہرستوں کے حوالے دیئے ہیں،

یہ افسوس کی بات ہے کہ عربی الفاظ میں نقطوں وغیرہ کے دینے کی پروا نہیں کی گئی ہے، الفتاوی السراجیہ کے آخر میں جو شعر ہیں وہ غلط ہیں، نثر میں بھی غلطی ہے، چھپی ہوئی عبارت یوں ہے: وانشد فی القاضی الامام ابی زید الدبوسی رحمہ اللہ علیہ، شعر جہدت لتاصیل الدمائل فی الوریٰ فوفقنی ربی مما طاش عن سہمی، فاجبت ما ودمات عن سنن الھدی لمستنبطی الاحکام بالرای والفھم، تمت الکتاب الخ

فتاوی سراجیہ کا قلمی نسخہ جو دار المصنفین میں ہے اس کے آخر میں یہ عبارت نہیں، کتاب الفوائد آخری باب ہے، جس میں بزرگوں کی علمی خدمات اور محنتوں کا ذکر ہے، جس میں آخری واقعہ حضرت زفر کا ہے، اگر یہ مصنف کی عبارت ہو اور انشدنی کی یائے متکلم مفعول سے مقصود مصنف ہو تو یہ قطعاً غلط ہوگا، کیونکہ اس کا مصنف چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں تھا، اور امام ابوزید دبوسی نے ۴۳۰ھ میں وفات پائی، یہ ممکن ہے کسی اور کا قول ہو،

بہرحال یہ عبارت صحیح یوں ہوگی وانشد نی القاضی الامام ابوزید الدبوسی رحمۃ اللہ علیہ

شعر جہدت تناصیل الفضائل فی الوری ❊ فوفقنی ربی بما طاش عن سھمی

فاحییت ماقد مات عن سنن الھدی ❊ لمستنبطی الاحکام بالوای والفھم

نصاب الاحتساب محتسبوں کے فرائض پر ایک عمدہ کتاب ہے، اس کے مصنف کا نام عمر بن محمد بن عوض ہے، مگر ان کی نسبت لوگوں نے شامی بیان کی ہے، یہ غلطی اصل میں حاجی خلیفہ سے ہوئی ہے، اور سب نے اسی کی پیروی کی ہے، علامہ کرد علی شامی نے اپنے پرانے رسالہ المقتبس میں یہی غلطی کی اور اسی کا اعادہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب خطط الشام جلد اول ص ۱۴ میں کیا ہے، بانکی پور لائبریری (جلد ۹ ص ۱۶۹۵) اصفیہ (۲ ص ۱۱۰۸) برلن اور مصر کی فہرستوں میں بھی یہی غلطی ہے، اصل صحیح لفظ سنامی (س ن ا م ی) ہے، سنام ہندوستان میں موجودہ ریاست پٹیالہ میں ایک قصبہ ہے، جہاں چند مشہور علما پیدا ہوئے ہیں، مصنف اسی ہندوستان اور سنام کے رہنے والے تھے، ان کو ملک شام سے کوئی تعلق نہیں، فوائد فیروزشاہی میں اس کتاب کا حوالہ ہے، کتاب کلکتہ میں ٹائپ میں چھپ چکی ہے، اس میں صحیح نام سنامی چھپا ہے، انڈیا آفس کے اس نسخہ میں سنمی بھی تصحیف ہے، خود کتاب کے اندر اس کے ہندوستانی الاصل ہونے کی شہادت ہے، پان کھانے کا بیان ہے، ہندوں کے ہاتھ سے دودھ، گھی، دہی خریدنے کا ذکر ہے، اور تذکرۂ علمائے ہند میں ان کا حال درج ہے، (ص ۹۴) اخبار الاخیار محدث دہلوی (ذکر ضیاء الدین سنامی) قاضی ضیاء الدین سنامی کے نام سے مشہور ہیں، حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین کے معاصر تھے،

"س"

تفسیر جواہر

یعنی

شیخ طنطاوی جوہری مصری کی شہرۂ آفاق عربی تفسیر کا آسان

اور عام فہم اُردو ترجمہ

(مترجمہ:۔ مولانا عبید الرحمن رحمانی استاد جامعہ دار السلام عمرآباد)

اس تفسیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کی تشریح میں سائنس کی تحقیقات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ سلف کی تفسیر کی بھی پابندی کی گئی ہے، اس لئے اس میں جدت کے باوجود بدعت نہیں پیدا ہوئی ہے، اور آجکل کے بعض غلط رو عجمی مدعیان تفسیر کی طرح زبان، زبان کے قواعد اصول اور لغت سے دست بردار ہو کر زمانہ جدید کی خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس تفسیر کی تالیف سے شیخ طنطاوی نے علوم عصریہ کے مقابلہ میں وہی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے جو آج سے ساڑھے سات سو برس پیشتر امام فخر الدین رازی نے قدیم یونانی علوم کے مقابلہ میں انجام دی تھی اور اسی لئے یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ یہ تفسیر چودھویں صدی کی تفسیر کبیر ہے،

ادارہ "دار التصنیف عمرآباد" مدراس نے اردو داں دنیا کے لئے تفسیر جواہر کی پوری پچیسوں جلدوں کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا عزم کر لیا ہے، چنانچہ یہ اسکی پہلی جلد کا ترجمہ ہے جو سورۂ بقر کی تفسیر پر مشتمل ہے، کاغذ، کتابت، طباعت کی خوبی کے لئے مطبع معارف اعظم گڈھ کا نام کافی ہے، شروع میں علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ ہے۔

ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت:۔ سے روپیہ، علاوہ محصولڈاک،

ملنے کا پتہ:۔ سکریٹری عمر لائبریری عمرآباد متصل آمبور ضلع شمالی آرکاٹ صوبہ مدراس

مطبوعات جدیدہ

خطبات صدارت:۔ شائع کردہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تقطیع بڑی' ضخامت ۲۳۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ دفتر کانفرنس صدر جہاں منزل علیگڈھ،

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر مسلمانوں کے (اور بعض ہندو مسلمانوں کے مشترک) اہم تعلیمی، علمی، اقتصادی، معاشرتی، صحافتی اور لسانی لائق غور مسائل کے لحاظ سے، کانفرنس کے اجلاس کے گیارہ شعبے قرار دیئے گئے تھے، (۱) معاشیات و اصلاح معاشرت، (۲) تعلیم نسواں (۳) ابتدائی تعلیم اور مدارس اردو (۴) اعلیٰ تعلیم (۵) اردو پریس، (۶) اسلامی علوم و فنون، (۷) مدارس اسلامیہ (۸) خواندگی اور تعلیم بالغان، (۹) زبان اردو (۱۰) صنعتی تعلیم (۱۱) ثانوی تعلیم، اور ان کی صدارت کے لئے ان شعبوں کے ہندوستان کے نامور علما، اور ماہرین فن کا انتخاب کیا گیا تھا جن کے نام بہ ترتیب یہ ہیں، پروفیسر الیاس برنی ناظم دارالترجمہ سابق پروفیسر معاشیات، شیخ عبداللہ صاحب سکریٹری گرلز کالج علی گڈھ، سید آل علی صاحب نقوی انسپکٹر مدارس اسلامیہ، عبداللہ یوسف علی صاحب، مولوی بشیرالدین صاحب اڈیٹر البشیر، منشی دیانرائن صاحب نگم اڈیٹر زمانہ، مولنا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولوی سید طفیل احمد صاحب، مولوی عبدالحق صاحب بی اے، خان بہادر اے جی خاں ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب، کانفرنس نے ان سب کے صدارتی خطبوں کا مجموعہ کتابی صورت میں

شائع کر دیا ہے، ان پر فرداً فرداً تبصرہ کرنا طویل بھی ہے اور بے کار بھی، ان کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ یہ خطبے متعلقہ شعبوں کے مسلمہ ماہرین اور نامور علماء کے معلومات، تجربات، دماغی کاوشوں اور زرین مشوروں کا خلاصہ اور عطر ہیں، کانفرنس نے انھیں شائع کرکے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے، اور ہمارے ہاتھوں میں ایک ایسی کتاب دے دی ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی قومی ترقی کے وسائل کی گذشتہ تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں، موجودہ حالات کا اندازہ کر سکتے ہیں، اور آیندہ کے لئے صحیح راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں، اگر ناگواری طبع کا باعث نہ ہو تو اتنا عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ تعلیم نسواں کے باب میں شیخ عبداللہ صاحب کے خدمات مسلّم ان کے مشورے صحیح ان کا خطبہ مفید لیکن تعلیم نسواں کی ضرورت کے بارہ میں انھوں نے جو دلائل دیئے ہیں اور اس کی راہ کے جو موانع بتائے ہیں، ان میں سے بعض آج سے چوتھائی اور نصف صدی پیشتر کچھ وزن رکھتے ہوں تو رکھتے ہوں، لیکن آجکل ایسی سطحی باتوں کی کوئی وقعت نہیں،

ہندوستان کا نیا دستورِ حکومت، مؤلفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول،

تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۷۶ صفحے، خط ٹائپ، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد،

اردو میں ہندوستان کے نئے دستورِ حکومت پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اب ہندوستانی اکیڈمی نے اردو کے مشہور صاحب قلم پنڈت کشن پرشاد صاحب کول سے یہ کتاب تالیف کرائی ہے، یہ کتاب اختصار، جامعیت، ترتیب، طرز تحریر اور طریقۂ تفہیم ہر اعتبار سے گذشتہ سب کتابوں میں بہتر ہے، اس میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ دستور جدید کے دونوں شعبوں صوبہ جاتی خود مختاری اور فیڈریشن کا خاکہ اس سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کا پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے، اور اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے پرانے آئین میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں، اور اس نئے آئین میں ہندوستانیوں کو کیا کیا نئے اختیارات ملے

رنگ میں اردو شعراء کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے، یہ ایک اخلاقی اور سبق آموز قصہ ہے، اس کی تفصیل کی اس مختصر ریویو میں گنجائش نہیں، اس میں ترک دنیا کی مذمت، خدمت خلق کی ترغیب، قومی خدمت کی تعلیم انسانی فطرت کے اچھے برے پہلوؤں کی تمثیل، اعمال بد کی سزا، حسن عمل کی جزا، بہت سی اخلاقی باتوں کو قصہ کے پیرایہ میں نہایت دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے، اشخاص کے ناموں اور ان کی سیرت میں بہت مناسبت کا لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً "سیوک رام"، "خدمت رائے"، "عصمت النساء" اور "جانکی" وغیرہ اس مثنوی کی دوسری نمایاں خصوصیت بحروں کا تنوع ہے، اس کی ہر فصل یا ہر بند کی بحر جن کی تعداد پچیس ہے علحدہ علحدہ ہے، اس لئے بحروں میں بڑی رنگارنگی پیدا ہو گئی ہے، لیکن اس طرز کے نامانوس ہونے کی وجہ سے ایک بحر کو ختم کرنے کے بعد طبیعت دفعۃً دوسری بحر کو قبول کرنے کے لئے مشکل سے آمادہ ہوتی ہے، ایک مثنوی میں تسلسل بیان کو قائم رکھتے ہوئے اتنی بحروں کو جمع کر دینا کیفی ہی صاحب جیسے قادر الکلام شاعر کا کام تھا، اس مثنوی کی معنوی خصوصیات کو ہمارے شعراء کو نمونہ بنانا چاہئے،

صبح مشرق: مصنفہ میاں محمد صادق صاحب ضیا، وکیل آگرہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۵۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت: مجلد عکر، پتہ: مکتبہ قصر الادب آگرہ،

میاں محمد صادق صاحب ضیا چنیٹوی ہونہار شعراء میں ہیں، ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والے انکے کلام سے ناواقف نہ ہونگے، قصر الادب آگرہ نے "صبح مشرق" کے نام سے انکے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے، یہ چار حصوں میں تقسیم ہے، "اذانِ زندگی"، "شوالۂ فطرت"، "عصرِ رنگ و بو" اور "گلبانگ"، پہلے حصہ میں مختلف رنگ کے منظومات ہیں، دوسرے میں فطری مناظر کی نظمیں، "عصر رنگ و بو" کی سرخی اسکی منظومات کی خود ترجمان ہے، اسمیں شباب و متعلقات شباب کی تصویریں ہیں اور گلبانگ میں غزلیں، ضیا صاحب فطری شاعر ہیں، انکے کلام میں شاعری کے تمام عناصر موجود ہیں، غزل گوئی کے مقابلہ میں وہ بحیثیت ناظم کے زیادہ کامیاب ہیں، چنانچہ گلبانگ کے مختصر حصہ کے سوا پورا مجموعہ منظومات ہی کا ہے، اور اسمیں قومی، سیاسی و تاریخی، فطری جذبات، مناظر قدرت، ہر موضوع پر نہایت کامیاب نظمیں ہیں،

"م"

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۱   اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سیّد سُلیمان ندوی

قیمت:- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

جلد ۴۲ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء | عدد ۴

مضامین

شذرات

حاکم یوپی کی وفات،

ہمارے صوبہ کے حاکم نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے ستمبر کی آخری تاریخوں میں اپنے وطن بھیکم پور ضلع علیگڈھ میں وفات پائی، مرحوم کئی سال سے لگاتار بیمار تھے، بخار اور کھانسی کی تکلیف تھی، ضعف کبھی بڑھ جاتا، کبھی گھٹ جاتا، اور آخر اتنا بڑھا کہ پھر نہ گھٹا، چوہتر برس کی عمر میں دنیا کے ہر اتار چڑھاؤ کو دیکھکر اور ہر سرد و گرم گوارا کرکے دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوکر ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو اس ہری بھری دنیا کو الوداع کہا،

مرحوم شروانی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور جیسا کہ وہ فرمایا کرتے تھے، سرسید کی گودوں میں کھیل کر جوان ہوے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم پائی تھی، اور انگریزی اتنی جانتے تھے کہ اخبار پڑھ اور گفتگو سمجھ لیتے تھے فارسی کے شاعر تھے، مرزا سنجر طہرانی سے اصلاحیں لی تھیں، فارسی کا پورا دیوان مرتب تھا، انکی غزلیں اور نظمیں کئی دفعہ انکی زبان سے سنیں اور شاید ایک دو دفعہ معارف میں بھی چھپیں، تقریر شگفتہ اور پر مذاق کرتے تھے،

مولنا شبلی مرحوم کے دوستوں میں تھے، اسی کا اثر یہ تھا کہ وہ مولنا کے کاموں اور تحریکوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ندوہ کی طرف ان کا التفات مولنا ہی کے دم قدم اور قلم کے اشاروں سے ہوا، اور دار المصنفین کی طرف انکی چشم کرم بھی اسی نسبت کی مرہون ہی، دار المصنفین اپنی چوبیس برس کی عمر میں حیدرآباد و بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا ہی تو وہ بھیکم پور کے رئیس کی ذات تھی، مرحوم نے دار المصنفین کی مسجد

پانچہزار کے خرچ سے بنوائی، اور اس کے لئے دری کا فرش اور پردے بنواکر بھیجے،

علیگڈہ کالج ایجوکیشنل کانفرنس مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ اسکول اٹاوہ، الہ آباد یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی دار العلوم ندوۃ العلماء، دار العلوم دیوبند غرض اس صوبہ کا کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ایسا نہیں جو انکے چشمۂ فیض سے سیراب نہیں، بلکہ سنکر حیرت ہوگی کہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس تک ان کے خوان نعمت سے مستفید تھے، وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کے نیک کاموں کی امداد میں حصہ لیتے تھے، مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی کی کوئی تخصیص نہ تھی، غرض جو آیا وہ اپنے نصیب کا حصہ پاگیا،

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و مرغ گرد آیند

مرحوم اپنی ذاتی دولتمندی کے باوجود بیحد سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے اپنے ململ کے کرتے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تین آنے گز کا ہے، اور نہیں ی گانوں کا بنا ہوا ہے، لیکن اس ذاتی کفایت شعاری سے بچایا ہوا سرمایہ بے تکلف سال دو سال میں قوم اور ملک کے کسی کام کے نذر کردیتے تھے، وہ اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے،

نہ کس می دہاند نہ کس می دہد
خدا می دہاند خدا می دہد

مرحوم سے آخری ملاقات پچھلے جاڑوں میں بھیکم پور میں ہوئی، وہ خود بھی اپنی زندگی سے مایوس تھے اور ایسی ہی کلمات اُن کی زبان پر تھے، دیر تک حج کے واقعات اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات بیان فرماتے رہے، زندگی کے اختتام اور کسی نیک عمل کے قبول کی حسرت ظاہر کی، میں نے تسلی دی کہ حاتم کی بیٹی دربار رسالت میں اپنے باپ کی فیاضی کی بدولت عزت کی مستحق ٹھہری، پھر کوئی سبب نہیں کہ آپ کی تمام عمر کی فیاضی کے کام دربار الٰہی میں قبولیت کے مستحق نہ ٹھہریں،

افسوس کہ ہمارے صوبہ کا یہ حاکم ہم سے رخصت ہوگیا، ہر نیک تحریک کا مددگار، ہر اچھے کاموں کا معاون ہر ضرورت پر ہر ایک کے کام آنے والا جاتا رہا، خداوند رحیم و کریم کی بارگاہِ بے نیاز میں دعا ہے کہ وہ مرحوم کے اعمالِ نیک کو قبول فرما کر اس کو اپنی مغفرت کی دولت سے مالا مال کرے، اور مرحوم کے خورد سال جانشین کو عمر و اقبال اور توفیقِ خیر سے بہرہ مند فرمائے،

۱-۲-۳- اکتوبر کو پٹنہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا، کانفرنس اپنی اکتالیس سال کی عمر میں پٹنہ میں یہ پہلی دفعہ ہوئی، اور حق یہ ہے کہ یہ ساری کامیابی ایک محترم خاتون کے سبب ہوئی، اور حافظ کا وہ مصرع جس میں اکبر نے حسب زمانہ اصلاح دی،

زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند

اتنے دنوں کے بعد حرف حرف پورا اترا،

کانفرنس میں مہمان بھی آئے تھے، نمایندے بھی تھے، تجویزیں بھی پیش ہوئیں، آنریبل فضل حق کا خطبۂ صدارت بھی بہت سے اچھے خیالات کا حامل تھا، محترمہ لیڈی انیس امام کا استقبالی خطبہ بھی دلچسپ تھا، گفتگو میں ہماہمی اور روداد میں سرگرمی بھی پوری تھی، مگر اس عطر کی زمین تعلیم کے بجائے سیاست تھی، اور وہ بھی وہ سیاست جس میں عاقبت اندیشی کی جگہ صرف جذبات کی نمایش ہو،

مسلمان ایسے دور سے گذر رہے ہیں جب ایک طرف ایک متفقہ پروگرام، اور سالہا سال کی سوچی ہوئی تجویزیں ہیں، اور دوسری طرف ہنگامی تجاویز، پراگندہ خیالات، اور تعمیرِ ملت کے بجائے صرف ذاتی نمایش کی دھن ہے، یہ الفاظ نہایت ہی درد و کرب کے ساتھ قلم سے نکل رہے ہیں، دل چاہتا ہے کہ پورا مسلم ہندوستان یکجا ہوکر پہلے اپنا تعلیمی مقصد متعین کرتا، پھر اس پر اپنی ملت کی تعمیر کرتا، ع

مسلم خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو،

مقالات

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم

"آج سے پانچ سال پہلے ۱۱ر اپریل ۱۹۳۳ء کو اس موضوع پر جامعۂ دہلی میں میں نے یہ مقالہ پڑھا تھا، اور اس وقت عام طور سے یہ چھپا تھا، مگر اس کو بہت جلد بھلا دیا گیا، آج جبکہ ہندوستان کی سیاسی دنیا نے نئی کروٹ لی ہے، اور تعلیم کا نیا خاکہ ہمارے سامنے رکھا گیا ہے، ضرورت ہے کہ ہم اس کو دوبارہ پڑھیں، اور ممکن ہو تو اس کی روشنی میں ہم اپنی تعلیمی مشکلات کے حل کی راہ ڈھونڈھیں،

اس مقالہ کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ آج جو کچھ پیش آیا ہے وہ کل غور کرنے والوں کے سامنے تھا، اور آواز دینے والا آواز دے چکا تھا کہ برسات آنے سے پہلے بارش اور سیلاب سے بچنے کی تدبیر سوچ لیجائے،

آیندہ اس پر مزید خیالات پیش کرنے کا ارادہ ہے،

"س" ۲۴ر اگست ۱۹۳۸ء

دوستان و عزیزانِ جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے علی گڈہ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ایک مضمون پڑھا تھا، جو نہایت مقبول ہوا

تھا، اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہے کہ "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" کے مسئلہ پر غور کیا جائے،

اسی زمانے میں سرسید مرحوم نے مسلمانوں کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانوں کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا، بہت سے صاحبوں نے اس کا سبب جہالت اور اس کا علاج "تعلیم جدید" کو قرار دیا تھا، چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کرکے عمل کیا اور ان کے بتائے ہوے راستے پر چلتے رہے، اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہئے، ان پچاس برسوں میں ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے، اور ایک منٹ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پچھلی تحریک پہلا موقع تھا جس میں مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اس موڑ پر پہنچ گئے جہاں ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہو گیا، ورنہ ہلاکت کا عمیق غار ان کے پاؤں کے نیچے تھا،

اب یہ کوئی چھپا راز نہیں کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے میں اب بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہیں، پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریاں تھیں، اور یہ یقین تھا کہ سرکاری نوکریوں کا دروازہ اسی کنجی سے کھلیگا لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت میں ہے کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہوگا، پچاس برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعہ کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا:

پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اوسط ہر سال آگے بڑھ رہی ہے، آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ ۱۸۸۰ء میں علی گڑھ سے مولانا شبلی نے اپنے وطن کے دوستوں کو مبارکباد بھیجی تھی کہ

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس

میں پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان ہیں۔" (مکاتیب اول صفحہ ۳۰ طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہر سال انٹرنس اور میٹرک کیا، اس سے دہ چند گریجویٹ ہو رہے ہیں، تاہم اب کیا مسلمانوں کا انحطاط کم ہو گیا اور وہ اب ترقی کر رہے ہیں؟ مولانا شبلی مرحوم جب مولویوں کے مدرسوں کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج آئے تھے، تو وہاں کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے:

"یہاں آکر میرے خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی تماشاگاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمامتر ضعیف ثابت کر دیں گے لاحول ولا، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے،

"سید صاحب (سرسید) نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے، کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ نفس اے، بی، سی، ڈی ہماری کامیابیوں کے خزانے کی وہ کنجی ہے جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آگئی تھی،

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہئے،

تعلیم | تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہیں، اور ہم اپنی زبان میں اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہیں اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے اور آج کل اس کے معنی اس سے بھی زیادہ محدود ہیں، یعنی انگریزی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہیں، ہم نے اب تک بار بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم لی ہے جو عام یونیورسٹیوں کے ماتحت دی جاتی ہے، دوسرے معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے،

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور ان کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جس طرح نجاری، لوہاری، معماری اور دنیا کے اور پیشے ہیں، اگر کوئی اُس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہے تو وہ اسی طرح مورد الزام ہو سکتا ہے جس طرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیوں نہیں جانتا موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے میں یہ چیز حد فاصل نہ تھی، کہ اس میں فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہیں؟ کیا جب عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دیکر تخت و تاج پر قبضہ کیا، وہ اپنی فیصدی تعلیم میں اپنے حریفوں سے بڑھ کر تھے؟ پھر جب ان ہی عربوں کو سسلی میں نارمنوں نے اور اندلس میں اسپینیوں نے اور عراق و خراسان میں تاتاریوں نے شکست دی تو وہ فی صدی تعلیم میں ان نارمنوں اسپینیوں اور تاتاریوں سے کم تھے؟

خود ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک طرف سکھوں نے اور دوسری طرف مرہٹوں نے دیا کر ان کے نظامِ حکومت کو درہم برہم کر دیا تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فی صدی تعلیم میں بڑھ کر تھے؟

عزیزو! یہ "فی صدی" کا لفظ بھی ان منتروں میں ہے جن کو یورپ کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم دنیا میں پھونک رکھا ہے، اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہو گئے ہیں

کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازو سے تول کر جانچتے اور مانتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد میں نہیں بلکہ اس کی کیفیت میں ہے، اگر کہیں صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی تو ۷ ہزار انگریز ۳۰ کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت نہ کر سکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیوں کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے،

قوم کی ترقی کا راز ان واقعات سے جو مشاہدات ہیں یہ راز خود بخود فاش ہو جاتا ہے کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہیں بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور ذہنی قوت میں ہے، اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے فرد اپنے ذاتی اور شخصی اغراض زندگی کے ساتھ ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصود زندگی رکھتے ہوں جس کے حصول میں اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد غرض اس قوم کا ہر فرد پوری طرح مصروف و منہمک ہو اور اسی کی دھن میں اس کا جینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سب کچھ ہو، اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو کہ جب کبھی اس کے سامنے اس کے ذاتی اور شخصی مقاصد اس کے مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہوں تو بے تامل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہاں تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کر دے،

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے، ان کی تحلیل کیجئے تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا، کہ ارکاٹ، سرنگا پٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ اور دلی میں مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستوں اور سلطنتوں کو اس آسانی سے کیونکر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے تھے، ایک طرف ایک متفقہ مقصد، متحد قوت اور منظم طاقت تھی، دوسری طرف منتشر اور پراگندہ اشخاص تھے جن میں سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا، کہیں اگر کوئی خاندان حکمراں تھا تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لئے باہم نبرد آزما تھے، ارکاٹ اور بنگال کی نوابیوں میں کیا

یہی پیش نہیں آیا؟ حیدر علی اور ٹیپو سلطان جنھوں نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھئے کہ ان کی یہ ذہنی مضبوطی ان کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت میں کس طرح ڈھل گئی تھی اور اس وقت تک اس "آہنی انسان" کی قوت میں کمزوری نہیں آئی جب تک کہ اس کے خاندان اور دربار میں وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آگئی، مذہب کی اصطلاح میں اسی ذہنی وحدتِ مقصد کا نام **ایمان** ہے جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہیں مل سکتا،

اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، بہت کچھ اسی مقصدِ عزیز کی گران بہا متاع کی حفاظت، بقا، ترقی اور استواری کی خاطر وجود میں آتی ہے، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، فیاضی، بہادری اور موت سے بے خوفی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں، یہ حقیقت میں وہ جرس ہے جس کی آواز پر قوموں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں، اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں،

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا میں کوئی بھی متحدہ مقصد ہے؟ اگر نہیں تو وہ قوم نہیں بلکہ جانوروں کا گلہ اور حیوانوں کا جھنڈ ہے،

غور سے دیکھئے اسی ملک میں ہندو قوم آباد ہے، اس پر انقلابات کے بیسیوں دور گذر چکے ہیں، صدہا سال کی حیرانی و سرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے، ان کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک، نوکری پیشے سے لے کر آزادی طلب تک، غریبوں سے لے کر دولتمند مہاجنوں تک، محکوموں سے لے کر ان کے رئیسوں اور راجاؤں تک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے کانگریسیوں سے لیکر خوشامدیوں تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے، اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر اور عائق و مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندو ذاتوں کو واحد قوم بنانا اور اس کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک میں مستقل وجود بخشنا اب اس قوم کی ہر کوشش

ہر راہ سے اسی ایک منزل مقصود پر آکر ختم ہوتی ہے، اس کے اہلِ سیاست کی کوشش یہ ہے کہ اسکو سیاسی خود مختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشیں، اہلِ تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے اس کے علم وفن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہیں، اصلاحِ معاشرت کے کارفرما اس کو معاشرتی اور تمدنی طریقوں سے آگے بڑھا رہے ہیں، اہلِ دین اس کی دینی وحدت کی دھن میں ہیں، اہلِ علم اس کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہیں، اہلِ ادب اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق میں مصروف ہیں، انتہا یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتوں کی تفریق کے خلاف حصولِ وحدت کے لئے پسِ دیوار لڑ رہے ہیں، الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتیں اور تدبیریں ہیں، قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کی تکمیل میں مصروف ہیں، اور ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہیں جارہا ہے، جہاں وہ خود جانا چاہتا ہے، اس لئے راہرو اور راہ بر باہم دست وگریباں نہیں،

الغرض قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز "وحدتِ مقصد" کا وجود ہے، یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے اردگرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں، حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان میں، اہلِ پیشہ اپنے بازار میں، عالم اپنی درسگاہ میں، صناع اپنی کارگاہ میں، اخبار نویس اپنے دفتر میں، یہاں تک کہ اس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ میں اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں، اور مرتے ہیں،

تعلیم کا پہلا مقصد مقصدِ زندگی کی تبلیغ تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے، قوم کے ہر فرد میں بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اس کی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اس کے حصول اور بقا کی خاطر آزمایش اور امتحان میں پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے،

ہم کو پہلے سوچنا چاہئے کہ اوّل مسلمانوں کے سامنے اور خصوصًا ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی؟ اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی درسگاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے؟

ہمارا پچھلا نظام تعلیم کتنا ہی بُرا سہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیرسایہ علوم و فنون کی تحصیل تھا، اس مقصد کا اثر یہ تھا کہ تعلیم ہمارے نظام زندگی میں ایک دنیوی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا، یہانتک کہ کتابیں اور کتابوں کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب و احترام کے قابل تھے، ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی، اور اس کی خدمت کے لئے ہر علم و فن کو سیکھتے تھے اور پڑھتے تھے، ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا، اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیرمسلم قوموں سے لئے، مگر غور سے دیکھئے کہ ہمارے اسلاف نے ان میں پوری اصلاح و ترمیم کرکے ان کو اپنے نصابِ درس میں اس طرح رکھا کہ وہ آج تمام تر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں، ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہیں دہریت سکھاتا ہے، جب وہ ہماری مشرقی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے تو پہلے اعوذ باللہ اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے تو نیچر اور فطرت کے بےحس اور بےجذباتی ناموں سے اس کی تعبیر نہیں ہوتی، بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدءِ فیاض کے فلسفیانہ لیکن باادب ناموں سے اس کی تعبیر کیجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درسگاہوں کے طلبہ میں بےدینی یا مذہبی بےحسی پیدا نہیں ہوتی،

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا تو قرآن پاک کی اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بتائے گا کہ ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا، (جس کو حکمت دی گئی اس کو

بڑی نیکی دی گئی، جب ہیئت وفلکیات کا درس دے گا تو تمہید میں یتفکرون فی خلق السموات والارض
اور ربنا ماخلقت ھذا باطلا اور لتعلموا عدد السنین والحساب اور فلکیات کی دوسری مناسب
آیتوں کو پہلے پیش کرے گا، جغرافیہ کی کتاب لکھیگا تو کہیگا کہ یہ سیروا فی الارض کی تفسیر ہے، علم طب
پڑھائے گا، تو شفاءٌ للناس اور العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان کو دیباچے میں ذکر کریگا
فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالیؒ کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے بڑھتا ہے، من
لم یعرف الھیئۃ والتشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو
نہیں جانا تو وہ خدا کی معرفت میں نامرد ہے) غرض جس علم وفن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے
رکھتی تھی، اس کو اپنے مقصد میں رنگ کر پیش کرتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر عقلی علم وفن اور ہر دنیاوی
صنعت وہنر بھی سرتاپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا تھا، ہمارے اساتذہ آج کل کے
علمی دوکاندار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہیں بلکہ وارث پیغمبر، نائب رسول اور روحانی باپ
کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ استاد کے رنگ میں رنگ کر
ظاہر ہو اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد وستد کا معاملہ اور ایک سے لینے اور دوسرے
ہاتھ سے دینے کی بنیوٹی اور مزدوری کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ
اس لئے اس راہ میں ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر ومناظر پیش ہوتے تھے، جن کو آج کل
لوگ مشکل سے باور کرسکتے ہیں،

آجکل کی تعلیمی تاریخ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ چند روپیوں کی خاطر استاد اس کالج سے
اس کالج اور اس یونیورسٹی سے اس یونیورسٹی میں دوڑے پھرتے ہیں، اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی
عزت کا ذریعہ جانتے ہیں، اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپیے کے اضافوں کی خاطر زمین آسمان
کے قلابے ملاتے رہتے ہیں،

ہم دنگ رہ جاتے ہیں، لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانے والی دوربینیں ہوتیں تو آپ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، صنعا، قاہرہ، بغداد، بخارا، ہرات اور نیشاپور میں ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ سکتے، میں اس عہد کی صرف دو درسگاہوں کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، ایک کوفہ میں حضرت امام ابوحنیفہ کی درسگاہ اور دوسری مدینہ منورہ میں امام مالک کی، ابوحنیفہ کے حلقۂ تعلیم میں مکہ، مدینہ منورہ، دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، قومس، دامغان، ترمذ، ہرات، نسا، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے، ذرا نقشے میں ان شہروں کے بعد مسافت پر نظر ڈال لیجئے،

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ میں ہے، حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجیں اٹھتی ہیں اور یثرب کی پہاڑیوں سے آکر ٹکراتی ہیں، عرب کے شہروں میں مکہ معظمہ، صنعا، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہروں میں سے ایلہ، دمشق، عسقلان، فلاطا، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور، اور انطاکیہ، اور عراق کے شہروں میں سے بغداد، بصرہ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رملہ اور ممالک عجم میں سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین، قوہستان، چغان، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہرات، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا، مشرق ہوچکا، اب مغرب کی طرف چلئے، مصر کے شہروں میں قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسفان، تنیس اور شمالی افریقہ اور اسپین کے شہروں سے افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، بسطنہ، باجہ، قرطبہ، سرقسطہ اور اٹلی کی سسلی اور ایشیاے کوچک کے سمرنا ازمیرا سے طالب علم آ اور جارہے تھے،

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن میں رہے، کہ اس وقت دنیا میں نہ آج کی طرح ریلیں تھیں جنھوں نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے، اور نہ دخانی جہازات تھے جنھوں نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے، اور برسوں کے سفر کو ہفتوں اور مہینوں کے راستوں کو دنوں میں اور دنوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کرتے ہیں، اور نہ ڈاک اور تار کے یہ انتظامات تھے جو گھر بار اور اہل وطن کی خبریں دمبدم پہنچاتے رہتے ہیں، اور نہ یہ ہوٹل اور مسافر خانے تھے جو مسافروں کو گھروں سے زیادہ آرام پہنچاتے ہیں، اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا جو رتی سے پہاڑ تک کا انتظام آپ کے لئے شہر شہر کرتی پھرتی لیکن ایک لمحہ ٹھہریے، یہ گذشتہ عہد کی داستانِ کہن استخواں فروشی کے لئے آپ کو نہیں سنائی گئی ہے، بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کونسا جذبہ تھا جو طالب علموں کو اس زمانہ میں اس طرح کوچہ بہ کوچہ، شہر بشہر اور ملک بہ ملک لئے پھرتا تھا کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈراتے تھے نہ دریا عائق ہوتے تھے، پھر وہ کیا جوش و خروش تھا جو ان کو اس راہ طلب میں اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا،

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت ‌‌ ‌‌ دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

عزیزو! وہ صرف ان کا وہ مقصدِ زندگی اور نصب العین تھا جس کو "دین کا ولولہ" اور "مذہب کا جوش" کہتے ہیں، یہ ان کی زندگی کی روح تھی اور ان کی حیات کا مقصد، ان کے قبضے میں یہی وہ خزانہ تھا جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک بامراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے عبارت ہیں، چل رہے ہیں،

اس سے دوسرے درجہ پر جو جذبہ ہے وہ سیاست کا ہے، اگر اسلام میں دین خود سیاست ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سیاست کا جذبہ اس میں دین کے تحت ہے، ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشائی ہوں یا اروپی، سب کے سب سلطنت میں برابر کے حصہ دار ہیں، اسلام میں صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری اور قوموں کو غلام بنانے کی

ینت سے نہیں بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانوں میں قومیت، وطنیت اور رنگ روپ کی مختلف برادریوں کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہو جائے، انسانوں کے درمیان طبعی اور فطرتی تفرقوں کو "ملیت" کی بنیاد نہ قرار دیا جائے جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہیں سکتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں کبھی وسعت پیدا ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جن کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان اس میں داخل ہو سکتا ہے، اور ملت کا دروازہ ہر متنفس کے سامنے کھلا رہتا ہے، اور اس کی وسعت میں ساری دنیا کبھی سما سکتی ہے،

توحید اسلام کی وہ روح ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا اور کم از کم بارہ سو برس تک اس نے ہر میدان میں اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا اور چند روز میں نو مسلموں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لیکر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا، افریقہ میں بحری جزیروں میں اور مختلف ملکوں کے دور و دراز گوشوں میں اس طرز سیاست نے بڑی بڑی ریاستیں اور حکومتیں کھڑی کر دیں، اسی طرح غلاموں کو اسلام کی آزادی سے مالا مال کر کے ان کو شمشیر زنی، کشور کشائی اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا، مصر میں غلاموں کی سلطنت صدیوں تک اسی طرح چلتی رہی ہے، اسپین اور مراکش کے فاتح یہی بربری نو مسلم ہیں جنھوں نے بار ہا شمالی افریقہ میں حکومتیں کیں،

وہ کون سا جذبہ تھا جو نو مسلم ترکوں، تاتاریوں اور مغلوں کو ایک علم کے زیر سایہ منظم کر کے چین کی دیواروں سے لے کر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکوں پر ان کو بارہا حکمران بناتا رہا، سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچا، اور پھر غزنی میں بیٹھ کر وہ خاندان پیدا کرتا ہے، جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہے، غور کے نو مسلم جو محمود ہی کے مسلمان بنائے ہوئے ہیں، وہ اٹھتے ہیں اور آندھی کی طرح غزنی سے لے کر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہیں،

ان مثالوں سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں دکھاؤں کہ اسلام نے کیونکر دین ہونے کیساتھ سیاست کا فرض انجام دیا، دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پرزور اور قوی ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، ؎

عشق خود راہ است و ہم خود منزل است

وطنیت | با ایں ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہیں برتا جا سکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں جو فسا د برپا کر رکھا ہے اس کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومیں اور جماعتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہوں کہ حریف ہماری صفوں کو چیر کر درہم برہم نہ کر سکے، اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان میں تطبیق دیجائے جس طرح ہم عقل و نقل اور معقول و منقول کو تطبیق دیتے ہیں، غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہیں جنہیں کبھی صلح نہیں ہو سکتی، اسلامیت کے حامی ہر چیز میں مسلمانوں کی علیحدگی کے خواہاں ہیں، اور وطن کی دوسری قوموں سے مل کر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کر کے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف وطنیت کے طرفدار اس تفریق و امتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے تبری کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں، پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بیزاری ہے اور یہ دونوں نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لیجائے ہیں؛ حالانکہ جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ممکن ہے۔ ایسے ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کے نظریۂ سیاست نے امکان کو واقعے کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے، کیا سنہ ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت میں پست تھا اور موجودہ عہد کی

تحریک میں جمعیتہ خادمان وطن کانگرسی خدمت گذاروں سے کسی بات میں کم ہیں، حالانکہ سب کو علم ہے کہ جمعیتہ العلماء سرتاپا مذہبی جماعت ہے، اور باایں ہمہ وطنی خدمات میں خالص وطن پرستوں سے کسی طرح کم نہیں، میرے نزدیک جس طرح ندوۃ العلماء کی درسگاہ عقل و نقل کی تطبیق ہے، جامعہ ملیہ اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق ہے، اور اسی لئے یہ دونوں درسگاہیں مسلمانوں کی آیندہ تعلیم میں بہت بڑا اثر رکھینگی،

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکش کا بہترین فیصلہ نہ کریں گے، اس ملک میں ان کا مستقبل صدر درجہ خطرناک رہیگا،

ہندوستان میں اسلامیت اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکوں میں جہاں مسلمانوں کو تعدادی اکثریت حاصل نہیں ہے، ان کے دینی اور وطنی فرائض میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ خالص مذہبی اور قومی امور و مسائل میں اپنی حکومت کے زیر سایہ نیم خودمختاری حاصل کرکے ملک کے عام سیاسی و انتظامی امور و مسائل میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ اشتراک عمل کریں، صاف لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے اپنے مذہبی و تمدنی مسائل میں جن سے قومیت عبارت ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خودمختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی سیاسی انتظام و مسائل میں وہ دیگر فرزندانِ وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہوکر اپنی تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراک عمل کریں، موجودہ سیاسی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں، کہ ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلاشرکت غیرے "کلچرل آٹانومی" حاصل کریں اور دوسری طرف عام ملکی سیاسیات میں وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شریک رہ کر اپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمایندگی پر قناعت کریں، اس طرح مسلمانوں کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہوجاتی ہے، اور دوسری طرف ان پر وطنی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہیں ہوتا؛ جن مذہبی و قومی اغراض و مصالح کی حفاظت کی خاطر وہ نمایندگی اور انتخاب نمایندگی کی علحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں وہ بجائے خود علحدہ

نمایندگی سے طے ہونگے، اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات میں ان کو دوسروں سے نہ کوئی رعایت چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبہ کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ لوگوں کو عام ملکی معاملات و سیاسیات میں ان کی مخصوص قومی معاملات میں علٰحدگی کی بنا پر ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے،

اس طرح مسلمانوں کی دو مجلسیں ہونگی، ایک خالص اسلامی جو ان کے خالص اسلامی اُمور و معاملات کا فیصلہ کرے گی، اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل کا تصفیہ کرے گی،

میں نے جہانتک ان مسائل پر غور کیا ہے اس سے زیادہ بہتر حل اس مشکل مسئلہ کا نظر نہیں آتا، یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے میں جو پہلے سے ملک میں رائج نہ ہو ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے، مگر جس طرح نئی اصلاحات کے ہر نظام کو بالآخر ہم طے کر کے عمل میں لاتے ہیں اسی طرح اس پر بھی ہم عمل کر سکتے ہیں،

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہوگا کہ ہندوستان میں ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہیں:

۱۔ پیغامِ اسلام کی تعمیل، حفاظت اور بقا،

۲۔ اس ملک کے لئے ایک عام جمہوری نظام حکومت کا قیام،

۳۔ اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص "اسلامی کلچرل آٹانومی" کا قیام،

یہ وہ مقاصد ثلاثہ ہیں جن کو ہم اپنی قومی زندگی کی روحِ عمل قرار دے سکتے ہیں، ان کے لئے جدوجہد اشاعت و تبلیغ اور بالآخر کامیابی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل پروگرام ہو سکتا ہے،

شاید اس موقع پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی باز پرس کیجائے، لیکن اگر میری تقریر کا پچھلا

حصہ حاضرین کے ذہن نشین ہو تو یقیناً وہ میری طرف سے اس بازپرس کا جواب دے سکتے ہیں، میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو ان کی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کرکے ان کو سرتاپا عمل بنائے، دنیا میں آج جہاں کہیں کوئی قومی حکومت ہے اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی بنیاد قائم ہے، انگلستان میں جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزوں کے تعلیمی مرکز ہیں، اسی طرح ان کے نظری سیاسیات کے مرکز بھی ہیں، وزیر اعظم سے لیکر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہوں کے احاطوں میں آکر اپنی سیاسیات کے نظریوں کو بیان کرتا اور وہاں کے طالب علموں کو آیندہ کی سیاسی ذمہ داری کیلئے تیار کرتا رہتا ہے،

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے تو میں کہونگا کہ اس کا سب سے بڑا ظلم اس ملک کے بچوں کی بے مقصد تعلیم ہے جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہے اور دنیا میں ایک ایسی قوم کی تخلیق کی ہے جس کی زندگی کی کوئی غایت نہیں ہے، سبب کھلا ہوا ہے، انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہیں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا، اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانوں کی اور دوسری قوموں کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کردی جائے، جس سے قومی و مذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ سے خالی کردیا جائے،

دوسری طرف اس کو اپنی سلطنت کے چلانے کے لئے ایسے کم قیمت دیسیوں کی ضرورت تھی جو اس کے محکموں کے دفتری کاروبار کو سنبھال سکیں، اس لئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جس میں کوئی زندگی نہ تھی اور علوم میں سے بھی صرف وہ چیزیں سکھائی جائیں جن کی ضرورت آیندہ بننے والے کلرک (بابوؤں) کو پیش آسکتی ہے،

اسکول تک ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے؟ ایک ایسی بدیسی زبان جس کے ذریعہ سے ہم اپنے

افسروں سے گفتگو کرسکیں اوران کے لئے ان کی زبان میں مواد مہیا کرکے رکھ سکیں، اور جغرافیہ جس میں زیادہ تر ہم یہ جانیں کہ وہ دنیا کے کون کون سے برّاعظم جزیرے اور ٹاپو ہیں جہاں وہ علم لہراتا ہے جس کا آفتاب دنیا سے کبھی نہیں ڈوبتا اور تاریخ جس میں ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے، کہ ہندوستان کی موجودہ قوموں نے کیونکر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے، تاکہ اس ملک کی قومی تفریق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے،

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈوں کا ذکر ہوتا ہے، پڑھ کر بے انتہا ہنسی آتی ہے، ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جو انتظامات کئے ہیں ان کا ذکر ہوتا ہے، پھر وہ رخصت ہو کر جب جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے تو پھر اِن ہی مناقب کی تکرار ہوتی ہے، اس لغو طریقۂ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جاسکے، اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ نصاب اختیار کرنا چاہئے جن سے ہمارے قومی مقاصد کے جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو اور قوم کو زندہ قوم، سرگرم عمل قوم اور بامقصد قوم بنائے،

ہم نے ہزاروں لاکھوں کے صرف سے ملک میں جابجا اسلامی اسکول، اسلامی کالج بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے، لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے کہ قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہیں اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچا ہے، بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹروں اور پروفیسروں کی پرورش ہوتی ہے، اور کچھ مسلمان طالب علموں کو کلاس میں جگہیں مل جاتی ہیں، مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمایہ سے سرکاری نظامِ تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دیتا ہے تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہیں، کہ قومی سرمایہ سے جو اسکول اور کالج قائم ہوتے ہیں وہ قومی نتائج کے لحاظ

سرکاری مدارس سے کس حال میں بہتر ہیں؛ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت میں بہتر یہ ہے کہ ہم اس سرمایہ کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہروں میں صرف اسلامی دار الاقامے قائم کرنے میں صرف کریں کہ ان اسلامی اسکولوں اور کالجوں سے جو فائدہ پہنچنا ممکن ہے وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ دار الاقامے کی حیثیت سے ہے،

بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ ہے کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربے کو جھٹلانا ہے اور اس تعلیم نے صرف نوشت و خواند کے ہنر کی تعمیم و اشاعت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچایا ہو مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی میں اس سے فائدے کے بجائے روز افزوں نقصان پہنچ رہا ہے، مذہبی مقصد زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرف لایعنی جسکا زبان پر لانا بھی پہلے مشکل تھا اب وہ برملا ادا کئے جا رہے ہیں، اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور خیالات و اعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور ایک ایسی قوم پیدا ہو رہی ہے جو ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے حکمران قوم کے لفافے کی صرف نقل ہے،

مسلم یونیورسٹی کے لئے ۱۹۱۰ء میں جس وقت ملک میں جوش و خروش برپا تھا، مولانا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد میں اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرع یہ ہے،

کایں سررشتہ تعلیم ما در دست ما باشد

لسان العصر اکبر مرحوم نے فوراً اس پر برجستہ جوابی نظم کہی تھی جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے،

"مگر دست شما دست شما باشد"

لوگوں نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال وجواب پر محمول کیا ہو مگر بیس برس کے بعد معلوم ہوگیا کہ لسان العصر نے جو شبہ ظاہر کیا تھا وہ شبہ نہیں حقیقت تھا، اس طول بحث اور درازنفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آجانا چاہئے کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملّی زندگی کا مقصد معین کرنا چاہئے اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہئے اور آیندہ ہماری درسگاہیں صرف نوشت وخواند کا حرفہ اور پیشہ سکھانے کے لئے نہ ہوں، بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے ہوں،

اسی لئے مسلمانوں کی آیندہ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ایسی درسگاہیں بکثرت قائم کیجائیں، جو بامقصد ہوں اور ان کا سررشتہ واقعی مسلمانوں کے حقیقی ہاتھوں میں ہو مسلمانوں نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی، مگر انھوں نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہیں کیا کہ یہاں کے کروڑوں دماغوں کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھوں میں لے کر ان کو مذہبی وقومی جذبات سے یکسر خالی کردیں اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس نظام تعلیم سے علانیہ بغاوت کریں اور ایسی درسگاہوں کی بنیاد قائم کریں جو ان کو ان کی زندگی کا مقصد بتائیں، اور ان پر ان کی حیات ملی کے اسرار کھولیں،

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانوں کی زندگی کا تنہا مقصد تھی، اس وقت ملک کی عربی درسگاہوں پر یہ پھبتی کہی جاتی تھی کہ یہ اپاہجوں کے پیدا کرنے کی کلیں ہیں، اس طعن کو قبول کرلینے کے بعد بھی ہم یہ دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و متبذل حالت میں ہوں تاہم وہ بامقصد ہیں اور اپنے مقصد پر ان کو ناز ہے اور زمانے نے بتادیا کہ زمانے کی بے التفاتیوں اور بے توجہیوں کے باوجود زندگی رکھتی ہیں اور آپ کو سنکر تعجب ہوگا کہ آجکل کے ایک بڑے سرگرم کانگریسی نے مجھ سے یہ کھلا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے میں اُسم ان پر عمل کرنے میں آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ سے

بڑھ کر ثابت ہوئے، اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہے کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری اور سرکاری اعزاز کی تلاش نہیں جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کر دیتی ہے،

مسلمانوں کی علحدہ تعلیم | اوپر کے معروضات اگر ذہن نشین ہوں تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہئے، کہ مسلمانوں کی بامقصد تعلیم کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ان کی قومی درسگاہیں بالکل الگ ہوں جہاں انکو خاص ان کے مذہبی و قومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دیجائے، ہمارے بہت سے مسلمان دوستوں کی یہ خواہش ہے کہ سرکاری کونسلوں میں ان کی نشستیں معین ہوں، اور ان نشستوں کا انتخاب مخلوط نہ ہوتا کہ مسلمانوں کی مستقل ہستی قائم رہے، میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستوں میں عدم مخلوط انتخاب سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تاکہ ان کی علحدہ قومی ہستی فنا نہ ہو جائے، اور ان کے قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہو جائے،

اسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے، مسلمان ملک کی دوسری قوموں کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹکس ادا کرتے ہیں، لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں، اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول تقریباً ہندو اسکول ہیں، وہاں کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے لحاظ سے تمامتر ہندو ہے، مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے یکسر عاری ہیں، ایسی حالت میں مسلمان طلبہ کا ان میں کم ہونا قدرتی ہے،

یہ تو ان مدارس کا سلبی پہلو ہے، ایجابی پہلو یہ ہے کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مکاتب دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمامتر کفیل ہیں، مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے بجا طور پر احتراز کرتے ہیں اور نہ خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع سلسلہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں، ایسی حالت میں دوسری قوم کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ابتدائی تعلیم میں

کم ہونا بالکل کھلی بات ہے، یوپی میں سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اسی لئے ناکام ہے کہ ان کیلئے بھی ان کے سررشتے کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے، جو ہمارے اغراض کے مطابق نہیں،

مکتبی تعلیم کا نظام | پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے، بجا شخصی یا جماعت کے چندوں سے کہیں کہیں بعض مکتب ہیں جن میں سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم اور الگ نصاب پر جاری ہے اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے، پورے ملک میں چھوٹے بچوں کا ایک بھی معیاری مکتب نہیں جو چھوٹے بچوں کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے، جامعہ ملیہ کے کارفرما دوستوں اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے میں نے اس ضروری تجویز کو پیش کیا ہے، مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کر رہے ہیں، اور ان کے احاطے میں اس قسم کے معیاری مکتب کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے، گورکھپور میں انجمن اجرائے مکاتب کے نام کی ایک مجلس نے چند سال سے کام شروع کیا ہے، اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلع میں قائم کئے ہیں، اسی قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلع میں ضرورت ہے، جن کے پیش نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو، اور ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے اپنے ان مکتبی سلسلوں کے لئے مالی امداد کا جائز مطالبہ کریں، اور جب کبھی ہندوستان کے نظام حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ مطالبہ کریں کہ مسلمانوں کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغہ کے سپرد کر دیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے میں کر رہے ہیں،

میری اس گذارش سے اس نتیجے تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کے لئے مسلمانوں کے غیر مخلوط انتخاب کے مطالبے سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے، خصوصاً جب وہ وقت آنیگا کہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ ہو اس وقت مسلمانوں کے لئے علیحدہ مستقل نظام تعلیم کی ضرورت آج سے زیادہ عیاں ہو جائے گی،

ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کیجائے، اور اس کے لئے ٹرینڈ معلم تیار کئے جائیں اور بچوں کے نفسیات سے باخبر اہل قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائیں جو سادہ سے سادہ سہل سے سہل ہو، حمایت اسلام لاہور کا نصاب بہت کچھ مقبول ہے، مگر افسوس ہے کہ اس میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتی گئی ہے، مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب میں محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفوں سے مرکب ہیں، استعمال کئے گئے ہیں، کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے، نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہوں، ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو،

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے، لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لئے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے، میرا تجربہ ہے کہ پہلے بچہ کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو دان ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے اس کے بعد قرآن پاک شروع کرایا جائے، اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری نفاست کتابت میں کیجائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں، اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کیجائے تاکہ اختلاف صور بچوں کے ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کردے،

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے، افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے ادھر توجہ نہیں کی ہے،

بچوں کے لئے جو نصاب بنایا جائے اس میں شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی اور قومی روح کی تربیت کرے، بدیسی نظام تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ اور بے مزہ قصے ہمارے بچوں کے لئے وہ غذا ے فاسد ہے جو جزو بدن نہیں ہوتی بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کر ڈالتی ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ یہ بےمقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کارآمد نہیں،

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہر حال انھوں نے اتنا پورے یقین کیساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہے کہ اگر ہمکو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے، چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے، امریکہ کے ایک مشنری رسالے "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی، ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ جس نے کل کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے، ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے یا کیونکر ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ . . . . . .

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے، اللہ تعالیٰ پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے،

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے، ہم ترک ہیں، ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں، ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا، اور ہمیشہ دشمنوں پر فتحیاب ہوگا، جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے، میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے، میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں، جو میرے محبوب ملک کو

نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں "

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پالیا ہے، اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے، یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ان کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے،

اخلاق کی تعمیر تعلیم کا دوسرا حقیقی مقصد اخلاق کی تعمیر ہے، مذہب اور فلسفہ دونوں نے اس کو اصولاً مان لیا ہے کہ انسان بہت سی باتوں میں مجبور ہونے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی آزادی بہرحال رکھتا ہے، اور یہی آزادی اس کی ذمہ داریوں کی بنیاد ہے،

غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

لیکن انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوقات اس کشمکش کے اختیار سے بھی محروم ہیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنی جبلت یا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور محض ہیں، اور ان لوازم خصائص اور اثرات کی بجا آوری پر مضطر ہیں جن کے لئے ان کی خلقت ہوئی، آفتاب سے نور ہی ظاہر ہوگا گلاب سے خوشبو ہی نکلے گی اور سنکھیا سے موت ہی صادر ہوگی، مگر انسان سے نور اور تاریکی، خوشبو اور بدبو، حیات اور ممات دونوں صادر ہوسکتی ہیں، اس کے اخلاق اور خصائل تربیت پذیر ہیں اور اسی لئے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہے،

دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ کائنات کی ہر مخلوق فطرةً اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن انسان تھوڑا اختیار پاکر فعل اور ترک فعل کے درمیان ترجیح کا حق رکھتا ہے، اس لئے ضرورت اس کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ پہلے ان اغراض کو سمجھے جن کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، اور پھر ان اغراض کے مطابق اپنے کام کو پوری مستعدی اور دیانتداری سے انجام دے، خلقت کے صحیح اغراض کے سمجھنے کا نام "تعلیم" ہے، اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام

"تربیت" ہے اور ان تربیتی اعمال کا نام "اخلاق" ہے تعلیم کی بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ ان اخلاق کی صحیح تعمیر کیجائے تاکہ وہ فرائض بخوبی ادا ہوں جن کے لئے وہ اس دنیا میں آیا یا بھیجا گیا ہے،

ہماری موجودہ تعلیم جس طرح بے مقصد ہے اسی طرح یہ تمام تر بے اخلاق بھی ہے، ملک میں مسلمانوں کی ایک درسگاہ بھی ایسی نہیں ہے جس نے اخلاق کی تعمیر اور تربیت کی اہمیت کو سمجھا ہو، اور جس نے اپنی زندگی کا مقصد "با اخلاق انسان" کا پیدا کرنا قرار دیا ہو، اسی لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عزت ہماری نگاہوں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے کہ نئی تعلیم کی درسگاہوں میں یہ پہلی درسگاہ ہے جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے،

عموماً اخلاق کے معنی ہماری زبان میں نہایت محدود ہیں، اخلاق کے لفظ سے ہمارا مقصود یہی محدود معنی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر وسیع ہے، اخلاق سے مقصود انسان کی قوت نفسی کی ایسی تربیت اور مشق ہے جس سے وہ اپنے شخصی، انسانی اور قومی فرائض کے ادا کرنے کی پوری استعداد اور صلاحیت پیدا کرلے، درسگاہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے احاطہ کے اندر ایسی فضا اور ماحول پیدا کرے جو دنیا کی فاسد اور مسموم آب و ہوا سے محفوظ ہو کر صالح اور صحیح اور طاقت ور آب و ہوا کی جگہ ہو، اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے درسگاہ ایک قسم کا سینی ٹوریم یعنی دار الصحت ہو جہاں فاسد جراثیم ہلاک ہو کر بیمار صحیح و تندرست ہو جاتا ہے،

ہمارے گھروں کی اخلاقی اور مزاجی کیفیت جس درجہ خراب اور فاسد ہے، اسی نسبت سے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں کا ماحول زیادہ صالح صحیح اور طاقت بخش ہو تاکہ گھروں کی مسموم فضائے علٰحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق و خصائل کے حامل ہوں، اور اس طرح ایک دن وہ آئے کہ پوری قوم کی قوم ان اخلاق و فضائل سے متصف اور مزین ہو جائے،

۱۔ سادگی اور صفائی

ہماری درسگاہوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سادہ لیکن صاف ستھرا رہنے کی اہمیت ذہن نشین کریں، صاف ستھرا رہنے کے معنی بیش قیمت کپڑے، اعلیٰ درجے کے مکان اور قیمتی فرنیچر اور سامان کے نہیں ہیں، افسوس ہے کہ اکثر مسلمان بچوں نے اس کے یہی معنی سمجھے ہیں، اس کے دو بڑے نتیجے کھلے طور سے ہمارے بچوں میں پیدا ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنی اندرونی صفائی کے بدلے ظاہری ٹیپ ٹاپ پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تعلیمی زندگی نہایت گران ہے اور وہ اپنے والدین کے لئے سراسر کوفت بنے ہوئے ہیں، دوسرے خود طالب علم بھی اپنے حوصلہ کے مطابق اپنی آمدنی نہ پانے سے ملول و غمگین رہتے ہیں جس کا اثر ان کی طبیعت کی تیزی اور ذکاوت پر بہت برا پڑتا ہے، اور ان کا جو وقت اپنے تعلیمی مسائل اور مباحث کے یاد اور حل میں صرف ہوتا وہ ان کے بناؤ سنگار میں اور جو نہیں ہے اس کے حصول کی فکر اور ناکامی کے غم میں بسر ہوتا ہے

ہمارے طالب علموں کی زندگی سادہ لیکن صاف ستھری ہونی چاہئے، ان کو شروع ہی سے یہ بتانا چاہئے کہ تمھاری عزت تمھارے بیش قیمت کپڑوں اور اعلیٰ سامان سے نہیں بلکہ تمھارے بیش قیمت علم اور اعلیٰ اخلاق سے ہے، طالب علموں کے اندر بڑائی اور مسابقت کا معیار ظاہری نمایش اور آرایش کا سامان نہ ہو بلکہ اندرونی لیاقت اور قابلیت کا جوہر ہو،

مسلمان طالب علموں کو جو مسرت اور نمایش پسند قوم کے افراد ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ بات جتانی چاہئے کہ اب وہ وقت نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کے بقیہ متمولانہ اثرات کی پیروی میں وہ گران نمایشی زندگی اختیار کریں جو ہم کو اپنے والدین سے ورثہ میں مل رہی ہے، کیونکہ وہ دولت ختم ہو چکی اور وہ تمول اب سراب ہے، اس لئے اس کے نمایشی فخر و غرور کے اسباب کو بھی ختم ہو جانا چاہئے، ورنہ یہ تعلیم ہمارے افلاس میں روز بروز اضافہ کرتی جائے گی اور قوم

کی حالت ہر روز بد سے بدتر ہوتی جائے گی، اس کی مثالیں آج بہت سے خاندانوں میں ملینگی کہ نئی تعلیم کی اس غلط تربیت نے ان خاندانوں کی مالی حالت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے،

دنیا کے دوسرے ملکوں سے بہت بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ ایسی قوم کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں حد درجہ کفایت شعار اور سادہ واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے ذاتی اور قومی مصارف ہمارے مقابلے میں بہت کم ہیں، بنابریں اس کے پاس ہمارے مقابلے میں دولت کی فراوانی ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ جس خرچ میں ہم اپنے ایک بچے کو تعلیم دلا سکتے ہیں ہمسایہ قوم اپنے کئی بچوں کو تعلیم دلاتی ہے، پھر دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فضول کاموں کے لئے اپنے بزرگوں کی متروکہ جائدادوں کو قرض میں رہن رکھکر بیچنے پر اور وہ اس کے خریدنے پر مجبور ہیں،

آجکل عام طور سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہماری درسگاہیں اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات میں بیش از بیش نمایش پسندی میں مبتلا ہیں، ہماری گذشتہ تعلیم کے عہد میں ہماری مسجدیں ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال اور مسجد کا فرش ہماری میزیں اور بنچیں اور کرسیاں تھیں، صرف ان ہی دو مدوں کی کفایت کا اندازہ موجودہ گراں طریقۂ تعلیم سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر مقصدوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے، لیکن اس کے بانیوں کی ساری محنت زمین، اینٹ اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے،

ہمارے دارالاقاموں میں سب سے بہتر دارالاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے طالب علموں کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے اور ان کے رہنے کے لئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے حالانکہ یہ تمامتر ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریب نظر ہے اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی بدنی

ہے جو ہماری تباہی کی تمامتر ذمہ دار ہے،

ان سب کے بجائے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ سادگی اور صفائی ہے، ہمارے نوجوانوں نے صفائی، اچھے کپڑوں، فیشن ایبل بالوں، خوشبو، عطروں اور تیلوں کا نام رکھا ہے حالانکہ وہ حقیقت میں گھر کی صفائی، کمروں کی صفائی، کپڑوں کی صفائی اور بدن کی صفائی کی اصلی دولت سے محروم ہیں، طالب علموں کو اس بات کی عادت سکھانی چاہئے کہ وہ کیونکر اپنا کمرہ، اپنا سامان، اپنے کپڑے اور بدن کو صاف رکھیں جس سے وہ جسمانی و ذہنی صحت اور وہ صفائی اور ستھرائی جو نصف دین اور اصلی تمدن ہے حاصل کریں،

۲- جفاکشی

اس کے بعد وہ سب سے بڑا اخلاقی جوہر جس کے حصول پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ زندگی موقوف ہے، جفاکشی ہے، ہم نے اسلامی اصطلاحات میں "جہاد" کا نام سنکر اپنی روشن دماغی کے ثبوت میں کتنی دفعہ اس سے تبری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اے عزیزانِ محترم! اب وقت ہے کہ ہم جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھیں اور برت کر دکھائیں، جہاد جہدؐ سے مشتق ہے جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہیں، حق کی راہ میں ہم جو تکلیف اٹھائیں وہ ہمارا جہاد ہے، دنیا کی زندگی سکون پر نہیں، دائمی حرکت پر قائم ہے، غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ ہم جس قدر سکون پائیں گے اسقدر آرام اٹھائیں گے پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا ہے،

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را دویدن، رفتن، استادن، نشستن خفتن و مردن

لیکن حقیقت میں یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے، راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل فصیح عرب کہتا ہے "فی الحرکۃ برکۃ" جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصلی لطف ملتا ہے، اور جو آنکھیں بیدار رہی ہیں وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں، اسی طرح محنت و مشقت کے بغیر آرام و راحت کا وجود

ہی نہیں ہوسکتا، جب تک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤں پر نہ ٹپکے گا، جو روٹی ہمارے ہاتھ آئیگی وہ ہمارے احساس کے ذائقے کو بھی تسکین نہیں دے سکتی،

سست امیروں کی پرلطف غذائیں ہی وہ جراثیم ہیں جو ان کی بیماریوں کو پیدا کرتے ہیں ایک محنتی مزدور چونکہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے، وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اس کی صحت کا خزانہ ہوتا ہے،

مسلمانوں کو بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہئے، ان کی طالب علمانہ زندگی میں یہ عادت ایسی پختہ ہو جانی چاہئے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضہ میں کرلیں، تعلیم، امتحان کی تیاری ہی ورزش، سفر اور تعلیم سے فراغت کے بعد جس شاہراہ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے خواہ وہ نوکری ہو تجارت ہو، صنعت ہو ہر ایک میں یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہو سکتا ہے، پچھلی دولتمندی کا خمار اب تک مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے، ہماری درسگاہوں کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علموں کے یہ ذہن نشین کردیں کہ اب تمھاری زندگی صرف تمھاری محنت، جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے، یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے نکل کر ساحل تک بہ سلامتی پہنچنا صرف تمھارے ہی ہاتھ پاؤں چلانے پر موقوف ہے،

کون نہیں جانتا کہ اس عرصۂ کائنات میں زندگیوں کا ایک معرکہ برپا ہے اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں، افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں، وہی زندہ اور جیتا رہے گا، جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے اور نرم بستر کا جویا ہوا، دنیا اس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشے میں ڈال دے گی، اور افراد اور قومیں اس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی، زندگی کا فلسفہ صرف جہد و جہاد محنت اور سخت کوشی ہے، بھوک کی برداشت، شکم سیری کا سامان ہے، اور موت کی تلاش زندگی

کا سرچشمہ ہے، انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا ثم اقتل ثم احیا الخ

جو کچھ کہا گیا شاعری نہیں، روزمرہ کی حقیقت ہے، طالب علموں کو اپنے روزانہ کے ورزشی کھیلوں میں کیا یہ راز ہر شام کو علانیہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہی لڑکا جیتتا اور وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو جس قدر اس دن زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش تھا، یہ پوری دنیا ایک بڑے ورزشی کھیل سے بڑھ کر نہیں، اس میدان میں بھی اسی کی جیت ہے جو زیادہ جفاکش ہے، کامیابی کی راحت ان ہی کے لئے ہے جو اپنے کاروبار میں محنت اور جد وجہد کی تکلیف اٹھاتے ہیں،

تمام قوموں میں سب سے زیادہ کامیاب، سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ قابل رشک وہ قوم سمجھی جاتی ہے جس کے ہاتھوں میں دوسری قوموں کی سلطنت کی باگ ہو لیکن کیا تاریخ کے اوراق نے اس حقیقت کو آپ پر منکشف نہیں کیا کہ یہ کامیابی، یہ خوش قسمتی اور یہ قابل رشک ہونے کی صلاحیت اس کو کتنی محنت کتنی جفاکشی اور کتنی پے در پے جسمانی تکلیفوں اور اذیتوں کی برداشت کے بعد حاصل ہوئی ہے، محمود نے سترہ حملوں میں پنجاب پر قبضہ پایا، شہاب الدین غوری نے ایک شکست کے بعد پورے سال بھر اپنے شکست کے وقت کے پہنے ہوے کپڑوں کو تبدیل نہیں کیا، بابر نے کامل پندرہ برس پہاڑوں سے سر ٹکرایا، میں نے ان فقروں کو ہمیشہ کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ بدر وحنین کی سختیوں کو جھیلے بغیر قیصر وکسریٰ کے تخت سلطنت کی خواہش حماقت ہے، جس کو لال قلعے میں شاہجہاں کے تخت طاؤس پر جلوس کی ہوس ہو اس کو پہلے بابر کی طرح خشک پہاڑیوں میں سر مارنا چاہئے، کوہ کنی کے بغیر جوے شیر کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے،

آج یورپ کی قومیں دنیا کے طول وعرض میں سلطنت کا تخت بچھانے کو س لمن الملک بجا رہی ہیں، لیکن اپنے سپاہیوں کے کتنے خون، اپنی دولت کے کتنے صرف اور اپنی محنت و جانفشانی کے کتنے مظاہرے کے بعد یہ سعادت ان کو نصیب ہوئی ہے، آج تجارتوں، صنعتوں اور کاریگروں

کی زندگی ہے، یہ زندگی کتنی زندگیوں کی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے، کروڑوں مزدور کان کنی میں لگے ہیں، لاکھوں آلات کے بنانے اور چلانے میں مصروف ہیں، لاکھوں دن رات دوڑ دھوپ اور محنت اور تگ و دو میں منہمک ہیں، تب جا کر ان کی قوم کے سر پر سلطنت کا تاج ہے اور ان کے خزانوں میں معدنیات تجارت اور صنعت و حرفت کی دولت ہے،

بابر سے لے کر عالمگیر اول تک اور بہادر شاہ اول سے لے کر بہادر شاہ ثانی آخری مغل بادشاہ دہلی تک کی زندگیوں پر غور و فکر کی نظر ڈالئے، کیا تین سو برسوں کی یہ تاریخ یہ حقیقت نہیں بتاتی کہ جنھوں نے تکلیف کی زحمت اٹھائی انھوں نے تخت سلطنت پر آرام کیا، اور جنھوں نے آرام کی خواہش کی انھوں نے عمر بھر زحمتوں اور تکلیفوں میں بسر کی،

الغرض مسلمان طالب علموں کو یہ نکتہ اب کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محنت اور جفاکشی ہی کی عادت وہ چیز ہے جو ان کی تعلیمی اور عملی دونوں زندگیوں میں ان کو کامیاب بنا سکتی ہے جہاں قومی سلطنتیں اور قومی تعلیمگاہیں ہیں وہاں کے نظامِ تعلیم پر ذرا غور کرنے سے یہ نکتہ حل ہو سکتا ہے کہ ان کے نصابِ تعلیم میں جو اہمیت کتابوں کو حاصل ہے اس سے کم اہمیت ان کے جسمانی کھیلوں اور مختلف ورزشوں کو حاصل نہیں ہے، میدانی کھیلوں کے علاوہ پہاڑوں پر چڑھنا، دریاؤں میں کشتی چلانا، دھوپ میں دوڑنا، ہواؤں میں اڑنا وہ کونسی جانفشانی ہے جس کی مشق یہ قومیں اپنے حکمراں بننے والے افراد کو نہیں کراتیں، انگلستان کی بہترین درسگاہوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور یہ نظر آیا ہے کہ ان ورزشی کھیلوں کی اہمیت وہاں تعلیم کے برابر ہی برابر ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہاں کی عام تعلیم گاہیں بھی تقریباً نیم فوجی ہیں، اسی سے ہندوستان کی تعلیم کا یہ نقص کہ وہ تمام تر نظری رہتی ہے، عملی نہیں، وہاں دور ہو جاتا ہے، مسلمانوں کو اگر آیندہ ہندوستان کی سلطنت میں حصہ لینا ہے تو ان کو یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آیندہ ان کو صرف نظری نہیں بلکہ عملی قوم بننا چاہیے

اور یہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں،

۳۔ خود اعتمادی

مسلمانوں کی اخلاقی تعمیر کا نہایت اہم عنصر اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرنا ہے جس کے بغیر نہ کوئی فرد کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم، خود اعتمادی سے مقصود اپنے اندر فیصلے کی قوت سے مستحکم عزم پیدا کرنا اور پھر اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دینا اور اس کو کامیابی تک پہنچانا ہے، قرآن پاک نے اس نکتے کو صرف دو لفظوں میں ادا کیا ہے" اِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ" (جب عزم کرے تو پھر خدا پر بھروسہ کر) اس سے پہلے مشورے کا حکم ہے، مشورے کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اس پر مستحکم عزم کی تاکید ہے، پھر اس عزم کے مطابق اس کو کر گذرنا اور اس کی کامیابی کے لئے خدا کی توفیق اور نصرت پر بھروسہ رکھنا،

مسلمانوں کا یہی جوہر تھا جس سے متصف ہو کر ایک غریب مسافر ہمت کی کمر باندھ کر تنہا کھڑا ہوتا تھا اور بحر و بر، دشت و جبل کو طے کر کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو چلا جاتا تھا، ایک یتیم طالب العلم گھر سے یکہ و تنہا نکلتا تھا اور سالہا سال تک ملک ملک کی خاک چھان کر ایک ایک شہر میں علم و فن کے ماہرین وقت کی صحبتوں اور درسگاہوں سے فیض پا کر اپنے وطن کو لوٹتا تھا، ذرہ ہو کر نمودار ہوتا اور پھر آفتاب بنکر چمکتا تھا، ایک باہمت سوداگر اکیلا اپنا سازوسامان لے کر کبھی سندباد بحری اور کبھی سندباد بری بنکر نکلتا تھا، دولت کے جہاز اور کارواں سے لدا پھندا عراق، شام، اسکندریہ اور اسپین کی بندرگاہوں میں اترتا، ایک معمولی سپاہی اپنی تلوار لے کر نکلتا اور روے زمین کی فضا کو چیر کر کہیں نہ کہیں اپنے لئے ایک حکومت و ریاست کھڑی کر لیتا،

مسلمانوں کا یہ جوہر اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں ان سے کھو گیا، یہ سنکر حیرت ہو گی کہ وہ بابر جس نے پندرہ برس کے سن میں تخت پر بیٹھ کر اور پھر بارہ ہزار فوج سے ہندوستان

کو فتح کر ڈالا، اس کی اولاد جب لال قلعہ سے بھیڑ کی طرح نکلی ہے تو اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کا سامان کیا جا سکتا ہے،

والدین اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بہترین محبت یہ سمجھتے ہیں کہ انکو تنہا کوئی کام کرنے نہ دیں تنہا راستے میں نہ چلیں، راتوں کو اکیلے گھر سے باہر نہ نکلیں، کمروں میں رات کو تنہا سونے نہ پائیں ایک بڑے عالم باپ کو میں نے دیکھا کہ اپنے جوان بیٹے کو کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ اس لئے نہیں جانے دیتے تھے کہ یہ کالج میں پڑھنے جانے والا بچہ کہیں آتے جاتے راستے میں موٹروں سے کچل نہ جائے امیر مسلمانوں کے گھروں میں یہ بات دولتمندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے کہ انائیں اور کھلائیاں جوان جوان لڑکوں سے بھی علحدہ نہ ہونے پائیں، اٹھارہ انیس سال کے ایسے نواب زادوں کے واقعے سنے ہیں جن کو اس وقت نیند نہیں آتی تھی جب تک ان کی انا بی بی ان کو پلنگ پر سلاتی نہ ہوں، آپ نے ایسے نواب زادوں اور امیرزادوں کو دیکھا ہوگا جو کسی درسگاہ کے دارالاقامے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کو ناگہانی اتفاقات سے بچانے کے لئے اسٹاف کا اسٹاف ہوتا ہے،

غریب مسلمانوں تک میں یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو خود تنہا اپنے کام کی ذمہ داری اٹھانے کی زحمت دینے پر بہت کم رضامند ہوتے ہیں یہی سبب ہے کہ ہمارے بچے عزم و ارادے کے کچے، ہمت کے بودے اور استقلال کے کمزور ہوتے ہیں، اور اس لئے تعلیم کے زمانے کے اندر اندر بھی وہ اتالیق اور ٹیوٹر کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے، اور تعلیم کے بعد بھی اپنے بل بوتے پر کھڑے نہیں ہو سکتے، الغرض وہ بچپن میں انا اور کھلائی کے، تعلیم میں اتالیق اور ٹیوٹر کے اور ملازمت میں سعی و سفارش کے محتاج ہوتے ہیں، زندگی کے ہر ہر مرحلے میں ہر قدم پر ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلیں،

ایسی قوم کے افراد کیا حکومت کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ ہمارے سامنے نہیں، ان کی ترقی کا جب عہد تھا بادشاہ کے زیر سایہ امرا کھڑے ہو کر ملک کا انتظام کرتے تھے اور ان کے تنزل کا زمانہ جب آیا تو یہ شہزادے اپنے اپنے امیروں کے سہارے کھڑے ہو کر تخت پر بیٹھنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان امیروں نے ان کو اٹھا کر تخت سے دور پھینک دیا اور بالآخر تخت اور تخت نشین دونوں کا خاتمہ ہو گیا،

یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے افراد میں آج یہ جوہر ان کی ان ہی درسگاہوں میں پیدا ہوتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس پرزے کو جہاں لگا دیجئے وہیں وہ کام دینے لگتا ہے، ایک فرنچ مصنف نے اینگلوسیکسن قوم کی ترقی کے راز پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی میں "سر تقدم الانکلیز السکسونین" کے نام سے ہوا ہے، اس میں زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہے کہ انگریز قوم کی ترقی کا بڑا راز یہی خود اعتمادی کا جوہر ہے، ایک اور فرنچ نے "بیسویں صدی کا امیل" کے نام سے خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی بڑی خوبی سے یہ دکھایا گیا ہے کہ ماں کے گود سے لے کر کالج کی اعلیٰ تعلیم تک لڑکوں میں جس وصف کے پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے وہ خود اعتمادی ہے، ایک انگریز سپہ سالار کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "ہم نے انگلستان کے فٹ بال کے میدانوں میں خود اعتمادی اور ثبات و استقلال کا جو جوہر اپنے اندر پیدا کیا تھا وہی نپولین کے مقابلے میں ہمارے کام آیا"۔

مسلمان ہندوستان میں جس تعدادی اقلیت میں ہیں اس کی تلافی صرف ان کی اخلاقی قوت اور علمی طاقت سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہماری درسگاہوں کو اس ملک کے مسلمانوں کو آیندہ زندگی بخشنے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنے طالب علموں میں یہ قوت اور یہ طاقت پیدا کریں، تاکہ وہ اپنے استحقاق سے اس ملک میں زندہ رہ سکیں اور اس مملکت کے نظام

حکومت کے قیام اور استواری میں کسی طرح ان سے حکومتِ وقت کو بے نیازی نہ ہو سکے،

اساتذہ | ہماری درسگاہوں میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ کیجاتی ہے وہ استادوں کے انتخاب کا مسئلہ ہے، قومی درسگاہوں میں اس انتخاب کا معیار یہ ہے کہ جو کم تنخواہ لے، اور سرکاری درسگاہوں میں یہ کہ جو سب سے اونچی کاغذی سند رکھے اور "یورپین کوالیفکیشن" تو وہ منتر ہے جس سے ہر تعلیمی بھوت بآسانی بھاگ جاتا ہے، ہندوستان کا کیسا ہی تجربہ کار سے تجربہ کار، ماہر سے ماہر اور محقق سے محقق ہو لیکن اگر اس کے پاس یورپ کی کسی درسگاہ کے دو لفظ نہ ہوں تو اس کے مقابلے میں بیرونی تعلیم کا ہر ناتجربہ کار اور نو آموز ترجیح پائے گا، ہماری بڑی سے بڑی یونیورسٹی آج انگریز، فرنچ اور جرمن استادوں کے ناموں کے جادو میں گرفتار ہے اور اس کی منہ مانگی تنخواہ دینے میں حاتمانہ فیاضی کے لئے تیار ہے،

اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی تعلیم کا کوئی نصب العین مقرر نہیں کیا ہے، بلکہ خود قوم نے بھی اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار نہیں دیا ہے، اس لئے استادوں کے انتخاب کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے کہ اعلیٰ سند کا کاغذ اور سات سمندر پار کے حکمراں اقوام کی گوری شخصیت، انتہا یہ ہے کہ عربی فارسی اور تصوف کے پڑھانے کے لئے بھی ہم اپنی قوم کے کسی فرد پر اعتبار کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں جب تک پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر آرنلڈ اور ڈاکٹر راس کے دستخطوں کا کاغذ اس کے پاس نہیں،

ہم نے اس سے پہلے مسلمانوں کے تعلیمی مقاصد کا جو خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اگر وہ ذہن نشین ہے تو آپ اس کا فیصلہ کرنے میں ایک ذرہ بھی تامل نہ فرمائیں گے کہ استادوں کے انتخاب کا معیار کاغذی سند سے بڑھ کر ان کی شخصیت میں ان مقاصد کا وجود ہے، جن پر اس تعلیم گاہ کی بنیاد قائم ہے، اگر آپ کسی ایسی دو درسگاہوں کا باہم موازنہ کریں جنمیں سے ایک ایسے استادوں کا اشتاف رکھتی ہے جو اعلیٰ کاغذی سندوں کے تو مالک ہیں مگر ان مقاصد سے سرتاسر خالی ہیں، اور دوسری

گو اُن کا غذی سندوں کے لحاظ سے کم درجہ ہے، مگر اس کے استاد اپنے اندر وہ جوہر رکھتے ہیں جو اسکے تعلیمی مقاصد کا حقیقی عنصر ہیں تو یقیناً عملی حیثیت سے دوسری پہلی سے کہیں زیادہ مفید ہوگی، کیا ہماری نئی اسلامی درسگاہیں استادوں کے انتخاب کے وقت یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ مسلمان، کون زیادہ راستباز، کون زیادہ مخلص، کون زیادہ محنتی، کون زیادہ جفاکش اور کون حقیقت میں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کے پورا مطابق ہے؟ کیا کسی غیر قوم کے استاد سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے حقیقی تعلیمی نصب العین کے مطابق اپنے کو بنائیگا اور خود اس کا نمونہ بن کر طلبہ کے سامنے آئے گا؟ ایسے استادوں کے زیرِ تعلیم و تربیت جن میں سے ہر ایک کا قبلہ مقصود صرف دوسری قوم کی ظاہری نقالی ہو، اور جن کا حوصلہ صرف سوٹ، کوٹھی، فرنیچر اور موٹر تک محدود ہو، ایسے لڑکوں کے پیدا ہونے کا خواب دیکھنا جو مسلمان ہوں، قوم پرور ہوں، سادہ ہوں، جفاکش ہوں، اور اقوام کی دوڑ میں اپنی برتری دکھاسکیں، کہاں تک حق بجانب ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق کاشتکار اپنے کھیتوں میں جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید رکھے، اور اس سے بے خبر ہو کر کہ ع

گندم از گندم بروید جو ز جو

اسلامی اور وطنی نصب العین کا جو خاکہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے، اور جس کو مسلمان اپنا قومی مقصد اور زندگی کا مطلوب بنالیں وہی درحقیقت استادوں کے انتخاب کا معیار ہے،

بوریا باف گرچہ بافندہ است ۔۔۔ نہ برندش بہ کارگاہِ حریر

ہماری پچاس برس کی تعلیمی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تو اپنا کوئی تعلیمی مقصد متعین نہیں کیا اور نہ اس مقصد کے مطابق اپنے استادوں کا انتخاب کیا، مثال دیتا ہوں، ہم نے عربی پڑھانے کے لئے یورپ کے ایک بہترین مستشرق کو بلوایا، وہ عربی فیلالوجی اور یورپین

عربی مطبوعات و مخطوطات کی پوری فہرست ہمارے بچوں کو رٹا سکتا ہے، مگر قرآن پاک کا وہ شغف اور تاریخ اسلام کا وہ ذوقِ قومی ہم کو کیوں کر عطا کر سکتا ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کو نصیب نہیں بلکہ وہ اس سے منحرف ہے،

ہماری اکثر درسگاہوں کے استاد صرف پیشہ ور معلم ہیں، جنھوں نے اس پیشے کو صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بھی معیشت کا ایک ذریعہ ہے، ورنہ درحقیقت وہ ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے سراسر محروم ہیں، اور پھر ان سے ہم یہ احمقانہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آیندہ ہمارے بچوں کو ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے بہرہ ور کر دیں گے،

جامعہ ملیہ کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنے استادوں کے انتخاب میں اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے، اس نے انتخاب کا معیار اعلیٰ کاغذی سند کو نہیں بلکہ اپنے تعلیمی مقاصد کو قرار دیا ہے، فرض کیجئے کہ اگر اس درسگاہ میں ایک نہایت اعلیٰ قسم کے ایسے استاد کو لاکر رکھ دیا جائے جو گو یورپین اسناد کی بڑی پوٹ اپنے قبضے میں رکھتا ہو، مگر اس کے تمام تر حالات و خیالات اور نشر و تعلیم ان مقاصد کے خلاف ہوں جن پر اس درسگاہ کی بنیاد ہے، تو کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب اس کو "جامعہ بدر" کرنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے فضل و کمال کے ان کاغذی دستاویزات کا پاس کریں گے؟ پھر کیا ہے کہ ہماری درسگاہوں کے معلم اپنے وجود، اپنی تعلیم اور اپنے فیض صحبت سے علانیہ ہمارے قومی مقاصد کی تضحیک، ہمارے مذہبی خیالات کی توہین اور ہمارے وطنی اغراض کی تلبیس کرتے ہیں، اور یہ صرف اس لئے گوارا کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس کاغذی دستاویزات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے؛

چو ہست طینتِ آدم زخمیرِ دگر است　　　تو توقع زگلِ کوزہ گراں می داری

ارکانِ جامعہ سے بھی ایک بات کا برملا اظہار کر دینا ہے، ہم نے اب تک جامعہ ملیہ کو اسلامیت و وطنیت اور جدید و قدیم دونوں کی معتدل اور لطیف آمیزش کا نتیجہ سمجھا ہے، اس لئے

اساتذہ کے انتخاب میں صرف "اخلاص و ایثار" کی سند اتنی زبردست نہیں کہ اس کے لئے اسلامیت کی نفی کردیں، یا وطنیت سے انحراف پسند کریں، اگر وطنی اغراض کے مخالف کو اس جامعہ میں معلم نہیں باقی رہنا چاہئے، تو اسلامی اغراض کے مخالف کے لئے رواداری کیوں برتی جائے، اگر کوئی درسگاہ اس قسم کی رواداری برتتی ہے تو درحقیقت وہ اپنے مقاصد کی جڑ پر آپ کلہاڑی مارتی ہے، بہرحال اس بات کے اظہار میں ہم کو کوئی پس و پیش نہیں کہ ہماری یہ نوعمر درسگاہ اس اصول کو بہت کچھ اپنے سامنے رکھتی ہے، اور دعا ہے کہ اس کے کارکنوں کو اپنے معیار کی سختی پر مزید استقامت نصیب ہو،

علوم | ہم کو اپنی درسگاہوں میں کن علوں کو پڑھنا اور پڑھانا چاہئے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر اب تک مسلمانوں نے کیا بلکہ ہندوستانیوں نے بھی غور نہیں کیا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم ڈیڑھ سو برس سے جس تعلیمی شکنجے میں گرفتار ہیں، اس سے مجبور رہ کر ہم اس پر غور کر بھی نہیں سکتے، ہندوستان میں نئی تعلیم جن اسباب سے پھیلائی گئی ہے ان کو بیان کرنے میں برطانی مدبرین نے کبھی پس و پیش نہیں کیا ہے،

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں سے اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کی عصبیت مٹ جائے، اس کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ نصاب تعلیم کو ہر مذہبی اسپرٹ سے خالی رکھا جائے یہانتک کہ اس میں خدا کا نام بھی نہ آنے پائے،

(۲) بنگال کی ابتدائی مثالوں سے انگریزوں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ تعلیم عیسائیت کی اشاعت میں معین ہوگی، اسی لئے گورنمنٹ کی طرف سے مشنری اسکولوں کی پوری حوصلہ افزائی ہوئی اور ان میں انجیل کی تعلیم داخل کی گئی،

(۳) انگریزوں کو اپنی حکومت کی تنظیم میں ایسے ماتحتوں کی ضرورت تھی جو ان کے دفتروں کے لئے کچے مواد اور مسالوں کو ان کے مطالعہ تجویز اور فیصلے کے لئے مرتب کرسکیں اور ان کو ان کی زبان میں معاملے کی صورت حال کو سمجھا سکیں،

ان وجوہ سے جدید درسگاہوں کو پہلے تو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے یکسر خالی رکھا گیا، پھر ان میں صرف ان ہی علوم کو داخل کیا گیا جو اس قسم کے ادنیٰ تعلیم یافتوں کو ان کے لئے مہیا کر سکے، ایسے محرروں، کلرکوں اور ماتحت افسروں کو سب سے پہلے تو انگریزی جاننا چاہئے تاکہ وہ ان کی زبان میں سلطنت کے معاملات اور کاغذات کو پیش کر سکیں، پھر ان کو حساب جاننا چاہئے جو ان کے دفاتر کے حساب وکتاب کو درست رکھ سکیں، چنانچہ جو نئی تعلیم ہندوستان میں جاری کی گئی، اس کی اصلی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں، انگریزی اور حساب، اس کے ساتھ تیسری چیز جغرافیہ ہے، جس سے مقصود صرف اس قطعۂ ارض کا علم ہے جہاں سے آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا، اور اس سے اس سلطنت کی وسعت اور عظمت کے ساتھ اس کے مختلف ٹکڑوں کا جوڑ بھی معلوم ہو، چوتھی چیز تاریخ ہے جس کا مقصد اس ملک کی قوموں کے باہمی دشمنانہ تعلقات کی یاد کو ان کے دلوں میں تازہ رکھنا، اور انگریزوں نے جیسا کہ وہ کہتے ہیں اس ملک میں ایک نظم عادل اور متمدن حکومت قائم کر کے اہلِ ملک پر جو احسان کیا ہے اس کو بار بار دھراتے رہنا ہے، چنانچہ حکومتِ وقت اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی اور اس نے ہندو مسلمانوں کے درمیان بغض و عداوت کی وہ آگ بھڑکا دی جو ہماری بہترین کوششوں کے باوجود اب تک نہ بجھ سکی،

اعلیٰ تعلیم کے دو حصے ہیں، فنون یعنی آرٹس اور علوم یعنی سائنس، یہ دونوں حصے صد درجہ ناقص ہیں، آرٹس میں جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے لئے ماتحت افسر حاصل ہوں، ابھی حال میں پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کورٹنی ٹیرل نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا اس میں انھوں نے یہ بالکل بجا کہا ہے:

"بی اے یعنی بیچلر آف آرٹس کس قدر مغالطہ آمیز فقرہ ہے، وہ کونسا آرٹ ہے جس میں ایک بی اے مہارت حاصل کرتا ہے"

لے دیکر ایک تاریخ، دوسری انگریزی اور تیسری پولٹیکل اکانمی جس کی مناسبت قانون خوانی اور وکالت کے خیال سے ہے اور پھر نظری فلسفہ علوم میں ایک عجیب ندرت یہ رکھی گئی ہے، کہ "نظریات" کو اہمیت دیجائے اور "عملیات" سے پہلو تہی کیجائے، ہماری ایک بڑی درسگاہ میں سائنس کالج کی سب سے بڑی اہمیت علم حیوانات کی تعلیم ہے، حالانکہ ہم ابھی علم انسان سے بھی آشنا نہیں، حیوانات کے خصائص اور زوجی فرائض کے علم سے بہتر ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ان میں سے کسی کا چمڑا ہم کس طرح کام میں لا سکتے ہیں،

غرض ان بے عمل اور نظری علوم کی تعلیم سے ممکن ہے کہ موجودہ حکام تعلیم کا یہ مقصد ہو کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنی زندگی گذارنے کے لئے حکومت وقت کے دست نگر رہیں تاہم یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے یہ تعلیم بڑھتی جاتی ہے لکھے پڑھے اپاہجوں کی تعداد بھی روز افزوں ہے اور چونکہ ہندوستان میں بے کاروں کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فرض نہیں اس لئے اس کو اپنے طریق تعلیم میں تغیر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی،

حکومت کی ابتدائی تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت صرف نوکری کے حصول کے لئے ہے اور اب انقلابات نے ہماری آنکھوں سے یہ پردہ اٹھا دیا ہے، کہ یونیورسٹیوں کی یہ تعلیم نوکریوں کے حصول میں بھی اب کارآمد نہیں رہی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ آخر پھر اسی تعلیم کے پیچھے اب تک دوڑے چلے جانا کہاں تک صحیح ہے اگر اس تعلیم سے سرکاری نوکریوں کا سہارا بھی ہو تو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ سرکاری نوکریاں قومی افلاس کے دور کرنے کا علاج نہیں ہیں، وہ علوم و فنون جو حصول دولت کے اصلی ذرائع ہیں ان کی تعلیم ہمارے نظام تعلیمات سے قطعاً خارج ہے، عملی کیمسٹری، آلات سازی اور صنائع و حرفت کی تعلیم جن پر قومی روزی کا دار و مدار ہے، ہمارے تعلیمی دائرے سے تمامتر باہر ہے، کہ اگر ان کی

تعلیم یہاں ہو تو پھر ہندوستان انگلستان کی مصنوعات کا بازار باقی نہ رہے، ڈاکٹری ہم کو یہاں سکھائی جاتی ہے مگر دواسازی نہیں کہ اگر ایسا ہو تو پھر دواؤں کی قیمت میں ہندوستان اپنا سر انگلستان کو دینے پر کیوں مجبور ہو،

اسکول کی پوری تعلیم میں سائنس کی تعلیم برائے نام ہی چھوئی جاتی ہے، جغرافیہ طبیعی حفظان صحت اور طبیعیات کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے سوا ان کو اور کچھ بتایا نہیں جاتا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنے اور بولنے اور حساب جوڑنے کے سوا کچھ اور ان کو نہیں آتا، کالجوں کی اعلیٰ تعلیم میں انہی خاکون کو اور زیادہ ابھار دیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ ان مسائل پر پوری طاقت سے گفتگو کرنے کے لئے میں اپنے میں اہلیت نہیں پاتا، اس لئے تفصیلات کو اپنے سے زیادہ لائق اشخاص کے سپرد کرکے صرف چند سرسری اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں،

(۱) سب سے پہلے یہ کہ کیا یہ غیر مذہبی اور غیر قومی تعلیم آیندہ جاری رہنا چاہئے؟ کیا ایسا نصاب تعلیم کے لئے زہر نہیں جو مذہب و اخلاق اور قومی تخیل کی روح سے یکسر خالی ہو؟

(۲) کیا نفس انگریزی زبان کا یہ معیارِ تعلیم کہ ہر ہندوستانی خالص انگریزون کی طرح اس زبان میں لکھ پڑھ سکے اب بھی باقی رہنا چاہئے؟ یا اس قدر جاننا کافی ہے جس سے اس کے ذریعہ گفتگو کاروبار اور حصولِ علم ممکن ہو،

(۳) علوم میں ان سائنسوں کو جگہ دی جائے جن سے ہم کو عملی فائدہ پہنچے اور وہ ہمارے علم کے ساتھ ہماری دولت کو بھی بڑھا سکیں،

ہمارے بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ گھڑی سے وقت کیونکر پہچانیں ٹکٹ لے کر ریل پر کیونکر بیٹھیں اور ایک موٹر کا عام استعمال کیونکر کریں تار لکھ کر بابو کے ذریعہ تار کیونکر بھیجیں، لیکن یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ہم گھڑی کیونکر بنائیں، لوہے کو مٹی سے کیسے نکالیں،

پھر لوہے کو کیسے صاف کریں، پھر کیوں کر ریل کی پٹریاں اور گاڑیاں اور پہیے اور انجن بنائیں، موٹر کے ٹکڑوں اور ان ٹکڑوں کو کیسے بنا کر جوڑیں، اسی مثال پر دوسری باتوں کو قیاس کیجئے،

ہم اب تک پوری تیزی کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کی طرف دوڑتے چلے گئے ہیں، اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ بس اس کے بعد ہم کامیابی کی منزل کو پہنچ گئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی گراں قیمت تعلیم میں ہم اپنے بچوں پر جس قدر صرف کرتے ہیں اکثر ایسا ہو رہا ہے کہ ان لڑکوں کو اس تعلیم کے بعد اتنی رقم بھی ماہوار ملنی مشکل ہے، ہمارے لڑکے بی اے تک ایک بنی ہوئی شاہراہ پر پوری امنگ اور ولولوں کے ساتھ دوڑتے چلے جاتے ہیں اور ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے خاتمہ پر ان کو اپنی منزل کا پتہ مل جائے گا، مگر وہ جب وہاں پہنچتے ہیں تو دفعۃً منزلِ مقصود کی رفیع عمارت کے بجائے ایک عمیق غار ان کو نظر آتا ہے اور وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اب سوچتے ہیں،

گذری جو گذرنی تھی اب چاہئے کیا کرنا

غور کرتے ہیں تو سوا نوکری کے سوا اپنے اندر اور کسی کام کی صلاحیت نہیں پاتے اس سے مایوس ہو کر بعض لوگ تو ذرا کترا کر پھر آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں، یعنی ایم اے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں، اور بعض قانون یاد کرتے ہیں یا ٹریننگ کی فکر کرتے ہیں، لیکن اب ٹریننگ کا دروازہ بھی بند ہو رہا ہے، اور قانون کے میدان میں جو بھیڑ بھاڑ ہے اس سے کون بے خبر ہے،

ان واقعات نے یہ غور کرنے کا موقع دیا ہے کہ جن کو علم علم کے لئے حاصل کرنا ہے، آیا ان کیلئے اس طریقۂ تعلیم میں علوم کی تحصیل کا سامان ہے اور جن کو علم کمائی کے لئے حاصل کرنا ہے، کیا انھوں نے اس موجودہ طریقۂ تعلیم میں اپنی شکم سیری کا بھی کوئی فن سیکھا ہے؟

اب اس مسئلے میں ذرا بھی شک کی گنجایش نہیں کہ ان چند لوگوں کے سوا جو علم کی واقعی تحصیل چاہتے ہیں، یا علمی اور تعلیمی پیشے میں زندگی گذارنا چاہتے ہیں، بقیہ افراد کو صرف اسکول کی تعلیم پر قناعت کرنا چاہئے اور اعلیٰ تعلیم کا فریب نہ کھانا چاہئے، اس تعلیم کے بعد ان کو کسی صنعت، حرفت، تجارت یا دوسرے ذرائعِ معاش کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اعلیٰ تعلیم میں صرف ان ہی کو جانا چاہئے جو واقعی علم کے شیدا ہوں اور تحقیق و تکمیل کے طالب ہوں، اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکومت نے اس اعلیٰ تعلیم کو اپنے چند بلند عہدوں کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کرلیا ہے اور ان ہی کا لالچ قوم کی قوم کو اس کی طرف کھینچ رہا ہے، مگر غور کے قابل بات یہ ہے کہ یہ چند عہدے جو ہر صوبے میں دس بیس سے زیادہ نہیں، وہ ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو نہیں مل سکتے، جب چند سال کی دفتر گردی کے بعد بالآخر وہیں لوٹ کر آنا ہے تو پہلے ہی سے وہیں جانے کی تیاری کیوں نہ کیجائے؟

ہمارے ہاں تعلیم کی ایسی بندھی ہوئی اور محدود صورت اب تک ہے کہ خواہ لڑکے میں مناسبت ہو یا نہ ہو اور ان علوم سے ان کو وابستگی ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ ان کو پڑھتا ہے اور ان میں ان کو کامیاب ہونا ہے، ورنہ آیندہ وہ کسی لائن میں بھی گھس نہیں سکتے، اس مجبورانہ طریق تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہانتوں کا اور والدین کے سرمایہ کا بے دریغ خون کیا ہے، آخر قوم کی یہ ذہنی خودکشی اور مالی فضول خرچی کب تک جاری رہے گی اور کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس موجودہ تعلیمی نظام کے خلاف ہم اپنے لئے آپ ایک منظم تعلیم کی بنیاد ڈال کر عملاً بغاوت کا اظہار کریں، اور ان علوم کو چھوڑ دیں جن کا انتہائی مقصد عمدہ انگریزی سیکھنا ہو، اور ان علوم کو اختیار کریں جن سے قومی تربیت کے بعد حصول زر کا طریقہ سیکھا جائے،

ہم نے اس تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے جس کا مقصد علم کا حصول ہے کہ اس کے لئے سب سے پہلی شرط پیٹ کے سوال سے آزادی ہے، ہم نے اب تک یہ چاہا ہے کہ علم اور پیٹ دونوں مقصد

کو ایک تعلیم کے اندر جمع کر دیں اور یہ ناممکن ہے پیٹ کی تعلیم سے علم کی آسودگی حاصل نہیں ہو سکتی، یہی سبب ہے کہ ہم نے مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کے ذریعہ سے کوئی بڑا مصنف، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا فلاسفر، کوئی بڑا موّرخ، کوئی بڑا سائنٹسٹ کوئی بڑا موجد، کوئی بڑا کیمسٹ، کوئی بڑا اسٹرانوم، کوئی بڑا میتھمیٹیشین پیدا نہیں کیا، اور اگر اتفاقاً پیدا ہو بھی گیا تو اس نے علمی زندگی نہیں پائی، کیونکہ علم کی صبر آزما اور سنگلاخ راہ سے کمال کی منزل تک پہنچنے کے بجائے چھوٹی پالیٹکس اور سرکاری نوکری کے ذریعے فخر و شہرت اور نام و نمود پیدا کرنے کا راستہ ان کو زیادہ آسان نظر آتا ہے، اور علم کا تقاضا ہے کہ علم کے سوا اس کے طالب کا کوئی اور مقصود نہ ہو۔

تعلیم کی زبان سب سے آخری بات تعلیم کی زبان کا مسئلہ ہے، میں نے ابھی مسلم یونیورسٹی کے خطبے میں اس پر اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے ہیں جن کے دہرانے کی حاجت یہاں نہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس بدیسی زبان کی گرفت سے جو ۱۸۳۵ء میں ہم پر مسلط کی گئی، آزادی حاصل کریں، یہ نکتہ بھلایا نہ جائے کہ ہم نے بدیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی مخالفت کی ہے، نئے علوم اور کسی قوم کی علمی و ادبی زبان سیکھنے کی نہیں، علوم و فنون خواہ کتنے ہی نئے ہوں اور کسی قوم سے ان کو نسبت ہو، وہ کسی خاص زبان کے اندر محدود نہیں، مسلمانوں نے ہندوستان، ایران اور یونان کے سب علوم و فنون سیکھے مگر اس طرح نہیں کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی زبان ہندی یا ایرانی یا یونانی کر دی ہو، بلکہ یہ کیا کہ ان تمام زبانوں کے علوم و فنون کو خود اپنی زبان میں منتقل کیا یا دوسروں سے منتقل کرایا، اور اس اپنی زبان کے ذریعہ لوگوں کو ان علوم فنون کی تعلیم دی، آج اگر یورپ ہی کی تقلید کمال کی دلیل ہے تو کیا کسی پست سے پست یورپین قوم کی مثال دی جا سکتی ہے، جس نے اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری اعلیٰ قوموں کی زبانوں کو علوم و فنون کی عام تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہو، کل بیت الحکمۃ نے بغداد میں جو کچھ کیا وہ کیا ہے، جو دار الترجمہ عثمانیہ میں آج نہیں ہو سکتا، جاپان نے انگریزی اور فرنچ کے ذریعہ اپنے ہاں

تعلیم نہیں پھیلائی، اور نہ آج ترک تک باایں ہمہ جدت پسندی جرمن اور فرنچ کو تعلیم کا ذریعہ بنا رہے ہیں، کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہیں کہ زبان کو قومیت کی تخلیق میں کیا اہمیت حاصل ہے،

۱۹۲۰ء میں فرانس جب شام کو امیر فیصل سے چھین کر اس پر قبضہ کر رہا تھا تو اس وقت اتفاق سے میں فرانس کے شہر ویشی میں تھا، فرنچ اخبارات شام پر اپنے قبضے کے جو وجوہ بتا رہے تھے ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "یہ وہ ملک ہے جہاں فرنچ زبان کے تین سو اسکول ہیں" یہی وہ اسکول ہیں جہاں شامی بچوں کے دلوں میں فرانس کی محبت کا بیج بویا گیا، یہ بیج بڑھا اور آج ایک تناور فرنچ حکومت کے سایہ دار درخت کی صورت میں شام میں موجود ہے،

جامعہ کی چار دیواری میں اس اہمیت پر استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہیں جو قوموں کی تکوین و تخلیق میں زبانوں کو حاصل ہے، مذہب کے بعد وہ زبان ہی ہے جو پوری قوم کو ایک متحدہ قوم بناتی ہے، وہ زبان جو کسی قوم میں ذریعۂ تعلیم نہ ہو کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی، یہی سبب ہے کہ جہاں تک نئے تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے ہماری زبان کو بہت کم امداد ملی ہے، وہ تعلیمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کے خزانوں سے محروم ہے اور نئے علوم بدیسی زبان کے ایک ایسے پنجرے میں بند ہیں جہاں تک رسائی بے اس کے ممکن نہیں کہ پہلے ہم اس بدیسی زبان میں سالہا سال تک مہارت حاصل کر لیں پھر بھی ہمارے بچے ان علوم کی تہ تک بآسانی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان علوم کے سمجھنے سے پہلے وہ اس زبان کی مشکل کو حل نہ کر لیں، مثال یہ ہے کہ آپ ان کو الجبرا یا حساب کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو انگریزی زبان میں سوال دیتے ہیں، بچے کو پہلی مشکل یہ ہے کہ وہ اس سوال کی زبان کو سمجھے، پھر علم کی مشکل کو حل کرے، پھر بھی وہ اس کو اس آسانی سے نہیں سمجھ سکتا جس آسانی سے وہ اپنی مادری زبان میں سمجھ سکتا ہے اور سمجھ لینے کے بعد بھی اس کو مادری زبان میں دہرانے پر تو یقیناً قدرت نہیں رکھتا کہ اس کے لئے اس کو پہلے مناسب الفاظ اور مصطلحات کے پیدا کرنے کی مشکل درپیش رہتی ہے

ہندوستان میں مسلمان نہ صرف یہ کہ مادری زبان میں علم کی تحصیل سے معذور ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ سرے سے مادری زبان سے محروم ہیں، ہندوستان زبانوں کا دنگل ہے، صوبہ وار زبانوں کو چھوڑ کر اردو ہندی کا ایک مستقل دنگل اس ملک میں قائم ہے، ہمارے وطنی بھائیوں نے اس اہمیت کو پوری طرح محسوس کرکے جو زبان کو قوم کے وجود میں حاصل ہے، یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ہندی کو اپنی، مادری نہ سہی تو علمی وادبی زبان تو ضرور ہی بنالیں گے، لیکن مسلمان ابتک اس عزم اور فیصلے سے غافل ہیں اور ابھی تک انگریزی ہی بولنے لکھنے اور پڑھنے کو کمال کا معیار جان رہے ہیں، اور دوسری قوم... مانگی ہوئی دولت پر فخر کرنا حماقت نہیں سمجھ رہے ہیں، اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے تو یہاں کی زبان کو بھی ایک ہندوستانی زبان بننا ہے اور یہ وہی زبان ہو گی جس کو ہندو مسلمانوں کی ملی جلی طاقت نے ایک ہزار برس کے میل جول سے اس ملک میں پیدا کیا ہے،

اب تک ہم اس ساحرانہ فریبِ نظر میں پھنسے تھے کہ ان نئے علوم کی تعلیم بدیسی زبان کے سوا ہندوستان کی مادری زبان میں ہو ہی نہیں سکتی، مگر یہ جادو اب ٹوٹ رہا ہے اور سرکار نظام کی بہادرانہ پیش قدمی نے اس جال کے ایک ایک تار و پود کو الگ الگ کر دیا ہے، اور ثابت کر دیا ہے کہ یہ علوم کسی خاص زبان کے پابند نہیں، شراب کو جس پیالے میں بھی پیو وہ شراب ہی اور تلوار کو جس غلاف میں بھی رکھو وہ تلوار ہے، سوال ظرف کا نہیں مظروف کا ہے،

مسلمانو! اٹھو اور ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھو، دنیا کا انتظار نہ کرو، وقت ہے کہ تم آگے بڑھو، دنیا خود تمھارے پیچھے آئے گی،

سید سلیمان ندوی،

۱۱/ اپریل ۱۹۳۳ء

آخری شاہان تیموریہ کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب رفیق دارالمصنفین

بہادر شاہ ظفر

(۳)

سادہ بیانی: ظفر نے جس طرح خیالات کو آسان اور سادہ بنانے کی کوشش کی ہے، اسی طرح اپنی شاعری میں زبان بھی نہایت ہی آسان اختیار کی ہے، اس کا پورا دیوان پڑھ جاؤ مشکل سے کوئی غزل ایسی نظر آئے گی جس میں فارسی کی مغلق ترکیبیں اور غیر مانوس لفظ استعمال کئے ہونگے، اسی لئے بعض ہمعصر شعراء کی طرح اس کی غزلوں میں بہت کم بیان اور معنی کا الجھاؤ پیدا ہونے پایا ہے، بعض غزلیں تو سلاست اور روانی کا نمونہ ہیں، کچھ ایسی ہیں کہ اگر ان کو نثر بنانا چاہیں، تو لفظوں کو آگے پیچھے کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، مثالیں ملاحظہ ہوں،

ان کے دل میں غبار ہے دیکھیں ۔۔۔ کس طرح سے صفائی ہوتی ہے،
عاشق! زیر تیغ سر دھر دو ۔۔۔ ابھی مشکل کشائی ہوتی ہے،

آشنا ہو تو آشنا سمجھے، ۔۔۔ ہو جو نا آشنا تو کیا سمجھے،
ہم اسی کو بھلا سمجھتے ہیں، ۔۔۔ آپ کو جو کوئی برا سمجھے،
تو ہی کعبہ میں تو ہی تبکدہ میں ۔۔۔ ہے وہ مشرک جو دوسرا سمجھے،

اے ظفر وہ کبھی نہ ہو گمراہ جو محبت کو رہنما سمجھے،

میں ہوں عاصی کہ پرخطا کچھ ہوں، تیرا بندہ ہوں اے خدا کچھ ہوں
جز و کل کو نہیں سمجھتا میں دل میں تھوڑا سا جانتا کچھ ہوں

مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں بخدا ہم کہیں تو کیا کہویں،
مدعی کہنے ہی نہیں دیتے مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں،

مثل فوارہ سر بلند نہ کر کہ بلندی کے ساتھ پستی ہے،
رنج و غم کو خدا رکھے آباد خانہ دل میں ایسی بستی ہے،

وہ بت جمال اور ہی ہے اسے دیکھا کمال اور ہی ہے
ترا ابرو کماں ہلال کہاں مہ جبیں پر ہلال اور ہی ہے

سہل ممتنع کی مثال ملاحظہ ہو،

درد دل اپنا صنم، کیوں نہ ہم تجھ سے کہیں
چپ رہا جاتا نہیں کب تلک چپکے رہیں
بھر رہا ہے دل مرا کیوں نہ پھر آنسو بہیں
چشم و دل دونوں برے ہم بھلا کس کو کہیں
یہ ترے جور و ستم یار ہم کب تک سہیں
اس غزل پر سب ظفر آفریں تجھ کو کہیں

ظفر کی شاعری کا بڑا حصہ اسی سادگی کا مکمل نمونہ ہے، ہر جگہ طرز بیان صاف، سادہ اور سہل ہے، بھاری اور گراں لفظ بہت ہی کم ہیں، ظفر نے اس قسم کا طرز جانکر اختیار کیا، خود کہہ گیا ہے،

اے ظفر چاہیے ہاں لطف سخن میں ایسا — کہ جسے سن کے ہوں سب عالم و جاہل محظوظ

چنانچہ بعض اوقات یہ سادگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی شاعری روزمرہ کی گفتگو معلوم ہونے لگتی ہے، مثلاً

مرگیا بیمار اس کے نرگس بیمار کا — دوستو اچھا ہوا اچھا ہوا اچھا ہوا
خیر تو ہے کیا ہوا بگڑی کہیں اس یار سے — آج کیوں تو اے ظفر پھرتا ہے گھبرایا ہوا

ساتھ میرے چلے چلو چپ چپ — راہ میں تم نہ کچھ کہو چپ چپ
گھر میں چل کر شکایتیں کرنا — یاں نہ مجھ سے گلہ کرو چپ چپ
میرے جاتے ہی انکے غیروں سے — پھر لگی ہونے گفتگو چپ چپ
ابھی صیاد کی لگی ہے آنکھ — نہ کرو شور بلبلو چپ چپ
دل کسی غنچہ لب کو تم نے دیا — اے ظفر تم جو رہتے ہو چپ چپ

جس کو سناؤں درد دل آئے نہ اسکو تاب — سنتے ہی یہ کہے کہ بس اے دردمند بس
اتنی زباں دراز نہ ہو یاں بھی ہے زبان — بس اب آگے کہیئے زبان اپنی بند بس

میری نگاہ ہے وہ غضب دیکھ کر جسے — خنجر تو الحفیظ کہے الاماں تیغ

ہوں وہ مثل زلف برہم اور میں — ان کی زلفوں کی بلائیں لوں جی خوش

آؤ گھر میرے اے صنم آؤ — تمہیں اللہ کی قسم آؤ
قاصدو لاؤ جلد خط کا جواب — ایک دم جاؤ ایک دم آؤ
اے بتو میرے خانۂ دل کو — دیر تم سمجھو یا حرم آؤ
میری گریہ سے ہے اگر منظور — سیر آب رواں ادھر آؤ
اتنی تاثیر ہے کہاں کہ جو تم — سن کے میری فغاں ادھر آؤ

آگئی میری جان ہونٹوں پر اب تو آ اے میری جاں ادھر آؤ

جاؤ تنہا نہ تم تمھارے ساتھ جائیگی میری جاں کھڑے تو رہو

ہے پڑی دل جلوں کی آہ جہاں تاب کیا تم وہاں کھڑے تو رہو

قد پہ نازاں ہے اپنے سروچمن اک ذرا تم بھی ہاں کھڑے تو رہو

شکایت کس سے کی میں نے بلاؤ سامنے اسکو کرونگا شکوہ میں تیرا معاذ اللہ معاذ اللہ

قد جاناں کو وہ تشبیہ کیونکر نخل طوبیٰ کی کہاں وہ قد کہاں طوبیٰ معاذ اللہ معاذ اللہ

جو کہ عاشق کو جلائے جوں شمع وہ بھی جلتا رہے، آمین اللہ

اپنے مرنے کی دعا گر مانگوں وہ ستمگر کہے، آمین اللہ

جو ستائیں تجھے ان کو بھی ظفر عوض اس کا ملے آمین اللہ

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا،

فقیروں سے تو پوچھ لذت عشق اہاہاہا اہاہاہا اہاہاہا اہاہا،

اس بے تکلف طرز بیان اور انداز گفتگو کو سن کر اگر اہل سخن ظفر ہی کی زبان سے کہیں کہ ان ع

اشعار کے تصدق اس گفتگو کے صدقے

تو شاید حق بجانب ہونگے،

محاورات اس سادگی کے باوجود ظفر کو زبان پر اتنی قدرت ہی کہ بادشاہ سخن بن کر زبان اور الفاظ پر فرمانروائی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قلعہ معلیٰ بلکہ اردو زبان کا کوئی محاورہ ایسا نہیں جو اس کے دیوان میں موجود نہ ہو، اور ان محاوروں کو اس خوبی اور صفائی سے اپنے اشعار میں باندھ جاتا ہے، کہ اشعار کی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا، مثلاً چرانا ہے، اب اس مصدر سے جو ممکن اور مروج محاورے تھے، ان سب کو ظفر نے اپنی ایک غزل میں استعمال کیا ہے،

ملاحظہ ہو:۔

محبت کی کوئی اب آنکھ تجھ سے ہم چراتے ہیں
علم ہوں گرچہ سو شمشیر کین کب دم چراتے ہیں

نہیں شمشیر سے جنگی جھپکتی آنکھ میداں میں
نظر وہ دیکھ تیرا ابروئے پرخم چراتے ہیں

نہ روکوں کب تلک اشکوں کو اور روکوں تو ڈر یہ ہے
کہ پانی زخم دل اے دیدۂ پرنم چراتے ہیں

یہ طفل اشک ہیں وہ چور باندھی چور مژگاں نے
کہ آنکھوں میں سے کاجل دیکھ تو پیہم چراتے ہیں

ظفر سر عشق کو سر باز دیتے ہیں محبت میں،
وگرنہ جان اپنی یاں بڑے رستم چراتے ہیں،

یا مثلاً توڑنا سے، دم توڑنا، قسم توڑنا، ستم توڑنا، قدم توڑنا، توبہ توڑنا، نشتر غم توڑنا، نفس سرکش کو توڑنا، اتنے محاورے کو ظفر نے جسطرح استعمال کیا ہے ان کو بھی دیکھئے،

زیر خنجر ترے بسمل جو یہ دم توڑتے ہیں
کوچۂ غم میں پھر آنے کی قسم توڑتے ہیں،

دل مرا لے کے جو وہ سنگ ستم توڑتے ہیں
کیا ستم کرتے ہیں کیوں ساغر جم توڑتے ہیں

ہر قدم پر ترے دیوانے سر دشت جنون
سیکڑوں خار سدا زیر قدم توڑتے ہیں

ابر مژگان سے بندھی رہتی ہے اشکوں کی جھڑی
تار رونے کا نہیں دیدۂ نم توڑتے ہیں

جام مل دیتے ہیں تو کرنہ تامل ساقی
توبہ ہم آج ترے سر کی قسم توڑتے ہیں

ہیں ہمیں سبحہ و زنار برابر دونوں
نہ ہم یہ جوڑتے ہیں اور نہ یہ ہم توڑتے ہیں

آتے ہیں پھر سر کاوش جو کبھی حضرت عشق
سیکڑوں دل میں مرے نشتر غم توڑتے ہیں

نفس سرکش کو ظفر توڑتے ہیں جو اپنے،
میرے نزدیک بڑا ہی وہ صنم توڑتے ہیں

اسی طرح اڑجانا سے خبر اڑجانا، رونق اڑجانا، نیند اڑجانا، رنگ اڑجانا، تاب اڑجانا

نے اڑ جانا وغیرہ محاورے مستعمل ہوتے ہیں انکو بھی ظفر نے اپنے اشعار کی لڑیوں میں پرو دیا ہے ،

جب چمن میں اس کے آنیکی خبر اڑ جائیگی — گل کی رونق دم میں لے بادِ سحر اڑ جائیگی
آپ کا کیا جائیگا گر خواب میں آؤگے تم — نیند آنکھوں سے ہماری رات بھر اڑ جائیگی
خون کو مل لیگا میرے تو کفِ پا سے ترے — سرخیِ رنگِ حنا لے فتنہ گر اڑ جائیگی
آئیگا وہ مہرِ وش لے دل تو شبنم کی طرح — تاب و طاقت تیری اسکو دیکھ کر اڑ جائیگی
یہ صباست کوئی پوچھے تیری کیا آئیگا ہاتھ — خاک میری اسکے کوچے سے اگر اڑ جائیگی

شعلۂ رخسارِ ساقی گر ہوا پر تو فگن
مے جو ہے ساغر میں تیرے اے ظفر اڑ جائیگی

بلا ڈال دینا، مصیبت ڈال دینا، زنجیر ڈالدینا، شمشیر ڈالدینا، قلم ڈال دینا، دریا میں ڈال دینا، جدائی ڈال دینا، آگ ڈال دینا، تاثیر ڈال دینا جیسے محاورات پر ظفر کی طبع آزمائی سنیے

دل پر بلائے زلف گرہ گیر ڈال دی — تو نے مصیبت اے مری تقدیر ڈالدی
جب روبرو وہ آئے تو پائے نگاہ میں — موجِ سرشکِ چشم نے زنجیر ڈالدی
اپنی بھویں بنا کے دکھائیں جو یار نے — شمشیر گرتے ہاتھ سے شمشیر ڈالدی
لکھا جو ہم نے اپنی سرافگندگی کا حال — گردن قلم نے بھی دمِ تحریر ڈالدی
جب ہم سمجھ گئے کہ ہے تقدیر کیمیا — دریا میں ہم نے جیسی تھی اکسیر ڈالدی
چوں شیر و شہد بہم ہوئے دو یار گر دو روز — تو نے جدائی اے فلکِ پیر ڈالدی
کیا خاک دل مرا ہو خالی کہ اور بھی — تو نے نہ آگ نالۂ شب گیر ڈالدی
مانی دکھا کے اپنا مرقع خجل ہوا — جب اس کے سامنے تری تصویر ڈالدی
کیونکر نہ ہو اثر دلِ عالم میں اے ظفر — ترے سخن میں عشق نے تاثیر ڈالدی

کھینچنا کے مختلف محاورات بھی سن لیجئے،

جو خنجر گل نے عندلیب زار پر کھینچا
تو قمری کو بھی ہے سرو چمن نے دار پر کھینچا

کھڑا ہوں محو حیرت یوں لگا دیوار سے تیرے
کسی نے نقش ہو جیسے کوئی دیوار پر کھینچا

وفا کا کر کے تو اقرار ہم سے ہو گیا منکر
تری الفت سے ہم نے ہاتھ اس انکار پر کھینچا

جلا دیگا جہان کو دیکھ لینا یہ دل سوزاں
جو نالہ اس نے اور اک آہ آتشبار پر کھینچا

خط رخسار کو تیرے جو دیکھا اے گلستاں رو
قلم سب خوشنویسوں نے خط گلزار پر کھینچا

ہوئی کچھ تو دل بسمل کی اپنی صورت تسکیں
تری تصویر کو جب سینۂ افگار پر کھینچا

دل زخمی سے اپنے ناوک دل دوز کو اسکے
اگرچہ کھینچنا تھا اے ظفر دشوار پر کھینچا

ظفر کے دیوان میں محاورہ بندی کی سیکڑوں مثالیں ملیں گی، ہم نے طوالت سے بچنے کے لئے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے، لیکن انہی سے اندازہ ہوا ہوگا، کہ ظفر کو زبان پر کتنی قدرت ہے، سچ تو یہ ہے، کہ وہ اپنے کو الفاظ کا تابع نہیں بناتا ہے، بلکہ الفاظ کو اپنا تابع بناتا ہے، اسی لئے وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے، اور اسی تفریح اور کھیل میں زبان اور بیان میں ایک خاص لطف اور چاشنی پیدا کر دیتا ہے،

صنائع لفظی اس کا کلام لفظی صناعی سے جو متاخرین کے کلام کا زیور ہے خالی نہیں، پہلے مصرع کے لفظوں کو الٹ پلٹ کر دیکھئے کیسے دوسرا مصرع بنا لیتا ہے،

یہی ایک غم ہے یہی اک الم ہے
یہی اک الم ہے یہی ایک غم ہے

مری چشم نم ہے، اسی رنج و غم مین
اسی رنج و غم میں مری چشم نم ہے

خدا کی قسم ہے، یہ کہتا ہوں سچ میں
یہ کہتا ہوں سچ میں خدا کی قسم ہے

کیا کب رقم ہے کوئی شکوہ میں نے ‖ کوئی شکوہ میں نے کیا کب رقم ہے
ظفر کیا ستم ہے ہوا دوست دشمن، ‖ ہوا دوست دشمن ظفر کیا ستم ہے

آیا سحاب ساقی تو لا شراب ساقی ‖ تو لا شراب ساقی آیا سحاب ساقی
ہے پیچ و تاب ساقی زلفوں کو تیری دلکو ‖ زلفوں سے تیرے دل کو ہے پیچ و تاب ساقی
کیا مست خواب ساقی آنکھیں ہیں آج تیری ‖ آنکھیں ہیں آج تیری کیا مست خواب ساقی
مے آفتاب ساقی ہے ہم خنک دلوں کو ‖ ہے ہم خنک دلوں کو مے آفتاب ساقی
مت کر خراب ساقی، تو بزم میکشاں کو ‖ تو بزم میکشاں کو مت کر خراب ساقی
جام حباب ساقی دریا میں کس نے الٹا ‖ دریا میں کس نے الٹا جام حباب ساقی

ہے یہ عذاب ساقی تو ہے ظفر سے بدتر
تو ہے ظفر سے بدتر ہے یہ عذاب ساقی

بدیع کی اصطلاح میں اس کو "عکس" کہتے ہیں، یہ صفت اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں میری نظر سے نہیں گذری، البتہ قدیم فارسی شعرار کے یہاں یہ ملتی ہے، اس کے علاوہ دوسری لفظی صنعتیں بھی ظفر کی شاعری میں پائی جاتی ہیں، مثلاً

اتنسیق الصفات یعنی کسی موصوف کی پے در پے صفتوں کا لانا، جیسے

شوخ چشمے خوش نگاہے بیوفائے بدگمانے ‖ دل فریبے دلنوازے دلربائے دلستانے
مست نازے فتنہ سازے تندخوئے جنگجوئے ‖ ظلم کیشے ظلم کوشے ظلم خواہے ظلم رانے
کج کلاہے کج ادائے پرفریبے پردغائے ‖ بدطریقے بدشعائے بدمزاجے بدزبانے
خوش نگاہے خوبروئے نازلہ سنجے نغزگوئے ‖ ہوشیارے حرف گیرے نکتہ طبعے نکتہ دانے
خود پرستے خودنمائے خود پسندی خودستائے ‖ خودسرے ناآشنائے سرکشے نامہربانے

ہم ظفر ہیں اس پہ مفتوں خوار و رسوا از جنوں
وہ یہ مانے یا نہ مانے وہ یہ جانے یا نہ جانے

۲۔ لزوم مالا یلزم یعنی قافیہ کے آخری حرف (روی) کے پہلے کسی خاص حرف کا التزام کر لینا جیسے

توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جام شراب
مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے

جس طرح مژگان سے میرے ہیں بندھے اشکوں کے تار
اس طرح بدلی نہیں کوئی برستی خوب ہے

خواب میں جلوہ دکھا دیتا ہے وہ مہوش کیسے
چشم میری دیکھنے کو جب ترستی خوب ہے

راہ بہتر ہے رہ ہموار رہرو کے لئے
نہ بلندی ہے بہت اچھی نہ پستی خوب ہے

خود پرستی چھوڑ دو، یہ بت پرستی ہے صریح
غافلو حق میں تمھارے حق پرستی خوب ہے

۳۔ سیاق الاعداد یعنی کلام میں اعداد کا لانا جیسے

چلنا مریض غم کو ترے آٹھ نو قدم
معلوم ہوے ضعف سے دس بیس قدم

پہلے تھا ایک ستم پھر ہوے ایک کے دو
دو کے پھر چار ہوے ہو گو اب چار کے چھ

چار بار آٹھ پہر میں ہیں وہ ان سے ملتے
ان سے ملنے کی ہیں معلوم جنھیں گھاتیں چار

ناخن کریں ہیں زخموں کو دو دو ملا کے ایک
تھے آٹھ دس سو ہو گئے اب چھل کے چار پانچ

پھپھولے دل پہ جو دس بیں داغ ہیں دو تین
تو تمغے ہیں بہت اور چراغ ہیں دو تین

۴۔ تلمیع یعنی کلام میں ایک حصہ دوسری زبان کا لانا جیسے

جلوۂ شبنم و گل پر ہے رولاتی ہے مجکو
دم گلگشت چمن یاد رُخ پر عرقے

کچھ عوض دل کے دہ تکرار سو دیتا ہی تو کیا
اے برائے یا قسلفتے پر قسلفتے

رُخ گلگوں پہ ہے اس گل کے نہ شک کی سرخی
جلوۂ صبح بہاران و بہار شفقے

اے ظفر تم کو ہی منظور اگر رد حسود
تو پڑھا کیجئے قل اعوذ برب الفلقے

۵۔ حسن التکریر، اس کی مثالیں تو ظفر کے یہاں کثرت سے ہیں، ہم صرف چند اشعار پیش کریں گے،

مجھ میں اور گل اس میں باہم گفتگو تھی صاف صاف ۔۔۔ بات کی لغزش نہ تھی واللہ جو تھی صاف صاف
نکہت گل لے گئی دل کو ہمارے باغ میں ۔۔۔ تیری ہی سی لے سراپا ناز و بو تھی صاف صاف
شمع کی طرح سے ہم رات کو روتے روتے ۔۔۔ بہ گئے آنسوؤں میں صبح کے ہوتے ہوتے
موت یار آئی تو غفلت سے ہوں یوں ہم ہشیار ۔۔۔ ڈر کے جوں خواب میں چونکے کوئی سوتے سوتے
آگاہ تو کیا مجھے لذت سے عشق کی ۔۔۔ زخموں نے اس نے میرے نمک کر بھرا بھرا
کیا بھر دیے ہیں کان خدا جانے غیر نے ۔۔۔ غصے میں جو بھرے ہے وہ کافر بھرا بھرا
گہ یاس و گہہ امید و گہے رنج و گہہ خوشی ۔۔۔ مہماں سرائے دل میں ہیں مہمان عجب عجب
اے چشم یار بار نہ ہو دیکھ اشک بار ۔۔۔ ہر بار تجھ سے اٹھتے ہیں طوفان عجب عجب
گل جو چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر ہر کیا بہار ۔۔۔ سب کا ہی رنگ جدا جدا سب کی ہے بو الگ الگ
تجھے دے ہے چمن چمن کے گلہائے تازہ ۔۔۔ مرا دیدۂ خوں چکاں اچھے اچھے
گر آہ و نالہ دونوں پیدا ہوں ایک دل سے ۔۔۔ لیکن الگ الگ ہی تاثیر اپنی اپنی
خالی نہیں جہان میں تمنا سے کوئی دل ۔۔۔ ہر ایک میں ہے گرچہ تمنا جدا جدا

ایک ہی تشبیہ کو طرح طرح سے ادا کرنا

ظفر کے یہاں ایک چیز اور ہے، جس سے اُنکی قدرتِ ادا کا حال معلوم ہوتا ہے، زلف اور سانپ کی تشبیہ معمولی چیز ہے، مگر دیکھئے کہ ظفر نے اسی ایک تشبیہ کو ذرا ذرا رنگ بدل کر کس کس طرح ادا کیا ہے،

نہیں اس رُخ پہ زلف اور زیر زلف اس زلف کا شانہ ۔۔۔ چمن میں ناگ سا لڑتا ہوا ناگن سے نکلا ہے،
دیکھ کر آئینے میں وہ زلف کو ہنسنے لگے ۔۔۔ بند پانی میں پڑا طرفہ کہیں کا سانپ ہے
چاند پر دوڑتا ہی مارِ سیاہ شبِ تار ۔۔۔ رُخ روشن پہ ترے زلف کو بل کھاتے سے

زلف یوں روئے عرق آلودہ پر لہرا ہی
صبح جوں ناگن گلوں پر چاٹنے اوس آئے ہے

زلف یوں چہرے پہ ہلتی ہی ہوا سے اسکے
جس طرح مار سیہ کھائے ہی بل پاؤں کے بل

جس طرح مار سیہ گل سے لپٹ جاتا ہی
زلف یوں تیری گئی ہی گلِ رخسار سے مل

جوں شانہ اسکو لے دلِ صد چاک تو نہ چھیڑ
مار سیہ سے کم نہیں ہرگز گزند زلف

ناگنی زلفِ بتاں کی یہ عجب کا فر ہی
کاٹ کے میٹھی ہے یان ہو کے دو تا اور طرف

کیا تماشا ہے تری زلف کا عکس آئینہ میں
سانپ کی طرح سی لہرائے ہی تالاب میں موج

نچوڑے زلف نہا کر جو وہ تو قطرۂ آب
دہاں پہ مار سیہ کا لعاب ہو خالص

حلقہ ہے بلا زلف کا اے پنجہ شانہ
دیکھو کہیں انگلی نہ سیہ مار کے منہ مین

اڑ کر بھی زلفِ یار سے ناگن نہ بچ سکی
جس وقت اس کے منہ پہ چڑھی مار کھا گئی

سوچا جی میں ہوں اس زلف در گوش کو دیکھ
سانپ کو پکڑوں کہ میں سانپ کے من کو پکڑوں

نہیں اس یار کے روی عرق آلودہ پہ زلف
اسکو چاٹتا ہی سانپ یہ پیاسا کالا

کیوں سوتے سوتے چونک پڑی خواب میں ظفر
وہ مارِ زلف دیکھ کے شاید ڈرے سی ہو

دکھاوے کان کے بالے میں اسکو زلف الجھا کر
نہ دیکھا جس نے ہو مار سیہ سے لڑتے بچھو کو

کہتا ہوں دل کو زلف کی ناگن سے کر حذر
جاتی پلٹ ہی دیکھ یہ بد ذات کاٹتے

زلف آگئی صبا سے وہ خال دہن کے پاس
مار سیاہ کھیلے ہے کیا اپنے من کے پاس

ناگن سی باغ میں کوئی لہرا رہی ہے یہ
یا زلف تیرے چہرہ پہ کھائے ہے بل پڑی

ہوا سے یوں جو تیری زلفِ عنبریں الٹی
کسی کو ڈس سکے یہ ناگن نہ ہو کہیں الٹی

یار کی زلف کو سنبل سے تشبیہ دینا عام بات ہی، مگر سنئے کہ اسی عام چیز میں ظفر اپنی جدتِ طبع سے کیسی کیسی ندرتیں پیدا کرتا ہے،

مجھے آئے نہ رونا دیکھ کر کیوں سنبلِ تر کو — کہ پھر جائے ہے اسکی زلف دل اور آنکھوں میں

سنبل کی لہر سے نہ رہے پھر ہمیں مطلب — یکدست جو تم کاکلِ خم دار دکھا دو

سنبل ہی کیا پریشاں ہو دیکھ زلف تیری — موجِ نسیم کو بھی ہے پیچ و تاب ساقی

تا حشر نہ ہو خواہشِ زلفِ رہِ سنبل — تم ہم کو اگر زلفِ گرہ گیر دکھا دو

مرے مزار پہ روئیدہ کیوں نہ ہو سنبل — کہ تیری زلف سے ہے دل کو پیچ و تاب ہنوز

تری زلف کے سامنے تاب کیا — کہ بل باغ میں شاخِ سنبل کرے

سنبل چمن میں کیونکہ نہ ہو غرقِ آبِ شرم — منہ دھو کے وہ بال سنوارے علی الصباح

اگر ہو عکس افگن یار کی کاکل سمندر میں — تو پیدا جائے موجِ آب ہو سنبل سمندر میں

انھیں ہو رشک سے اس زلف پرشکن کی عجب — کہ شاخِ سنبلِ تر کھا کے پیچ و خم ٹوٹے

بیاں کیونکر بھلا ہوئے حدیث اس زلف پیچاں کی — نہ جب تک چل کے کیجئے سیر کیسر سنبلستاں کی

زلف اسکی پرشکن سے کیا بلا کرتی ہے بل — دیکھ کھاتی ہیں شکستیں شاخِ سنبل باغ میں

سنبل پیچاں اُگے کیونکر نہ اسکی خاک سے — مر گیا جو دیکھ کر اس زلفِ عنبر بو کے بل

ہے نہ قرباں ہی رخِ قاتل خونریز پہ گل — کھاتی سنبل بھی ہے اس دلآویز پہ گل

سنبل پہ گئی اوس سی پڑ جب کہ دمِ غسل — پانی تری اس زلفِ گرہ گیر سے ٹپکا

یار کے ابرو کو شمشیر سے تشبیہ ہر شاعر نے دی ہے، مگر دیکھئے کہ ظفر نے اس تلوار کے کیسے کیسے ہاتھ دکھائے ہیں،

جب ہو گئی وہ ابروئے خمدار سامنے — دی پھینک اپنے ہاتھ سے تلوار سامنے

کون ہمسر ہو سکے اس ابروئے خمدار سے — دم نہ اتنا تیغ میں نے اسقدر خنجر میں ہے

کون منت کش شمشیر اجل ہو قاتل — طاق تیرا خمِ ابرو بھی ہی خونخواری میں

قتل کریں اک عالم کو وہ ابرو کے خم ایسے ہیں ان شمشیروں کے ہیں مقابل دیکھو باہم ایسے ہیں

کس نے دیکھا خم ابرو کو ہے پیمانے میں چل رہی آج جو تلوار ہے میخانے میں

نہیں شمشیر سے جن کی جھپکتی آنکھ میدان میں نظر وہ دیکھ تیرا ابروے پرخم چرانے ہیں

ہے طرفہ طلسم ابروؤں میں تیرے جو ٹیکے اک قبضہ تلوار میں ہیں عربدہ گردو

کیا لائے اس ابرو کی بھلا تاب دم تیغ ہو جائے اسے دیکھتے ہی آب دم تیغ

جب جنبش ابرو سے تری قتل ہو عالم پھر شرم سے ہو جائے نہ کیوں آب دم تیغ

جلا دو کھا اپنی تو شمشیر تو مجھ کو کشتہ ہوں میں ابرو کا جو ہے آب دم تیغ

تیغ ابرو سے میں جانباز ظفر سینہ سپر بے اجل پڑتا نہیں دھار سے تلوار کے خط

ابرو پہ اس کے چین کا عالم ظفر ہو اور جوہر نہاں ہیں یہ کسی شمشیر میں غلط

ابرو کو اسکی کہتے ہیں سب تیغ اصفہان ہے اصفہانیوں میں کہاں ایسا خم و دغ

کہاں ہر دل میں گنجائش تری تیغ دو ابرو کی میان کب اک میان و بہم شمشیر ہوتی ہیں

جہاں کو جنبش ابرو سے اس نے قتل کیا الٰہی اسکی یہ شمشیر چل گئی تھی کیوں،

جیسی ہے چین اس ابروے پرخم پہ خوشنما جوہر کہیں بھی ایسے نہ شمشیر پر کھلے

ابرو ہلی جو اس کی عجب سیر ہو گئی تلوار چلتے چلتے رہی خیر ہو گئی،

معشوق کی مست آنکھوں کا نقشہ کس کس طرح کھینچا ہے،

یاد چشم مست میں اسکی یہ کیفیت رہی ہوش باطن میں رہا ظاہر مجھے غفلت رہی

ہم نہ کہتے تھے کہ نرگس کو دکھا مت چشم مست نیند اسکی آنکھ سے ای مست خواب اڑ جائیگی

کر دیا اک نگاہ میں بے خود چشم کافر ہے کیا خدا جانے

تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو ہم بھی دانا تھے پر اب پھرتے ہیں دیوانے سے

ہم کو اس دور میں ہو کیوں طلب ساغر ہے ۔ یہ توجب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو

سو فتنہ خوابیدہ بیدار ہوں اک پل میں ۔ گر خواب میں بھی دیکھے اس نرگس فتاں کو

مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی ۔ وہ چشم مست ساقی جام جم ہے

عین مستی میں جو تو اپنی ذرا دکھلائے آنکھ ۔ شرم سے نرگس کی گلشن میں نہ کیوں جھک جائے آنکھ

اشک آنکھوں میں اپنی کیوں نہ وہ بھر کر ۔ ساغر مے دیکھ کر جس کو تری یاد آئے آنکھ

اپنی چشم مست کی گردش نہ اے ساقی دکھا ۔ دیکھ چکر میں ابھی جام شراب آجائے گا

بھرا ہوا ہے تری چشم مست میں یوں ناز ۔ کہ جس طرح سے مئے ناب ہو ایاغ کے بیچ

اٹھا کے آنکھ نہ دیکھا چمن میں نرگس نے ۔ رہا جو اس کو تری چشم پر حیا کا لحاظ

کرے ہی فتنہ ترے چشم فتنہ زا کا لحاظ ۔ یہ وہ بلا ہے، بلا کو ہے اس بلا کا لحاظ

کشتہ ہوں چشم مست کا میرے مزار پر ۔ لازم ہے جام بادۂ انگور کا چراغ

روشن ہو چشم مست کے کشتہ کے گور پر ۔ روغن کی جائے بادۂ انگور سے چراغ

کیفیت اپنی چشم سیہ مست کی نہ پوچھ ۔ صوفی تمام دیکھ کے میخوار بن گئے،

منظور ہے ظفر کو لکھے وصف چشم یار ۔ نرگس کے دے قلم کوئی اے ہمنشین تراش

چشم مست اس کی بے ہی جائے ہی ہوش ۔ گرچہ ہم ہوشیار رہتے ہیں،

چشم اسکی خود ہے، سحر نگاہیں ہیں، ۔ حاجت نہیں ہے سرمہ جادو کی آنکھ میں

کاسہ چشم تصور چھوڑ کر اپنا کبھی ۔ اے ظفر محو تماشا ہیں نہ جام و جم میں ہوں

بغیر بادہ بھی اس شوخ خود پرست کی آنکھ ۔ نشے میں حسن کے ایسی ہے جیسے مست کی آنکھ

(باقی)

تلخیص تبصرہ

سیلنڈرا کی سلطنت

"کئی مہینے ہوئے بہار ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آر. سی. موزمدار نے انگریزی میں اس عنوان پر ایک مقالہ پڑھا تھا، ذیل میں اسکی تلخیص ہے"

ڈچ محققوں کی تحقیق سے ہندوستان کی ایک وسیع سلطنت کے وجود کا پتہ چلا ہے جو ملایا کے پورے حصہ میں واقع تھی، جس شاہی خاندان نے اس سلطنت پر حکمرانی کی، اس کا ذکر ہندوستان کی کسی گذشتہ تاریخ یا کتاب میں نہیں ہے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ شاہی خاندان نسباً ہندوستانی تھا، اور اس نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان سے برابر تعلقات قائم رکھے،

یہ شاہی خاندان سلینڈرا کے نام سے موسوم تھا، ۷۷۵ء میں اس کا شاہی اقتدار ملایا میں قائم ہوا، اور رفتہ رفتہ پورا ملایا جس میں سوماترا اور جاوا بھی شامل تھے، اس کے قبضہ میں آگیا، اس کا اثر انام اور کمبوڈیا میں بھی پھیلا، اس سلطنت کے تمول اور شوکت کے حالات عرب تاجروں نے لکھے ہیں، جو یہاں برابر آتے رہتے تھے، ابن خردازبہ (۸۴۴ء) نے لکھا ہے، کہ زابج کا بادشاہ مہاراجہ کہلاتا ہے اسکی روزانہ آمدنی دو سومن سونا ہے، وہ سونے کی ایک اینٹ بناتا ہے، اور پانی میں یہ کہہ کر پھینک دیتا ہے، کہ یہیں میرا خزانہ ہے، اسکی آمدنی کا ایک حصہ قریب سومن سونا روزانہ مرغ کی لڑائی سے حاصل ہوتا ہے، جو مرغ جیتا ہے، اسکی ایک ٹانگ کا مالک بادشاہ ہوجاتا ہے، مرغ کا مالک سونا دیکر اس کو

محفوظ کرلیتا ہے، ابن روستہ (۹۰۳ء) کا بیان ہے، کہ زابج کا بادشاہ مہاراجہ کہلاتا ہے یعنی بادشاہون کا بادشاہ، مگر وہ ہندوستان کے بادشاہون مین سب سے بڑا نہیں سمجھا جاتا ہے، کیونکہ وہ جزیرہ میں رہتا ہے، کوئی بادشاہ اس سے زیادہ دولتمند یا طاقتور نہیں ہے، اور کسی کی آمدنی اس سے زیادہ نہیں ہے ان کے علاوہ اور دوسرے عرب مصنفون نے بھی مثلاً اسحٰق بن عمران (المتوفی ۹۰۵ء) اور ابن سراپیون نے بھی یہاں کے حالات لکھے ہیں، لیکن ان مین ابوزید حسن کا بیان بہت ہی مفصل ہے، جس نے سلیمان کے بیانات کے ساتھ کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا ہے، اس کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے، کہ زابج اور چین کی مسافت بحری راستہ سے ایک مہینہ کی ہے، اگر ہوا موافق ہو تو یہ مدت اور بھی کم ہو جاتی ہے یہان کا بادشاہ مہاراجہ کے نام سے مشہور ہے، اسکی سلطنت کا رقبہ ۹۰۰ فرسنگ ہے، بادشاہ دوسرے دوسرے جزیرون کا بھی مالک ہے، جو ایک ہزار فرسنگ تک پھیلے ہوئے ہیں، جن جزیرون پر اسکی حکومت ہے، ان کے نام یہ ہین، سری بزہ اور رامی جن کے رقبے ۴۰۰ اور ۵۰۰ فرسنگ علی الترتیب ہین، کالاہ کا بحری ملک بھی جو چین اور عرب کے درمیان واقع ہے، مہاراجہ کے حدود میں داخل ہے، کالاہ کا رقبہ ۸۰ فرسنگ ہے، یہ عود، کافور، صندل، عاج، آبنوس اور مسالے کا بہت بڑا تجارتی مرکز ہے، اس سے اور عمان کے بندرگاہ سے تجارتی لین دین برابر جاری رہتا ہے، جس جزیرہ مین مہاراجہ رہتا ہے، وہان بہت ہی گنجان آبادی ہے، اور گاؤن کی ایک مسلسل قطار ہے، ایک گاؤں میں صبح کے وقت جب مرغ بانگ دیتا ہے تو دوسرے گانو ن والے سنتے ہیں، اس طرح یہ آواز سو فرسنگ تک سنائی دیتی ہے، زابج مین ایک عجیب رسم ہے، بادشاہ کا محل ایک جھیل سے ملا ہوا ہے، اس مین روز صبح کو بادشاہ سونے کی اینٹ پھینکتا ہے، جو پانی میں چھپ جاتی ہے، لیکن جوار بھاٹے میں صاف نظر آتی ہے، جب بادشاہ مرتا ہے، تو یہ اینٹیں باہر نکالی جاتی ہیں، جو گن اور تول کر سرکاری دفتر میں درج کر دی جاتی ہیں، اس کے بعد شاہی خاندان کے افراد، عہدیدارون اور ملازمون میں تقسیم ہو جاتی

ہیں، کچھ غربا کو بھی دیئے جاتے ہیں،

مسعودی نے بھی اپنی کتاب مروج الذہب میں کچھ تفصیلات دی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ چین اور سیراف اور عمان کے بندرگاہوں کے درمیان براہ راست بحری سفر ہوتا تھا، اوران دونوں ملکوں کے تجارتی جہاز کے ملنے کی جگہ کالاہ تھی، کیبس کی خلیج میں مہاراجہ کی حکومت ہے، جس کی سلطنت کے حدود غیر محدود ہیں، جتنے جزیرے اس کے پاس ہیں، ان کا سفر ایک تیز رو جہاز دو سال میں بھی نہیں ختم کر سکتا ہے، مہاراجہ کی سلطنت میں ہر قسم کے مسالے اور خوشبوئیں پائی جاتی ہیں، دنیا کا کوئی حکمران اپنی سلطنت کی زمین سے اتنی زیادہ دولت حاصل نہیں کرتا ہے، اسکے پاس لاتعداد فوج بھی ہے،

ان تفصیلات کے باوجود اب تک یہ پتہ نہیں چلا ہے، کہ سلینڈرا کی حکومت کا دارالسلطنت زابج کہاں پر واقع تھا، کچھ سال پہلے سماترا کی سری وجیا کی سلطنت زابج کی جاسے وقوع بھی جاتی تھی لیکن ابوزید حسن کے بیان سے اسکی تردید ہوتی ہے، کیونکہ وہ زابج کے جزیرہ کا تذکرہ کرکے لکھتا ہے، کہ بادشاہ جن جزیروں پر حکومت کرتا ہے، ان میں ایک سری بُزہ بھی ہے، اس سری بُزہ سے بلاشک وشبہہ سری جیوا مراد ہے، مگر میرا ذاتی خیال ہے، کہ سلینڈرا کا پایہ تخت جزیرہ نما ملایا میں ہوگا، جب سلینڈرا نے اپنی حکومت ملایا میں قائم کی تو یہ خطہ کلنگ یا کلنگا کے نام سے موسوم ہوگیا، جاوا میں سلینڈرا کے کچھ کتبے پائے گئے ہیں، جن کے حروف مقامی حروف سے بالکل مختلف ہیں، بلکہ یہ بنگال اور بہار کے پالا کتبے سے ملتے جلتے ہیں، یہاں پر یہ بات بھی معلوم کرنے کی ہے، کہ سیلااوا سیلودبھوا کے نام سے چند خاندان بنگال، بہار اور اڑیسہ میں حکمراں رہے ہیں، اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ سلینڈرا کلنگا یا اسکے آس پاس کے حصے سے باہر گئے، اور شاید ہندوستان کے کسی شاہی خاندان سے ان کا نسبی لگاؤ تھا، بعض محققوں کا یہ خیال ہے کہ برما میں جو تلانگ واقع ہے، وہ کالنگا یا تلنگانہ ہی سے منسوب ہے، جہاں سے لوگ یہاں آئے، تلانگ کا نام شاید تری کالنکا سے ماخوذ ہو، جو

کالنکا کے پچھم جانب پہاڑی خطہ ہے، اگر یہ قیاس صحیح ہے، تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیلنڈرا پہلے زیرین برما کی طرف گئے، اور پھر ملایا پہونچے، یہ بظاہر قیاسات ہیں، لیکن اون کے ذریعہ تحقیق کی راہیں صاف ہوجانے کی امید ہے، اس تحقیق سے پتہ چلے گا، کہ برما اور مشرق بعید میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کہاں تک پھیلا، ڈاکٹر کوئڈس نے بھی خیال کیا ہے، کہ شاید کمبوڈیا میں فونن کے حکمران سیلنڈرا ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں،

خاندان سیلنڈرا کے بادشاہوں کا سیاسی تعلق مشرق میں چینی شاہنشاہوں اور مغرب میں ہندوستانی بادشاہوں سے برابر قائم رہا، چینی تاریخوں میں سیلنڈرا کے یہاں سے کم از کم دس شاہی قاصدوں کے آنے کا ذکر ہے، وہاں سے تجارتی جہاز بھی برابر آتے رہتے تھے،

سیلنڈرا بودھ مذہب کے پیرو تھے، وہ مذہبی کتبے گوڈا یا بنگال سے منگواتے تھے، جاوا میں ایک کتبہ مورخہ ۷۸۲ء پایا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے، کہ سیلنڈرا خاندان کا گرو گوڈا سے آیا، نالندہ (بہار) کے ایک کتبہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سیلنڈرا خاندان کے ایک بادشاہ پالا پتر دیو نے یہاں ایک خانقاہ بنوائی، اسکی خواہش کے مطابق پالا کے بادشاہ یا بنگال کے دیوپال نے راج گرہا (یعنی راجگیرا) کے علاقہ میں اس کے اخراجات اور مرمت وغیرہ کے لئے پانچ گاؤں وقف کردیئے تھے، نالندہ کی کھدائی کے سلسلہ مین کچھ پیتل کی مورتیں بھی نکلی ہیں، جو جاوا کی صنعت سے ملتی جلتی ہین، یہ شاید اسی خانقاہ کے ساتھ ملحق ہوں، کیونکہ سیلنڈرا کے زمانہ میں نالندہ نے ملایا کے آرٹ اور مذہبی تحریکوں پر نمایاں اثر ڈالا تھا،

سیلنڈرا بادشاہوں کے دوستانہ مراسم جنوبی ہند کے چولا حکمرانوں کے ساتھ بھی تھے، لیڈن میں ایک تانبے کی تختی محفوظ ہے، اس کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے، کہ سیلنڈرا خاندان کے بادشاہ کوداما نی ورمن نے ناگا پٹن (یعنی مدراس کے علاقہ نگا پٹم) میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی، جو کہ کوداما نی ورمن

وی ہار کے نام سے مشہور تھی، چولا خاندان کے راجہ راجا نے اپنی حکومت کے اکیسوین سال میں اس خانقاہ کیلئے ایک گاؤں وقف کیا، ان دونوں خاندانوں کے درمیان تجارتی تعلقات بھی قائم تھے، تامل زبان کی ایک پرانی نظم میں ذکر ہے، کہ کالا گام سے کاویری کے دہانہ پر چولا کے بندرگاہ میں مال واسباب آیا کرتے تھے، یہ کالا گام سلینڈرا کا دار السلطنت تھا، جس کو چولا کاوارام اور عرب تاجر کالا کہتے تھے،

لیکن چولا اور سلینڈرا کے دوستانہ تعلقات بہت زمانہ تک قائم نہ رہ سکے، چولا خاندان کے پرانے کاغذات سے پتہ چلتا ہے، کہ اس خاندان کا شہنشاہ راجندر چولا سلینڈرا کے حکمران سنگ رام وجے تونگا ورمن پر غالب آیا، اوّل الذکر نے سمندر پار بہت سے ملکوں کو فتح کیا، اب تک عرصۂ دراز تک ہندوستان کے مورّخ ان ملکوں کی جائے وقوع ہندوستان کے اندر ہی بتایا کرتے تھے، حالانکہ چولا کے کاغذات میں یہ بات صریحًا لکھی ہے، کہ راجندر چولا نے سمندر پار ملکوں کو فتح کرنے کے لئے بہت سے جہاز روانہ کئے، بعض مورّخون نے ان ملکوں کو پگو (برما) کے اندر واقع ہونا بتایا ہے، اسمتھ نے بھی اپنی تاریخ ہندوستان میں اس کی حمایت کی ہے، لیکن اسمیں شک کرنیکی مطلق گنجایش نہیں ہے کہ یہ ممالک سماترا میں اور ملایا میں سلینڈرا کی سلطنت کے اجزائے تھے، اور انہی کو چولا راجندر نے فتح کیا،

چولا اور سلینڈرا سے مخاصمت کے اسباب نہیں معلوم ہوسکے ہیں، لیکن شاید تجارتی رقابت سبب ہو، سلینڈرا کی سلطنت ایک ایسے مقام پر واقع تھی، جہاں سے یہ مغربی اور مشرقی ایشیا کی بحری تجارتوں پر پورا اقتدار رکھتی تھی، معلوم ہوتا ہے، کہ چولا کے حکمراں بھی ایشیا کی بحری تجارتوں پر یہی اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ دونوں کی جنگ قریب قریب نصف صدی تک قائم رہی، راجندرا اور اس کے دو جانشینون نے سلینڈرا کے بادشاہوں پر فتح پائی، لیکن اتنی دور دراز مملکت کو اپنے قبضہ میں رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا، خصوصًا جب چولا سلطنت میں اندرونی اختلال

شروع ہوا، آخر میں وہ اپنے بحری مقبوضات سے باز آئے، اس کے بعد سلینڈرا اور چولا میں دوستانہ مراسم قائم ہوگئے، لیڈن میں جو کتبہ مورخہ ۱۰۹۰ء محفوظ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، کہ سلینڈرا کے ایک بادشاہ کی خواہش پر چولا کے بعض حکمرانوں نے نالندہ میں سلینڈرا کے بادشاہ کی بنائی ہوئی خانقاہ کے لئے ایک گاؤں وقف کر دیا،

لیکن چولا کے حملوں کے بعد سلینڈرا کے حکمرانوں کا اقتدار کم ہوگیا، گو انھوں نے اپنی سلطنت کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی، مگر اس کے بعد جو خاندان حکمران ہوئے ان کے نام معاصر تاریخوں اور دستاویزوں میں نہیں ملتے، چینی مورخ ان کو پرانے نام ہی کے ساتھ یاد کرتے ہیں، لنکا کی تاریخوں میں جاوا کا اور زابج مترادف سمجھے جاتے ہیں، یہ سلطنت تین سو برس اور قائم رہی لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ اس مدت میں سلینڈرا ہی حکومت کرتے رہے، چینی کتاب چوفان چی میں ذکر ہے کہ تیرہویں صدی میں اس سلطنت میں سماترا اور ملایا شامل تھے، لنکا کی تاریخ کولاوانی سا سے معلوم ہوتا ہے، کہ تیرہویں صدی کے وسط میں جاوا کا کے بادشاہ کندرو بھانو نے لنکا پر دو حملے کئے، پہلے میں پورے لنکا پر قبضہ کر لیا، لیکن دوسرے میں مغلوب ہوا اور خزانہ اور اہل وعیال کو میدانِ جنگ میں چھوڑ کر فرار ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حملہ کی وجہ سے کندر بھانو کو جنوب کے پانڈیا حکمرانوں سے بھی لڑنا پڑا، ایک کتبہ مورخہ ۱۲۶۴ء سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جٹ ورمن ویرا پانڈیا نے ساویکے کے بادشاہ کو شکست دی، اس ساویکے سے جاویکا ہی مراد ہوگا، جاوا کے فرمانرواؤں نے اس سلطنت کے اختلال سے فائدہ اٹھایا، اس پر پے در پے حملے کئے، جس سے یہ عظیم الشان سلطنت جس کو ہندوستانیوں نے قائم کیا تھا چھ سو سال کے بعد نیست و نابود ہوگئی، اب سے پانچسو سال قبل یہ سلطنت ختم ہوئی اور اسکی یاد بھی بھلا دی گئی، لیکن جزیرہ جاوا کا جدید نام کالنکا اسکی شوکت کو تازہ کرتا ہے، اسکے علاوہ اس کے فرمانرواؤں نے جاوا کی

تہذیب اور تمدن پر اپنا نمایاں اثر چھوڑا ہے بعض تعمیری یادگارین بھی اب تک قائم ہین،

سیلنڈرا بودھ مذہب کے فرقہ مہایانہ کے پیرو تھے، جب ان کی حکومت قائم ہوئی، تو سماترا اور جاوا میں بودھ مذہب اور اس کے فلسفہ کی ترویج ہوئی، اوپر کہا جا چکا ہے کہ سیلنڈرا کے شاہی خاندان کا ایک پروہت بنگال سے آیا تھا چنانچہ اسی زمانہ میں تنتروں کے نظریات بھی پھیلے (تنترا سنسکرت کی مقدس کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر سحر و نیرنجات کا ذکر ہے) اور ان پر بعض کتابین بھی لکھی گئیں مثلاً سانگ ہیانگ کماہیانی کان شاید سیلنڈرا کے زمانہ ہی کی تصنیف ہے،

بودھ مذہب کی ترویج سے اس جزیرہ کے آرٹ پر بھی اثر پڑا، اور وہاں کا شہرۂ آفاق مندر بار بدار ہندی جاوی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے مندر ہیں، مثلاً کانڈی کالاسان، کانڈی ساری، کانڈی منڈت اور کانڈی پاوان، جو اسی مخلوط آرٹ کے مظاہر ہیں تعمیرات اور سنگ تراشی کے بعض نمونے تو ہندوستان سے زیادہ بہتر ہین،

اس سلطنت کے شروع عہد کے جو کتبے پائے گئے ہیں، ان کے حروف تہجی تو بالکل ہندوستانی ہین لیکن رفتہ رفتہ یہ بالکل مختلف ہو گئے اسی طرح یہاں کے آرٹ کے بعض نمونے اپنی ہیئت ساخت اور فن مین بالکل ہندوستانی ہیں چنانچہ ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کے آرٹ کا ہر نمونہ وہاں ملیگا لیکن گیارہویں اور بارہویں صدی سے وہاں کے ملکی اثرات کا استیلا شروع ہو گیا یہانتک کہ وہاں کا آرٹ خالصۃً دیسی ہو گیا، اسکے اسباب تلاش کرنیکی ضرورت نہیں، ہندوستانی جب بلا یا پہنچے تو اپنی تہذیب اور تمدن سے یہاں کے ملکی باشندوں کو متاثر کرتے رہے اور یہ اثرات اسوقت تک قائم رہے جبتک کہ ہندوستان سے ہندوستانیوں کی آمد جاری رہی لیکن یہ آمد آخر بند ہو گئی اور رفتہ رفتہ ہندوستانی یہاں کے ملکی باشندوں سے اس طرح گھل مل گئے کہ انکی قومیت اور اصلیت کا بھی پتہ چلانا مشکل ہو گیا اسوقت وہاں ڈچ حکمراں ہیں، سیلنڈرا کی طرح انکی حکومت بھی ختم ہو گئی، تو وہ شکر اور ربڑ کی کاشت کی یاد کے سوا کچھ اور نہ چھوڑ جائیں گے لیکن بار بدر اور دوسری سیکڑوں یادگارین ہزاروں برس تک سیلنڈرا کی یاد تازہ کرنے کے لئے کافی ہیں"

ص ع

اخبار علمیہ

اسپرنٹو کی تجدید کی کوشش

اسپرنٹو ایک مصنوعی بین الاقوامی زبان کا نام ہے، جسکو پولینڈ کے ایک ماہر طب لے زاروڈوڈوی کوزینخوف نے ۱۸۸۷ء میں ایجاد کیا تھا، اس کے وطن میں روسی، پولش، جرمن اور یہودی آباد تھے جو الگ الگ زبانیں بولا کرتے تھے، مختلف بولیوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے زینخوف نے اس مشترکہ زبان کو اختراع کیا، اس میں اس نے یورپ کی مختلف زبانون کے الفاظ کے مادوں سے الفاظ بنائے، مگر اس میں مادون کی تعداد کم سے کم رکھی ہے، اسکے لغت میں کل ۲۶۴۲ مادے ہیں، اسی طرح صرف و نحو کے کل سولہ قاعدے ہیں،

ابتدا میں یہ زبان تجارت اور بین الاقوامی سیاست کے لئے مفید سمجھی گئی تھی، چنانچہ ۱۹۰۸ء تک یورپ کے مختلف حصوں میں استعمال ہونے لگی تھی، لیکن اساسی انگریزی (Basic English) کی ترویج اور مقبولیت کی وجہ سے یہ زیادہ پھیل نہ سکی، پھر بھی یورپ کے مختلف حصوں میں اس کے بولنے والون کی تعداد پندرہ لاکھ ہے، ہالینڈ اور سویڈن میں یہ زبان کثرت سے مستعمل ہے، اب تک اس میں چار ہزار کتابیں اور رسالے نکل چکے ہین، سویڈن سے تو اس زبان میں ایک رسالہ بھی برابر نکل رہا ہے، اور وہان اسکے حامیوں کی تعداد بھی کافی ہے، ابھی چند مہینے ہوئے، کہ لندن میں اسپرنٹو کی بین الاقوامی لیگ کا ایک جلسہ ہوا جس میں چالیس

مختلف قومیتوں کے چودہ سو نمائندے شریک ہوئے تھے، گذشتہ چار سال سے یہ زبان بہت زیادہ خطرہ میں آگئی ہے، چنانچہ مذکورہ بالا جلسہ کا انعقاد اسی غرض سے ہوا تھا، کہ اس زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے، اس جلسہ کی منجملہ اور تجاویز کے ایک تجویز یہ ہے کہ لندن اور اس کے مضافات میں اس زبان کے مدارس شبینہ جاری کئے جائیں، اور فرانس کے تمام سرکاری مدارس میں اس کی تعلیم دیجائے، معلوم نہیں اس قسم کی کوششیں اسکی اشاعت کے لئے کہاں تک مفید اور بارآور ثابت ہوں گی،

نفس اجتماعی کا ایک نیا نظریہ

جب کسی جہاز میں آگ لگ جاتی ہے، تو اس کے سب مسافر دریا میں کود پڑتے ہیں، کسی کارخانے میں ہڑتال ہوتی ہے، تو ہڑتالی پولیس پر حملہ کر بیٹھتے ہیں، ان کی موٹروں کو الٹ دیتے ہیں، ایک مجمع میں کچھ لڑکے چیختے ہیں، تو سب چلا اٹھتے ہیں، کیوں؟ ماہرین نفسیات اس کا سبب نفس اجتماعی بتاتے ہیں، اسکی خصوصیت یہ ہے کہ ایک فرد کے کردار سے دوسرا ضرور متاثر ہو جاتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ جماعت کے اندر ایک فرد کچھ کرے، اور دوسرا اسکی تقلید نہ کرے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے جرمن ماہرین مابعد الطبیعیات نے اسکی وجہ نفس اجتماعی ہی قرار دی ہے، مگر جرمنی کے سیاسی مدبروں نے اسکو قابل قبول نہیں سمجھا، ولیم میکڈوگل نفس اجتماعی ہی کا حامی ہے، مگر بعض عمرانی ماہرین نفسیات بھی نفس اجتماعی کو سائنٹفک اصول کی بنا پر غلط اور لغو قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے، کہ ایک جماعت یا مجمع میں ہر فرد کا کردار بالکل الگ اور مختلف ہوتا ہے، اپنی نئی کتاب "کردار اجتماع" میں اسٹینفورڈ یونیورسٹی کا عمرانیات کا استاد ڈاکٹر رچرڈ ٹراسی لاپیرے مذکورہ بالا دونوں نظریوں کو صحیح نہیں سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ افراد کے کردار اور معاشرتی تفاعل کے نمونے مختلف ہوتے ہیں، لیکن اجتماع کے کردار کے لئے موخر الذکر کو قابل غور قرار دینا چاہئے،

اسی لئے وہ کردار اجتماع کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے، مثلاً اداری، تقلیدی، فوجی، رسمی (جس میں شادی، غم، فوجی تنظیم اور چال چلن شامل ہیں) تفریحی، سیاسی، معاشی، قانونی وغیرہ، اسی طرح اس نے ایسے کردار کی بھی تقسیم کی ہے، جو دہشت زندی تعصب اور سرکشی سے پیدا ہوتے ہیں، اس تقسیم کے بعد ڈاکٹر مذکور ان کی اصلیت نوعیت اور فعلیت پر بحث کرتا ہے، اور ان میں شرکت کرنے والوں اور ان کی تخیل پرستی (Ideology) کی تشریح کرتا ہے،

ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ تخیل پرستی ہی کردار کا اصلی سبب ہوتی ہے اس لئے کسی اجتماع کے افعال بھی افراد کے منفرد خیالات کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں،

سرطان کا علاج

سرطان کا زخم لا علاج سمجھا جاتا ہے لیکن امریکہ کی ییل یونیورسٹی میں کچھ ایسے تجربے ہوئے ہیں، کہ اس مایوسی میں کچھ امید پیدا ہو چلی ہے، وہاں کے ایک ماہر حیاتیات نے سرطان میں مبتلا چوہوں کو ونٹر گرین (winter green) کا تیل پلایا، اس سے اس کا مرض جاتا رہا، اس تیل کے اجزا میں الڈی ہائڈ (یہ ایک بے رنگ، طیران پذیر مائع ہے جو الکحل پر آکسیجن کے اثر سے پیدا ہوتا ہے) یہ سرطان کے ورم کو دور کرنے میں مفید ثابت ہوا ہے، وہاں کے دوسرے ماہرین فن نے بھی اس کا تجربہ شروع کر دیا ہے، انھوں نے الڈی ہائڈ کے انجکشن دس ایسے کتوں کو دیئے جو سرطان میں مبتلا تھے، تو کتوں کا مرض جاتا رہا، عضویاتی طور پر انسان اور کتے ملتے جلتے ہیں، اس لئے یہ تجربہ انسان کے سرطان میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ابھی غیر ماہرین اس سے تجربہ نہ کریں، جب تک اس تیل کے اجزائے ترکیبی اور اس کے اثرات کی کافی تحقیق نہ ہو جائے، کسی قطعی نتیجہ پر پہونچنا قبل از وقت اور مضرت رساں ہے،

"س ع"

مطبوعات جدیدہ

رسالہ دینیات حصہ دہم مرتبہ مولینا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت ۹ر، پتہ:۔ دفتر ترجمان القرآن ترز دپٹھان کوٹ پنجاب

حیدرآباد کی مجلس نصاب کتب نے طلبہ کے لئے دینیات کا جو مفید سلسلہ تالیف کرایا ہے، یہ اس کا دسواں حصہ ہے، یوں تو دینیات کے متعدد سلسلے ہیں، جو مذہبی معلومات کے لئے کافی ہیں لیکن ضرورت اسکی تھی، کہ اسلامی عقائد وتعلیمات کو جدید مذاق کے مطابق اس انداز میں پیش کیا جائے کہ ہماری نئی نسلوں کے دلوں میں بھی گھر کرسکیں، اس رسالہ میں اس کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، اور اسلام ایمان، اطاعت، نبوت، اسکی حقیقت و ضرورت، نبوت محمدی، ایمان مفصل کے تمام اجزاء، عبادت کی حقیقت، اسلامی عبادات، دین وشریعت، اس کے احکام واصول حقوق اللہ، اور حقوق العباد وغیرہ اسلام کے تمام ضروری عقائد وتعلیمات کو ایسے دلنشیں طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، اور اس کے مصالح اور حکمتوں کی ایسی دلپذیر تشریح کی گئی ہے کہ مذہب کو محض عقل کی میزان میں تولنے والا بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا، اور ٹھیٹھ عقیدہ کا دامن بھی کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، یہ رسالہ اگرچہ مسلمان طلبہ کے لئے لکھا گیا ہے، لیکن طلبہ اور غیر طلبہ اور مسلم اور غیر مسلم سب کے مطالعہ کے لائق ہے،

توضیح الکلام، مؤلفہ جناب ابوعبیدہ نظام الدین صاحب بی اے سائنس ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول کوہاٹ، تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت عہ علاوہ محصولڈاک، غالباً مصنف سے ملیگی،

قادیانیوں کے گمان میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے ثبوت کا دار و مدار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ثبوت پر ہے، اس لئے قادیانیوں اور اہل سنت کے مناظروں میں یہ ایک معرکۃ الآرا بحث بن گیا ہے، اور اس پر معلوم نہیں کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں مؤلف نے حیاتِ مسیح پر انجیل، کلام اللہ، احادیث نبویؐ، اقوالِ صحابہؓ، اور اقوالِ ائمہ مفسرین سے سیکڑوں ثبوت اسناد اور دلائل پیش کئے ہیں، آخر میں خود مرزا صاحب اور متعدد قادیانی اکابر کے اقوال سے بھی اس کا ثبوت مہیا کیا ہے، اس بحث میں ان اقوال و اسناد کے علاوہ اور بہت سی مفید علمی بحثیں آگئی ہیں، اس قسم کے مباحث و دلائل، مناظرہ کی بہت سی کتابوں میں ہیں جناب ابوعبیدہ صاحب کی یہ محنت لائق تعریف ہے، کہ انھوں نے ان سب کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، ان کی کثرت کا اندازہ کتاب کی ضخامت سے ہو سکتا ہے، کہ صرف ایک بحث پر ساڑھے تین سو صفحے صرف کئے گئے ہیں، مناظرہ سے ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب میں کافی معلومات ہیں، چند شرائط کے ساتھ اس کتاب کے جواب لکھنے والے کو ایک ہزار انعام کا بھی اعلان ہے، اور یہ بھی قادیانی طریقۂ استدلال کا گران قیمت جواب ہے،

یادگارِ سلف، مؤلفہ جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:- مصنف مدرسۃ الاصلاح سرائیر ضلع اعظم گڈھ سے ملیگی،

حضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد امجاد میں مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی حال کے ایک صاحبِ علم و عمل اور جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، اتباع سنت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا طغرائے امتیاز تھا، ان کے ایک مخلص مرید مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی نے "یادگار سلف" کے نام سے ان کی سیرت تالیف فرمائی ہے، اس میں حضرت سید صاحب کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، علمی کمالات، درس و تدریس، مواعظ و نصائح، بیعت و ارشاد، اتباع سنت، انکار بدعت،

تصانیف اور اخلاق و شمائل کے حالات ہیں، اور اخلاق و شمائل کو مذہبی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اس لئے یہ کتاب سوانح کے ساتھ مذہبی زندگی کا لائحہ عمل بن گئی ہے، اور اس میں بہت سے مفید مذہبی معلومات آگئے ہیں، باصفا مرید کی عقیدت و شیفتگی کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے، امید ہے کہ یہ مفید کتاب سید صاحب کے مریدوں میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ مقبول ہوگی،

دلی کی دوسو برس کی تاریخ } مؤلفہ مولوی سید حسن صاحب برنی، ایم اے ایل ایل بی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۵۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی،

سید حسن صاحب برنی تیمور کے حملہ سے قبل کی دلی کے آثار و تمدن کی ایک مبسوط تاریخ لکھ رہے ہیں، اس کے بعض ابواب کا خلاصہ انھوں نے جامعہ میں بطور مقالہ پڑھا تھا، جسے مکتبہ جامعہ نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، برنی صاحب نے مقالہ کے شروع میں خود لکھ دیا ہے، کہ "اس مختصر مقالہ میں دوسو برس کی ابتدائی تاریخ کا احاطہ ناممکن ہے، اور اس کے تمام شواہد و اسناد کا حوالہ اور ان کی جانچ پرتال دشوار ہے، اس لئے اس میں صرف طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے" اس لئے علمی نقطۂ نظر سے اس ناتمام ٹکڑے پر تنقید قبل از وقت ہے، اصل کتاب کی اشاعت کے بعد اس کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے، بہرحال یہ مختصر رسالہ بھی مفید معلومات سے خالی نہیں ہے، اس میں دلی کی پرانی تاریخ اس کے آثار، ہندوستانی اور اسلامی طرز تعمیر کی خصوصیات اور ان سے ایک دوسرے کا استفادہ، پرانی تاریخوں اور سفرناموں سے دلی کی مٹی ہوئی عمارتوں اور تیمور سے پہلے کے موجودہ آثار کا سرسری ذکر ہے،

سبد چین شائع کردہ جناب مالک رام صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۶ر، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

مرزا غالب نے اپنے فارسی کلیات کی اشاعت کے بعد "سبد چین" کے نام سے اپنے اس کلام کا ایک مختصر مجموعہ شائع کیا تھا، جو کلیات میں اشاعت سے رہ گیا تھا، یا اسکی اشاعت کے بعد کہا گیا تھا، ان کی وفات کے بعد کلیات کے جتنے اڈیشن چھپے ان میں سے کسی میں یہ مجموعہ شامل نہ ہو سکا اور اب یہ قریب قریب نایاب ہے، جناب مالک رام صاحب ایم اے نے جنکو غالب اور کلام غالب سے خاص دلچسپی ہے، اس گوہر نایاب کو مولینا حبیب الرحمن خان شیروانی کے "گنج گرانمایہ" سے حاصل کر کے شائع کیا تھا، جو بہت جلد فروخت ہو گیا، یہ اس کا دوسرا اڈیشن ہے، اس میں "۴ قصائد" "ایک ترکیب بند" ایک ترجیع بند ایک چند شعری مثنوی "پچاس قطعات" "ایک نظم" "۱ غزلین" "۲۰ رباعیات" اور کچھ متفرق اشعار ہیں، غالب کے فارسی کلام کے قدردانوں کے لئے یہ قابل قدر تحفہ ہے۔

ڈائنگ ٹیچر

مؤلفہ ماسٹر محمد عروج حسین صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت عہ پتہ: منیر آباد، حیدر آباد دکن

رنگ سازی ہمیشہ سے فن رہی ہے اب اس نے اور ترقی کر کے علمی فن کی حیثیت حاصل کر لی ہے، دوسری زبانوں میں اس پر مستقل کتابیں ہیں، ماسٹر محمد عروج حسین صاحب ڈائنگ ماسٹر مصنوعات ملکی سرکار عالی نے جنھیں اس فن کا علمی وعملی تجربہ ہے، اس فن پر یہ مفید کتاب تالیف کی ہے، اس میں مختلف قسموں کے رنگ، ان کی ترکیب اوزان اونی سوتی ریشمی کپڑوں کے عام اور خاص رنگ ان کے رنگنے کے اصول وطریقے، وغیرہ رنگ سازی کا پورا نصاب نہایت بسط وشرح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، آخر میں خاص خاص رنگوں کے نسخے، اور ان کے ملنے کے پتے بھی درج کر دیئے گئے ہیں کتاب پیشہ ور رنگ سازوں اور عورتوں کے لئے نہایت کارآمد ہے۔

"م"

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۷

نومبر سنہ ۱۹۳۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

شذرات

علمی حلقوں میں یہ خبر غم و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جھنڈا ضلع حیدرآباد سندھ کے مشہور عالم پیر احسان اللہ شاہ صاحب جو قلمی کتابوں کے بڑے عاشق تھے چوالیس برس کی عمر میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اس دنیا سے چل بسے، مرحوم حدیث و رجال کے بڑے عالم تھے، اور ان کے کتبخانہ میں حدیث و تفسیر و رجال کی نایاب قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب مصر و شام و عرب و قسطنطنیہ کے کتبخانوں میں ان کے کاتب اور ناسخ نئی قلمی کتابوں کی نقل پر مامور رہتے تھے، مرحوم ایک خانقاہ کے سجادہ نشین، اور طریق سلف کے متبع، اور علم و عمل دونوں میں ممتاز تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنے انوار رحمت کی بارش فرمائے،

مدراس عمرآباد میں حاجی عمر (روشن کمپنی) کا خاندان ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، حاجی صاحب امرتسر کے علمائے غزنویہ کے فیض سے مستفیض، اور توحید و سنت کے متبع تھے، کامیاب تاجر تھے، اپنے ہی نام سے شمالی ارکاٹ میں ایک زمین خرید کر عمرآباد نام ایک مقام آباد کیا تھا اور وہاں ایک بڑے عربی مدرسہ دارالسلام کی بنیاد رکھی تھی، چند سال ہوئے کہ انھوں نے وفات پائی اور تین صالح اولاد اپنی یادگار چھوڑیں، اسمٰعیل، ابراہیم اور اسحاق، سب سے بڑے اسمٰعیل تو کاروبار کے نگران ہیں، اور ابراہیم نے جو منجھلے تھے مدرسہ کی دیکھ بھال اس کے قیام و ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا، ابھی پچھلے سال جوہری طنطاوی کی تفسیر کا اردو ترجمہ ایک ہزار روپیہ کے صرف سے مطبع معارف میں چھپوایا تھا، مدرسہ کے لئے کتب خانہ تنہا اپنی ذات سے کتابیں خرید کر فراہم کیا تھا، اس کے لئے ایک

عمارت بھی بنوائی تھی، افسوس کہ یہ پھول کھلنے سے پہلے مرجھا گیا، یعنی ۳۰ رجب ۱۳۵۵ھ کو اس دنیائے ناپائدار کو الوداع کہا، رحمہ اللہ تعالیٰ،

ہمارے عربی مدرسوں کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی جاتی ہے، ہمارے نئے تعلیم یافتوں کے پاس اول تو اپنے اسرافات سے کچھ بچتا نہیں، دوسرے وہ ان مدرسون کی ضرورت کے قائل بھی نہیں، ابتک سہارا اسلامی ریاستوں کا تھا تو وہاں اب ایک تو ملکی وغیر ملکی کا سوال پیدا ہوگیا ہے، دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کی شورش سے وہاں کے ارباب اقتدار اتنے سہمے ہیں کہ دین ومذہب اور اسلام کے نام سے کوئی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، ان مدرسوں کا سب سے بڑا سہارا مسلمان تاجر تھے، مگر برا ہو نشلزم کا برا ہو کہ اس نے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اب ہر جگہ یہ سوال ہے کہ صوبہ سے باہر کیوں دیا جائے، رہ گئے عوام وہ دیتے ہیں، اور دے سکتے ہیں، مگر ان سے آنہ آنہ جمع کرنا خود ایک مستقل کام ہے، حکومتِ وقت اول تو دینے ہی سے رہی، اور جسکو دیتی بھی ہے اس سے پوچھئے کہ وہ کس طرح لے رہا ہے، یہ ہے اس قوم کے عربی و مذہبی مدرسون کا حال جو اپنے دین و ملت اور اسلامی تہذیب و تمدن اور کلچر کی تباہی کے درد سے بیتاب ہو،

ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ ان مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے کل جب ہندوستان کی دوسری شکل ہوگی اس سے بہت بڑھکر اُن کی ضرورت ہوگی، وہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد اور مرکز ہونگے، لوگ آج کی طرح کل بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور ارباب اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہونگے اور یہی دیوانے ملا آج کی طرح کل بھی ہشیار ہونگے اور رہینگے، اس لئے یہ مدرسے جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں ان کو سنبھالنا اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے،

ان عربی مدرسون کا اگر کوئی دوسرا فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے، کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں، اوران سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اونچا ہوتا ہے، اوراسکی اگلی نسلیں کچھ اوراونچی ہوتی ہیں، اوریہی سلسلہ جاری رہتا ہے، غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی،

ان مدرسوں کے نقائص سے بھی واقفیت ہے، لیکن ان نقائص سے انکار ان مدرسوں کے چلانے والوں کو بھی نہ رہا، وہ پرانا ڈھچر بدلنا بھی چاہتے ہیں، مگراس کے لئے خرچ اور مصارف ہیں، جن کا سامان ہماری بے توجہی سے نہیں ہوتا، بڑے عربی مدرسون میں سائنس پڑھانے کے لئے سب تیار ہیں، مگرکئی ہزار کا سامان اورسوسوا سو کا سائنس ماسٹر کہاں سے آئے، اوردوسرے تغیرات کے لئے بھی احساس ہے، مگر قوم کی بے حسی کا رونا ہر جگہ ہے،

نصاب کی اصلاح کا خیال بھی عربی مدرسوں میں اب عام ہے، ضروری اورغیرضروری علوم پر بھی نظر ہے، تنقید کے شوروغل سے پرانے علوم کی طرف سے توجہ تو ہٹ گئی مگر نئے علوم کا سامان نہ ہوسکا، غرض یہ بھی گیا وہ بھی گیا، اب قدیم منطق وفلسفہ اورقدیم ہیئت و ریاضیات کا شوق نہیں رہا، اورنئی منطق، نیا فلسفہ، نئی ہیئت، اورنئے ریاضیات و طبعیات کی تعلیم بھی نہ دی جاسکی، نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارا مولوی اُن سے بھی عاری نکل رہا ہے اوران سے بھی! مگرکیون؟

مقالات

سیرت سیّد رشید رضاؒ

از

مولینا مسعود عالم ندوی کٹیلاگر اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ، سابق مدیر الضیاء

سیّد جمال الدین افغانی کے عقیدت کیش محمد عبدہ کے قوت بازو، گذشتہ پنجاہ سالہ اسلامی تحریکوں کے سرگرم حامی، قرآن کریم کی تفسیر اور بیسیوں کتابوں کے مصنف و مؤلف، عربی کے بے مثل انشا پرداز اور خطیب اسلامی دنیا، امام سیّد رشید رضا کو مختلف حیثیتوں سے جانتی ہے، ان کے کاناموں سے واقف ہے، عصر حاضر کے گنے چنے مصلحین امت میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن کم ہیں، جو ان کی ابتدائی زاہدانہ زندگی، علمی جلالت قدر اور سیاسی عظمت کا صحیح علم رکھتے ہیں، اور ان کی بے نفسی انسانیت اخلاص، مروّت اور قابل رشک خاکساری کا صحیح تصور بھی کر سکتے ہیں،

اسلامی ہند کے اہل علم سید رشید رضا مرحوم کو ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کے صدر اور مفسر قرآن کی حیثیت سے ضرور جانتے ہیں، اور ان کی قدر کرتے ہیں لیکن عربی زبان وادب کی کساد بازاری کے باعث ان کی ادبی منزلت کا صحیح اندازہ یہاں نہیں ہو سکتا تھا، حجاز کی موتمر اسلامی کے باعث ان کا سیاسی کردار بھی اب تک صحیح رنگ میں نہیں پیش ہو سکا ہے، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں

۱؎ "السید رشید رضا او اخاء اربعین سنۃ" مولفہ امیر البیان حضرت علامہ امیر شکیب ارسلان مدظلہ تقطیع متوسط کاغذ اعلیٰ طباعت نفیس حجم ۴۳۲ صفحے، مطبع ابن زیدون دمشق شائع شدہ ۱۳۵۶ھ قیمت درج نہیں،

ہین عقیدتمندون اوران کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والون کی کمی نہین لیکن ان کی وفات پرجس سردمہری کے ساتھ ماتم ہوا، اس سے یہ خوف ہوتا تھا، کہ شاید ملت اسلامیہ اب تک اپنے محسنون کو پہچاننے کے قابل بھی نہین ہوسکی ہے، مصر، جہان آئے دن لیڈرون اور شاعرون کی برسی (خلات التابین) منائی جاتی ہے، وہان اس جلیل القدر امام کی یادگارمین ایک آدھ اچھا خاصہ جلسہ بھی نہین ہوسکا شوقی اورحافظ کی قبرون پرقصیدے پڑھے جاتے ہین، عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہین، حفلات التابین مین دورا ورنزدیک تمام عربی علاقون کے نمایندے آکرشریک ہوتے ہین، اوران کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ادبی جشن (مہرجان) منائے جاتے ہین، لیکن کتاب وسنت کے خادم کی قسمت مین سردمہری اورتغافل کے سوا کچھ نہ تھا، شاید یہ بھی قدرت کا امتحان ہو، جب مصرکا یہ حال ہے تو پھر ہندوستان اوردوسرے دور دراز کے خطون کا گلہ کیون کیا جائے، ؟

امام سید رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲ ر جمادی الاولی ۱۳۵۴ھ شام کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا فوری طور پرمعمولی سا ماتم ہوا، المنار کے بقا اور اجرا کی کوششیں ہوئین، عربی ممالک کی روش کے مطابق حفلۂ تابین کا اعلان ہوا، پھرخاموشی اورسکوت! اہل مصر کی سیاسی مصروفیتین اس قدر بڑھی ہوئی ہین کہ کسی ٹھوس اورسنجیدہ علمی کام کی طرف توجہ کرنیکی شاید انھین زیادہ فرصت نہین، اسی طرح دو تین سال گذر گئے، خیال تھا، کہ اب امت کے دلوں سے مرحوم کی یاد فراموش ہوچکی،

ان حالات مین اگرامام مرحوم کے کارنامون کو زندہ رکھنے، اوران کی زندگی کو اجاگر کرنے کی جو کوشش کی جائے، وہ مستحق صد آفرین وستایش ہے، سید رشید رضا مرحوم اس لحاظ سے یقینی خوش نصیب ہین کہ ان کی سوانح نگاری کے لئے مشرق کے قائد اعظم عربی کے معجز نگار انشا پرداز اوردنیاے اسلام کے جلیل القدر مصلح کا انتخاب عمل مین آیا، دیر آید درست آید سنا کرتے تھے اس موقعہ پر یہ مقولہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا، سوانح نگار امیر البیان امیر شکیب ارسلان اسلامی دنیا مین تعارف سے بے نیاز ہین، جو قلم

بچپن سال سے مسلسل اسلام اور مسلمانون کی خدمت مین مصروف عمل ہو، جس ہمہ گیر شخصیت نے طرابلس کے میدان جہاد میں اپنے صاحب سیف و قلم ہونے کی دھاک بٹھا دی ہو، جو بیس سال سے مجلس اقوام کے مرکز مین بین الاقوامی سیاسیات کی گتھیان سلجھا رہا ہو، اس کی منقبت اس ہیچ میرز کے بس سے باہر ہے، اور اگر کوشش بھی کیجائے، تو یہ مختصر صحبت کافی نہین ہوسکتی،

امام سید رشید رضا مرحوم کی سیرت اس پر امیر البیان کا گہر بار قلم، ان دونون حیثیتون سے "السید رشید رضا، او اخاء اربعین سنۃ" کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، مصنف اور صاحب سیرت، دونون اس عہد کے چند ممتاز افراد مین ہین، اسلامی دنیا مین تو بلا شک و شبہہ یہ دونون شخصیتین سب پر بھاری ہین، عربی سیاسیات مین بھی دونون کا مرتبہ بہت بلند ہے، عربی ادب مین اگر امیر البیان اسٹرسال کے بادشاہ ہین، تو سید رشید کا زور قلم بھی اپنی نظیر نہین پیش کرسکتا، علوم مین اگر مرحوم قرآن کریم، حدیث، رجال، فقہ، بلاغت، اور تمام دینی علوم کے امام تھے، تو تاریخ جغرافیہ بین الاقوامی سیاسیات، ادب، و شعر، لغت مین امیر البیان کا پلہ بھاری ہے، سیاسیات اور عملی دنیا مین دونون کا طریقہ نظر و فکر تقریباً ایک رہا ہے، دونون سید جمال الدین کے خوشہ چین تھے، دونون کو شیخ محمد عبدہ کی شاگردی پر فخر رہا، وحدت اسلامیہ، اتحاد عرب، اور نئی مخالف اسلام تحریکون کی دشمنی مین بھی دونون ہم خیال تھے، اگر کچھ اختلاف تھا، تو ترکون کے مسئلہ مین، وہ بھی آخری انقلاب اور نوبہ نو تبدیلیون کے بعد کمالی حکومت کے بارے مین دونون کی رائیں ایک حد تک متحد ہو چکی تھین،

کتاب کا اجمالی خاکہ | یہ کتاب ظاہر مین صرف سید رشید مرحوم کی سیرت اور حالات کا مجموعہ ہے، لیکن قدرتی طور پر اس کے دامن میں گذشتہ چالیس سالہ تحریکین سمٹ آئی ہین، سینکڑون ادبی و لغوی بحثین مختلف علمی و دینی نکتے دوران تحریر مین آگئے ہین، کتاب کا آغاز مؤلف کے ایک مختصر مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں ضرورت تالیف اور صاحب سیرت کے کارنامون اور تالیفات کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہی

مقدمہ کے بعد مؤلف نے (ماقلتہ عن السید رشید فی حیاتہ) کے عنوان سے اپنی وہ تحریر نقل کی ہے، جو اس نے صاحب سیرت کے متعلق ان کی زندگی ہی میں (۱۳۳۲ھ) سپرد قلم کی تھی، اس ٹکڑے سے امیر کی فراخ دلی اور مردم شناسی کا پتہ چلتا ہے، اسلامی ہند میں جہاں بڑوں کا ادب اور علم و فضل کا اعتراف اب مفقود ہو رہا ہے، شاید یہ سطریں دلچسپی سے پڑھی جائیں،

"........ المنار کی جلدیں صحیح معنوں میں اسلامی علوم کی انسائیکلوپیڈیا کہی جا سکتی ہیں، جن سے اس عہد میں کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسی طرح ان کی تفسیر جس کے ذریعہ قدرت نے اپنے اسرار و حقائق کی گرہ کشائی کا کام لیا ہے، ان کا بے مثال کارنامہ ہے جس نے انہیں مشاہیر ائمہ اسلام کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے، اسی طرح دفاع اسلام، صحیح عقائد کی تبلیغ، ملاحدہ اور غیر مسلمین کے اعتراضات کی تردید اور ان کی دوسری خدمات ایسی ہیں جن کی گرد کو اس زمانہ کا کوئی عالم نہیں پہنچ سکتا، اور نہ اس بلند مقام تک پہونچنے کا کوئی تصور کر سکتا ہے........ ہماری اس توصیف میں کوئی مبالغہ نہیں، اور نہ اس کا یہ کوئی موقع ہے، ہمارا مسلک یہ ہے، کہ کسی کی حق تلفی نہ کریں، اور یہی حکم خداوندی ہے، اور نہ ہمارے نزدیک معاصرت قدرشناسی میں حارج ہے، بلکہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ لوگوں کی خوبیاں، زندگی و موت ہر حال میں ایک کسوٹی پر پرکھی جائیں" (صفحہ ۱۶-۱۷)

اس کے بعد السید رشید رضا کا ترجمہ نفسہ" کے عنوان سے مرحوم کی خود نوشت سوانحعمری ہے جو تقریباً سوا سو (۲۰-۱۴۴) صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، یہ پوری آپ بیتی المنار و الازہر میں شائع ہو چکی ہے، جا بجا امیر کے حواشی ہیں، جن سے اشارات اور تلمیحات کی توضیح ہوتی گئی ہے، امیر البیان کے

ملاحظہ ہو حاضر العالم الاسلامی طبع جدید، جلد اول صفحہ ۲۸۳، صفحہ ۲۸۶، ۲۹۲ طوالت کے خوف سے اصل عربی نہیں دی گئی، ترجمہ میں حتی المقدور اصل سے مطابقت کی پوری کوشش کی گئی ہے،

حواشی کے بعد یہ آپ بیتی بالکل ایک نئی چیز ہوگئی ہے، اور گذشتہ نصف صدی کے بعض اسرار اور علماً کی باہمی کشاکش نیز بعض سیاسی معاملات اس نئے آئینہ مین کچھ اور نظر آتے ہین ہم آیندہ صفحات مین مرحوم کی آپ بیتی کا خلاصہ درج کرین گے،

خود نوشت سوانح حیات کے بعد تاریخ علاقتی مع السید رشید رحمہ اللہ (ص ۱۴۴، ص ۱۶۵) کے تحت مؤلف نے اپنے اور مرحوم کے تعلقات کا محبت آمیز انداز مین تذکرہ کیا ہے، اس سلسلہ میں ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء سے ۱۳۵۴ھ تک کے مختلف بھولے ہوئے تذکرے، بیروت میں شیخ محمد عبدہ کی مجلسین سید جمال الدینؒ سے مرحوم کی عقیدت، سفر مصر کا قصد، اور بیسیوں ایسی چیزین اس ضمن مین آگئی ہین، جو اگر امیر البیان کے قلم پر نہ آ جاتیں، تو تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل کو ان کا علم بھی نہ ہوتا،

مؤلف اور مرحوم کے تعلقات کی تفصیل کے بعد ایک فصل میں مرحوم اور شیخ محمد عبدہ کے تعلقات پر گفتگو کی گئی ہے، کتاب کا یہ حصہ (۱۶۶-۱۸۰) مرحوم کی مشہور تالیف تاریخ الاستاذ الامام جلد اول سے ماخوذ ہے،

کتاب کا نام ہی "اخاء اربعین سنۃ" ہے، اس چہل سالہ دوستی کی مناسبت سے وہ تمام مقالات تبصرے اور سفر کی روداد ین کتاب میں درج کردی گئی ہین، جو المنار مین مرحوم یا امیر البیان کے قلم سے شائع ہوئی تھین، اور ان کا ان دونون کی زندگیوں سے کوئی تعلق تھا، یہ حصہ تقریباً ستر صفحات (۱۸۱-۲۵۱) پر مشتمل ہے، اس میں حسب ذیل مضامین آسکے ہین،

۱- اداء الامیر شکیب لفریضۃ الحج، امیر البیان ۱۳۴۸ھ مین زیارتِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اس سلسلہ مین سید رشید مرحوم نے المنار، صفر ۱۳۴۹ھ مین ایک مفید اور دلنواز شذرہ لکھا تھا،

۲- وفد الصلح والسلام ۱۳۵۳ھ مین امام یحیٰی اور سلطان ابن سعود کے درمیان صلح

امن کا پیام لے کر جو وفد گیا تھا، اس کے ایک رکن امیر شکیب بھی تھے اس مضمون مین انکی کوششون کا ذکر ہے،

۳۔ کوارث سوریۃ فی سنوات الحرب، جنگ عظیم کے دوران مین عربی ممالک کی سیاست عجب ڈانواں ڈول تھی، سید رشید مرحوم عربی تحریک کے قائد تھے اور امیر ترکوں کے حامی اس خیال اور نقطۂ نظر کے اختلاف سے تعلقات مین بھی کشیدگی آگئی تھی، امیر شکیب پر عرب غداری کا الزام لگاتے اور امیر دلیتعلق بناہ بعد حین پڑھتے تھے آخر جنگ کا مطلع صاف ہوا، اور آمیر کی سیاست پختہ اور صحیح ثابت ہوئی، دوران جنگ مین امیر پر جمال پاشا سفاح کی پاسداری کا الزام بھی لگایا گیا تھا۔ حالات سازگار ہونے کے بعد امیر البیان نے ایک سلسلۂ مضامین مین ان الزامات کی تردید کی، سید رشید رضا پر اسکا اثر ہوا، یہ پورا سلسلہ المنار ۱۳۴۶ھ مین شائع ہوا، ابتدا مین مرحوم کے قلم سے ایک زبردست تائیدی شذرہ بھی تھا، جو مرحوم کی سچائی اور قبول حق کا شاہد ہے، "دوران جنگ مین شام کے حوادث" اس سلسلہ مضامین کی سرخی تھی، اس کتاب میں اسی عنوان سے مرحوم کا تائیدی نوٹ درج کیا گیا ہے، جو بارہ صفحات (ص ۱۹۴-۲۰۵) پر مشتمل ہے،

۴۔ الرحلۃ الاوربیۃ، سید رشید رضا شامیؒ کانفرنس کی شرکت کے خیال سے جنیوا تشریف لے گئے تھے، اس سلسلہ مین امیر البیان کے ساتھ یورپ کے دوسرے ملکون کی سیاحت بھی کی تھی، المنار مین الرحلۃ الاوربیہ کے عنوان سے روداد سفر شائع ہوئی تھی، اس مین زیادہ تر ماہرین سیاست کی ملاقاتون کا ذکر ہے، اور اسلامی ملکون کی سیاست پر کافی بحث کی گئی ہے،

۵۔ تابین السید رشید لاخی نسیب امیر شکیب ارسلان کے بھائی، امیر نسیب ارسلان بھی عربی کے ایک قادر الکلام شاعر اور خطیب تھے، انجمن اتحاد و ترقی کی شاخ (بیروت) کے سرگرم کارکن اور لیڈر رہے تھے، آخر مین سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، ۱۳۴۶ھ مین ان کا انتقال

ل الموتمر السوری الفلسطینی جس کا پہلا اجلاس (۱۹۲۱ء) میں جنیوا میں ہوا اور صدر دفتر ... امیر شکیب ارسلان کی نگرانی میں قائم ہا

ہوا، اس وقت امیر البیان جلاوطن تھے، دونون بھائیون میں ایک عرصہ سے ملاقات نہین ہوئی تھی، اسلئے صدمہ سخت اور جانگسل تھا، سید رشید رضا نے اس حادثہ پر ایک دردانگیز اور حکیمانہ خط امیر کو لکھا تھا، خط اور امیر کا جواب دونون المنار اور اکثر مشہور اخبارات ورسائل مین شائع ہوئے تھے، اور مستند ادیبون نے ان کو بلاغت کا بہترین نمونہ قرار دیا تھا، یہ دونون مکتوب بجا طور پر اس مجموعہ کی زینت ہین، اور ہم آج پھر انھیں دوبارہ پڑھ کر وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہین، کہ اس پایہ کی بلیغ اور معجز نما انشا پوری عربی ادبیات مین مشکل سے ملے گی، قرآن کریم، حدیث نبوی، اور دور اول کے خطبے اس سے مستثنیٰ ہین،

۶- کتاب الوحی المحمدی، مرحوم کی مشہور تصنیف "الوحی المحمدی" پر امیر البیان کا تبصرہ جو "المنار" محرم ۱۳۵۳ھ مین شائع ہوا تھا، (ص ۲۲۱-۲۳۱)

۷- امیر البیان کے سفرنامۂ حج (الارتسامات اللطاف فی خاطر الحاج الی اقدس مطاف) پر مرحوم کا مقدمہ (ص ۲۳۲-۲۴۱)

۸- حاضر العالم الاسلامی، ایک امریکن مصنف لوتھرپ ستادرد (Lothrop Stoddard) نے ۱۹۲۱ء میں یا اس کے لگ بھگ جدید دنیاے اسلام (The new world of Islam) کے نام سے دنیاے اسلام کی سیاسیات پر ایک مفید کتاب لکھی تھی، اردو میں بھی اوس کے دو ترجمے ملک عبد القیوم صاحب اور جمیل احمد صاحب بدایونی کے قلم سے شائع ہو چکے ہین، اس کا عربی ترجمہ "حاضر العالم الاسلامی" کے نام سے استاذ عجاج نویهض اڈیٹر "العرب" نے کیا ہے، مزید افادہ کے خیال سے مترجم نے امیر البیان سے حواشی (فٹ نوٹس) لکھنے کی درخواست کی، امیر نے لکھنا شروع کیا، تو حواشی اپنی ضخامت اور افادیت مین اصل کتاب سے بڑھ گئے، اور کتاب کی نسبت اصل مصنف کی جگہ محشی کی طرف ہونے لگی،

پہلا اڈیشن تیرہ چودہ سال پیشتر دو جلدوں میں چھپا تھا، پھر امیر نے مزید اضافے کئے، اور دنیائے اسلام کی تحریکوں پر ایسی سیر حاصل معلومات فراہم کیں، کہ یہ کتاب آج بجا طور پر اسلامی سیاسیات کی انسائیکلوپیڈیا تسلیم کی جاتی ہے، نیا ایڈیشن پانچ چھ سال ہوئے، چار جلدوں میں شائع ہوا ہے، پہلے ایڈیشن کی اشاعت پر سید رشید مرحوم نے تبصرہ کیا تھا، جو اس مجموعہ میں شامل ہے، (ص ۲۴۲ و ۲۵۱)

ان متفرق تحریروں کے بعد امیر البیان کے دو طویل مضمون ہیں، جو مرحوم کی وفات پر ان کے قلم سے نکلے تھے، نیز ایک خط ہے، جو امیر نے اس حادثہ پر اپنے اور امام مرحوم کے معتقد فلسطینی مجاہد سید محمد علی الطاہر، ایڈیٹر "الشباب" کو لکھا تھا، (ص ۲۵۲-۲۸۰)

ایک صفحہ میں تعزیتی جلسوں (حفلات التابین) کا ذکر ہے، کس قدر حیرت کا مقام ہے، امام سید رشید رضا کی یاد میں صرف چار معمولی جلسے ہوں، تعداد اور خطبات کے لحاظ سے تونس اور دمشق کے جلسے غنیمت کہے جا سکتے ہیں، بغداد کی مجلس میں صرف چار ادیبوں نے نظم و نثر سے شرکت کی قاہرہ کے تابینی جلسہ میں گو محمد الہراوی اور عبداللہ عفیفی جیسے شاعروں اور عبدالرحمٰن شہبندر اور محمد لطفی جمعہ جیسے ادیبوں نے خراج عقیدت ادا کیا، تاہم مرحوم کے سیاسی و علمی مرتبہ کے مقابلہ میں اسے کوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی، اسی قاہرہ میں شوقی کا "مہرجان"، المقتطف کی پنجاہ سالہ جوبلی، شوقی و حافظ کے تابینی جلسے اس شان سے منعقد ہوئے ہیں، کہ باید و شاید ابھی پچھلے سال اہل دمشق نے متنبی کی ہزار سالہ برسی اس تزک و احتشام کے ساتھ منائی ہے، کہ شاید متنبی کی روح مسرور ہو گئی ہو گی، لیکن خادمانِ دینِ مصطفوی کی قدر و منزلت اب اس دور میں کیوں ہونے لگی، ؟

تعزیتی جلسوں کے سلسلہ میں امیر البیان کا وہ مرثیہ بھی زیب قرطاس ہے، جو دمشق کے جلسہ میں ان کی طرف سے پڑھا گیا تھا، مرثیہ مؤثر، درد انگیز اور امیر البیان کے شایانِ شان ہے

گو عاجز کی رائے مین امیر الشعراء شوقی کے مرثیہ مین، امیر البیان زیادہ کامیاب ہین، شوقی کے مرثیہ کا یہ غیر فانی شعر کسی طرح نہیں بھولتا :۔

لو کان وحیٌ بعد وحی محمد لانشق ذاک الوحی عن آیاتہ

(اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کے بعد کسی وحی کا آنا ممکن ہوتا، تو (بلا شبہہ) اس وحی کا چشمہ شوقی کے معجزنما کلام سے پھوٹتا)

سید رشید مرحوم کے مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے :۔

تحدری یا دموعی بالمیازیب وعارضی السحب اسکوباً باسکوب[1]

(ہان) اے آنسو، اے (غم) پرنالون کی طرح بہنا اور اپنی روانی اور بہاؤ میں بدلیوں کا مقابلہ کرنا

مرثیہ کے بعد المقصورۃ الرشیدیۃ کو جگہ دی گئی ہے، مقصورۃ الرشیدیہ امام مرحوم کی ایک طویل اور مسلسل حکیمانہ نظم کا عنوان ہے، پوری نظم بیس صفحات (۲۰۵-۲۰۴) پر پھیلی ہوئی ہے، مرحوم نے یہ نظم ابن درید متوفی ۳۲۱ھ کے مشہور مقصورہ کے جواب (معارضہ) مین لکھی تھی، اور ایک خاص تقریب پر معارضہ اور نظم کی طوالت کے باعث بہت سے غریب اور مشکل الفاظ آ گئے ہین، اس لئے مرحوم نے بعض الفاظ کی تشریح خود کر دی تھی،

نظم کی تقریب اور تاریخ کی بابت خود ناظم کا بیان زیادہ مناسب ہوگا، خود نوشت سوانح حیات مین اپنی سخن سنجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین :۔

"میری آخری نظم مقصورۃ رشیدیہ ہے، جو مین نے مقصورۃ ابن درید کے جواب (معارضہ) مین لکھی تھی، یہ نظم دراصل مین نے اپنے ہم جلیس اور ہم سبق شیخ عبد القادر[2] مغربی کے امرا

[1] الاسکوب، الہطلان الدائم [2] عبد القادر مغربی مشہور لغوی و ادیب المجمع العلمی العربی دمشق کے صدر المجمع اللغوی الملکی مصر کے رکن، مجلۃ المجمع العلمی کے اڈیٹر، اور متعدد علمی کتابون کے مصنف و مصحح،

پر کہی تھی، ابتدا مین کل ایک سو انتیس شعر ہوئے تھے، اور ان کی تقریب شادی کے موقع پر بہ طور تہنیت پڑھے گئے تھے، پھر مقصورہ دریدیہ کے معارضہ کا خیال ہوا، اور اس مناسبت سے دینی، فلسفی، ادبی اور اجتماعی خیالات اور نکتون کی آمیزش کے ساتھ نظم میں اضافہ کرتا گیا، خصوصیت کے ساتھ "اصلاح اسلامی" سے متعلق اپنے ان افکار و خیالات کو نظم کا جامہ پہنایا، جنکی خاطر مین نے اپنی زندگی وقف کی اور مصر کی بود و باش اختیار کی، اس طرح پر چار سو شعر سے زائد ہو گئے، اسرار البلاغہ طبع اول ۱۳۲۰ھ کے حواشی مین اس کے بعض شعر مین نے بطور مثال کے پیش کئے تھے، سرخیل شعرائے عصر محمود سامی پاشا بارودی[۱] ان اشعار سے بہت محظوظ ہوئے اور خاص کر داد دی، میں نے کچھ اور شعر سنائے، تو انھون نے اسے دریدیہ پر ترجیح دی، اور چھپوانے کی، یا کم از کم اپنے لئے نقل کرانے کی خواہش کی، پھر مین نے اس کے بعض نمونے اسرار البلاغہ کے دوسرے ایڈیشن میں بھی دیئے اور تاریخ الاستاذ الامام[۲] جلد اول ص ۵۰۶ - ۵۰۸) میں اس کا وہ حصہ شائع کیا، جو ان کی اصلاحات ازہر سے متعلق تھا" اسی طرح جلد اول (ص ۹۰۸ - ۹۰۹) مین مقصورہ کا وہ حصہ بھی شائع کیا جس میں سید جمال الدین کی اصلاحی دعوت اور مصر مین ان کے کارنامون کا ذکر تھا، اس مین کچھ حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا،

حافظ ابراہیم[۳] حسن و عشق والا ٹکڑا سن کر کہنے لگے، کہ "طویل اور بے عیب نظم

۱؎ مشہور ادیب و شاعر، جو وزارت کے منصب سے بھی سرفراز ہوئے، عرابی پاشا کی مشہور مہم میں سیلون کو جلا وطن کر دیئے گئے تھے، مصر کی جدید ادبی بیداری میں ان کا بڑا حصہ ہے، (متوفی ۱۹۰۴ء) ۲؎ سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ کی مفصل سیرت، سید رشید مرحوم کے قلم سے (تین جلدوں میں) ۳؎ اس عہد

مین قافیہ تمھارا بہت ساتھ دے رہا ہے، لیکن بھائی اگر تم شعر ہی کہنے لگے، تو پھر ہم لوگوں کو فقہ اور فتوی نویسی اپنا مشغلہ بنانا پڑے گا" اگر موقع ملا تو مشکل الفاظ کی تشریح کیساتھ مقصورہ کو طبع کراؤنگا" (ص ۱۱۲-۱۱۵)

ان تمام چیزون کے بعد (مناجاۃ اخ لاخیہ[۱]) کے عنوان سے صاحب سیرت کے خطوط درج کئے گئے ہین، جو اس مجموعہ کا بڑا حصہ (۳۰۵-۵۰۹) اور خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، اور صحیح معنوں میں گذشتہ بیس سالوں کی سیاسی و ادبی واقعات کا مرقع ہین امیرالبیان اور مرحوم کے درمیان تعلقات تو یوں چالیس سال سے تھے، اور اس اثنا مین خط وکتابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، لیکن سیاسی خلفشار اور امیرالبیان کے مسلسل سفر اور نقل و حرکت کے باعث جنگ عظیم سے قبل کا ذخیرہ محفوظ نہ رہ سکا، اس مجموعہ مین صرف وہ خطوط ہین، جو امام مرحوم نے جنیوا کی شامی کانفرنس (منعقدہ ۱۹۲۱ء) سے واپسی کے بعد امیر کو لکھے، ان مکاتیب کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے، اور سب مرحوم کے دست خاص کے لکھے ہوئے ہین،

اکثر خطوط طویل ہین، صفحہ دو صفحہ کے مکتوب بہت کم ہیں بعض دس بارہ صفحوں تک پہنچ گئے ہین، ایسے خطوط بھی ہیں، جن کی حیثیت ایک مستقل رسالہ کی ہو گئی ہے، (ص ۳۰۷)

امیرالبیان کی رائے میں مکتوبات رشیدیہ (امیرالبیان نے اس مجموعہ کا یہی نام رکھا ہے)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۴) کے مشہور قومی و اجتماعی شاعر شیخ محمد عبدہ کے معتقد اور شاگرد، جن کا انتقال ابھی ۱۹۳۲ء میں ہوا ہے، کہا جاتا ہے، کہ حافظ ابراہیم کا سب سے اچھا کلام شیخ محمد عبدہ کا مرثیہ ہے، اس دلگداز مرثیہ کے یہ دو شعر بہت مشہور ہین؛

سلامٌ علی الاسلام بعد محمدٍ ۔۔۔ سلامٌ علی ایامہ النضرات

عَلی الدّین وَالدّنیا علی العلم والحجی ۔۔۔ علی البر والتقوی علی الحسنات

[۱] (دوستوں میں راز و نیاز کی باتیں) اس کا ترجمہ کر سکتے ہین،

سید رشید رحؒ کی تمام تحریرون پر بھاری ہین،

" اگرچہ ان کی انشار کی مثال باران رحمت کی ہے، متقدم، متاخر ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجا سکتی، (ص ۳۰۶)

یہ خطوط ایک دوست کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہین، ان مکتوبات کے آئینہ مین ان کے خط و خال صاف نظر آتے ہین، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مکتوب نگار کا ظاہر و باطن یکسان تھا، خیالات اخلاص، جرأت، علوہمت، مروت، پاس عہد، ان تمام اوصاف کے لحاظ سے المنار کے بلند بانگ ایڈیٹر اور ان نجی تحریروں کے در دمند مصنف میں ذرہ برابر فرق نہیں معلوم ہوتا، (ص ۳۰۷ ملخص)

امیر البیان بار بار لکھتے ہین کہ بلاغت اور حسن انشار کے اعتبار سے یہ مکتوبات امام مرحوم کی تمام تصنیفات پر بھاری ہین:۔

" ولذلك قلت ان هذه الرسائل الخاصة هی اعلی ماجری به قلمُ السيد رشيد فی حیاته کما یتضح لکلِّ ذی بصرٍ بصناعة الکتابة (ص ۳۰۰)

ان خطوط کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جنگ عظیم سے لیکر اب تک کے تمام ان حوادث پر جن سے مسلمانان عالم کو گذرنا پڑا، یا گذرنا پڑ رہا ہے، سید مرحوم کی رائین اور تاثرات ان میں موجود ہین، کوئی چھوٹی یا بڑی بات نہیں جن کا ان میں ذکر یا اشارہ نہ ہو(صث)

جہان اشارات و تلمیحات ہین، وہان امیر البیان کے قلم کی گلکاریون نے چار چاند لگا دیئے ہین،

ان مکتوبات مین دینی، لغوی، اجتماعی، تاریخی سیاسی ہر قسم اور ہر رنگ کی بحثین ہین بیسیون مسئلوں میں مجھ سے چھیڑ چھاڑ چلی ہے، جہاں میری اور ان کی رائیں ایک دوسرے سے الگ تھیں، لیکن ان تمام بحثوں مین مرحوم نے اپنی برتری یا (تنزہ عن الخطار) کا کبھی ادعار

نہین کیا، اور نہ کبھی حقیقت ظاہر ہونے کے بعد اعتراف خطا مین جھجک محسوس کی،

(صفحہ ۳۰۸)

ان خطوط میں امیر نے کہیں ترمیم نہین کی ہے، البتہ کہیں کہیں سیاسی معاملات کے سلسلہ مین اسماء حذف کر دیئے ہین اور ان کی جگہ نقطے (......) استعمال کئے ہین، یا اشخاص کی جگہ (فلان) پر اکتفا کیا ہے بعض سیاسی اسرار جن کا ظاہر ہونا شام اور فلسطین کی موجودہ سیاسیات کے لئے نقصان رسان ہوتا، یکسر حذف کر دیئے ہین، لیکن بایں ہمہ ایک حرف کا اضافہ یا ترمیم مطلق نہیں ہوئی ہے، (ص ۳۰۹ ملخص)

مکتوبات رشیدیہ کے بعد امام مرحوم کے شاگرد اور شریک کار نسبتی بھائی اور ابن عم، سید عبدالرحمٰن عاصم کے تین خطوط (ص ۹۹، ۸۰۷) ہین، جو انھوں نے اپنے استاذ اور مرشد کی وفات کے بعد امیر البیان کو لکھے تھے، یہ تین مکتوب اپنے اندر عبرت کے ہزاروں سبق پنہان رکھتے ہین ایک مجاہد کی چالیس سالہ خدمات کا بدلہ اس دنیا مین یہ ملتا ہے، کہ رہنے کا مکان رہن، پریس مقروض، لڑکوں کی تعلیم کا انتظام نہیں، خریدار چندے کھائے بیٹھے ہیں، کتب فروش قیمت ادا کرنا نہیں جانتے، امام مرحوم کی وفات کے بعد طرابلس الشام کے سیدزادے اپنے کو مصر کے بازاریں ڈیوٹن کا محتاج پاتے ہیں،

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

آخر میں تین صفحون کا ایک ضمیمہ ہے، جس میں سید مرحوم کے نسب پر گفتگو کی گئی ہے، اور صحت نسبت کے تواتر اور شہرت کی شہادتیں پیش کی گئی ہین، (۵۰۹ - ۵۱۱)

خاتمہ پر تفصیلی فہرست (۵۱۲-۵۳۲) ہے، انڈکس نہیں، پھر بھی تمام قابل ذکر مواد کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے،

یہ کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، اب ہم صاحب سیرت کے خود نوشت سوانح حیات، خطوط اور بعض دوسری چیزوں پر ذرا تفصیلی گفتگو کرنا چاہتے ہیں،

خود نوشت سوانح حیات امام مرحوم کے خود نوشت سوانح حیات تقریباً سوا سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، اس مختصر سی تحریر میں پورا خلاصہ نہیں دیا جا سکتا، پھر بھی ان کی کتاب زندگی کے چند اوراق پر نظر ڈالنا ضروری ہے، آئیے، ہم انہی کے آئینہ میں ان کی تصویر دیکھیں، صاحب سیرت کے تقوی اور راست بازی سے توقع ہے، کہ ان کی قلمی تصویر سچی اور سبق آموز ہوگی، اقتباسات میں کہیں ترجمہ کہیں تلخیص پر اکتفا کیا گیا ہے،

خاندان اور ماحول "میری پیدایش اور نشو و نما طرابلس الشام سے تین میل دور بحر متوسط کے ساحلی گاؤں قلمون میں ہوئی، اس گاؤں کے باشندے سب مشہور النسب سادات تھے، البتہ گذشتہ صدی میں کچھ اہل لبنان بھی وہاں آکر آباد ہو گئے تھے، غربت، گم نامی، اور مخصوص اوقاف نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں تفرق کی ضرورت زیادہ محسوس نہیں ہوئی، پھر بھی گاؤں کے بڑے بوڑھے بیرونی خاندانوں سے خوب واقف تھے،

گاؤں والے شرافت اور حسن اخلاق میں مشہور تھے، ان کی نسبت کوئی بری بات سننے میں نہیں آئی، البتہ کبھی کبھی پھلوں کی چوری، اور آپس میں سرپھٹول کی خبریں سننے میں آتی تھیں،

"ہمارا خاندان علم و تقوی میں ممتاز تھا، وعظ و ارشاد کے باعث "مشائخ" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، میرے پردادا نے بستی کی مشہور مسجد تعمیر کرائی تھی، وہ بہت متورع اور متقی عالم تھے، عثمانی حکومت سے وظیفہ مقرر تھا، امامت اور خطابت کی سند بھی عطا ہوئی تھی، اس سلسلہ کا آخری وظیفہ اور سند جنگ عظیم سے پہلے سلطان وحید الدین کے دربار سے میرے نام جاری ہوئی

ہمارا گھر میزبانی اور خاطر و مدارات میں مشہور تھا، ہمارے دادا کے تعمیر کردہ گھر کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا "ہر مذہب و ملت کے مہمانوں کے لئے ہمارا گھر کھلا ہوا ہے" میں نے خود اپنی آنکھوں سے طرابلس کے علما، حکام، اور عمائد کو گرمی کے موسم میں اپنے ہاں برابر قیام کرتے دیکھا ہے، میں ابتدائے سن شعور سے حکام اور امرا کی نسبت، علما کی طرف زیادہ مائل تھا،

میری کمسنی میں دادا کا انتقال ہوگیا تھا، اس کے بعد میرے والد ماجد گھر کے مالک قرار پائے، والد کے چچا شیخ احمد شب و روز عبادت میں مشغول رہتے، علما اور خاص دوستوں کے سوا کسی سے نہیں ملتے، عصر اور مغرب کے درمیان باہر بیٹھتے، ان کی مجلس ادب و وقار سے معمور ہوتی، فضول گوئی یا ہنسی مذاق کی گنجایش ان کے سامنے نہیں تھی، خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ طرابلس کا فوجی افسر جو نہایت متکبر اور پرہیبت تھا، شیخ کی زیارت کو آیا، طرابلس میں علما، اور صالحین کی تعظیم اس افسر کے ہاں نہیں ہوتی تھی، یہ سب کو معلوم تھا، شیخ سے اس کے لئے اجازت طلب کی گئی، لیکن انھوں نے اجازت نہ دی، اس نے پھر دیکھنے کی خواہش کی، لوگوں نے کہا، ٹھہر جاؤ، نماز کو مسجد جائیں گے تو زیارت ہو جائے گی، آخر وہ نماز کو آئے، اور سلام کے بعد یہ شعر پڑھ کر کہا کہ کسی نفرت یا ذاتی پرخاش کی وجہ سے انھیں ملنے سے انکار نہیں، دوسرے شعر کا پہلا مصرع سہو ہوگیا، حالانکہ مشہور ہے،

أنست بوحدتي ولزمت بيتي وطاب الانس لي وصفا السرور

. . . . فلا أزار ولا أزور،

ولست بسائل ماعشت يوما أسار الجند أم ركب الامير

۱۔ میں اپنی تنہائی سے مانوس ہوگیا، اور ایک گوشۂ عافیت اختیار کر لیا، اسی میں (دل

---

۵ سید رشید رضا نے یہاں پر کوئی ایسی بات نہیں لکھی جسے تمام اہل طرابلس نہ جانتے ہوں،
(شکیب ارسلان)

کی خوشی ہے، اور فرحت کی پاکیزگی،

۲۔ .... نہ کوئی مجھ سے ملتا ہے، نہ میں کسی کے ہاں جاتا ہوں،

۳۔ مجھے کبھی کسی کی فکر نہیں ہوتی، فوج کی نقل وحرکت ہو، یا حاکم کی آمد، (مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا)

اس واقعہ سے اپنے خاندان کی وقعت میری نگاہوں میں بہت بڑھ گئی، اور یہ خیال جم گیا کہ اگر شرافت نسب کے ساتھ تقویٰ اور بلند حوصلگی بھی ہو، تو پھر انسان دین و دنیا ہر جگہ سرخرو ہو سکتا ہے" (ص ۲۳-۲۶)

تعلیم و تربیت میری ذکاوت ضرب المثل تھی، علماء اور وجہاء برابر والد ماجد کو میری تعلیم کی طرف متوجہ کرتے، اور میری کامیابی وحصول کمال کی بڑی بڑی امیدیں دلاتے تھے، مجھے یہ مبالغہ آمیز باتیں عجیب وغریب معلوم ہوتیں، صالح بھائی کا حافظہ مجھ سے اچھا تھا، اور میرے نزدیک حافظہ ہی ذکاوت کا معیار تھا، شاید ہی کبھی ایک بار سن کر کوئی شعر یاد رہ گیا ہو۔

آغاز تعلیم میں طلبہ ہر علم کی تعریفیں لفظ بہ لفظ یاد کرتے تھے لیکن میں سمجھنے کی کوشش کرتا تھا.. بعض کتابوں کا حفظ کرنا مدرسہ کی جانب سے ضروری تھا، اس میں مجبوری تھی جیسے الفیہ منطق میں سلم کا متن جوہرۃ التوحید اور حریری کے بعض مقامات ، ...... (ص ۳۲)

...... خلاصہ یہ کہ میں سرعت فہم میں ممتاز تھا، خصوصیت کے ساتھ مدلل اور عقلی چیزوں پر میں بہت جلد حاوی ہو جاتا تھا، اس لئے منطق کا مشکل فن میرے لئے بہت آسان تھا، صرف قضایا کے عکس اور نقیض میں کچھ الجھن ہوتی تھی"

سلم اور منطق کا تذکرہ بتاتا ہے، کہ گذشتہ صدیوں میں فرسودہ معقولات کی یہ مصیبت صرف ہندوستان ہی پر نہیں آئی تھی، بلکہ طرابلس الشام بھی اسی آفت میں مبتلا تھا، بات پر بات نکلتی ہے،

معلوم ہوا ہے، کہ اب تک ازہر کے اصلاح شدہ کا بحون (کلیات) میں مسلم الثبوت پڑھائی جاتی ہے، اور خود شیخ مصطفےٰ مراغی بنفس نفیس مسلم الثبوت کا درس دیتے ہیں،!!

طرابلس الشام میں تعلیم و تربیت کا حال کچھ اور سنیئے،:-

"میں نے اپنے گاؤں (قلمون) کے مکتب میں قرآن مجید (ناظرہ) اور معمولی نوشت و خواند کی تعلیم حاصل کی، پھر خاص طرابلس کے مدرسۂ رشدیہ میں داخل ہوا، یہ سرکاری ابتدائی مدرسہ تھا، جس میں صرف، نحو، جغرافیہ، عقائد (مبادی) ترکی اور عربی کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن تمام علوم کی تعلیم ترکی زبان[1] میں ہوتی تھی، ایک سال وہاں پڑھتا رہا، پھر چھٹیوں کے بعد مدرسہ واپس نہیں گیا کہ مجھے سرکاری ملازمت مطلوب نہ تھی،

اسکے بعد پھر مدرسۂ اسلامیہ قومیہ میں داخل ہوا، یہ مدرسۂ رشدیہ سے ترقی یافتہ تھا تعلیم کی زبان عربی تھی، صرف ترکی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھی، اس میں تمام عربی و دینی علوم کے علاوہ منطق، ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی، مدرسہ کے بانی اور مہتمم علامہ شیخ حسین الجسر[2] ازہری تھے، ان کے خیال میں مسلمانوں کی ترقی دینی اور دنیوی علوم کی آمیزش کے بغیر ناممکن تھی، وہ اسلامی تربیت اور جدید یورپین اور امریکن طریقۂ تعلیم کو ایک ثقافت میں سمونا چاہتے تھے"

گویا آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے طرابلس میں ندوۃ العلماء کی داغ بیل پڑ چکی تھی، ندوہ ایک فکر اور نصب العین کا نام ہے، کوئی حیرت کی بات نہیں، اگر دو چار سال آگے پیچھے، طرابلس اور ہندوستان کے علماء کو ایک ہی چیز کا احساس ہوا ہو، اور نبض شناسان امت نے نسخہ بھی

---

[1] ترکوں کی یہی قومی پالیسی تھی، جس نے عربوں کو بددل کر رکھا تھا، آخر اس کے برے اثرات ظاہر ہوئے اور دونوں کو خمیازہ بھگتنا پڑا، [2] علامہ شیخ حسین جسر شیخ محمد عبدہ کے ہم عصر اور گذشتہ دور کے مشہور روشن خیال عالم تھے، مشہور رسالہ حمیدیہ ان ہی کی تصنیف ہے (مولود ۱۲۶۱ھ متوفی ۱۳۲۷ھ)

ملتا جلتا تجویز کیا ہو، لیکن اس سے زیادہ عجیب تر بات یہ ہے، کہ اگر ہندوستان مین اس تحریک کو اندرونی و بیرونی مخالفتون کا مقابلہ کرنا پڑا، تو طرابلس میں ترکی حکومت کی نگاہ کرم اُسے کھا گئی، زہ نور دان طریق محبت کی مشکلات بھی یکساں ہین،

ترکی حکومت میں، دینی مدرسوں کے طلبہ وعظ وارشاد کے بدلے مین فوجی خدمت سے معاف رکھے جاتے تھے، اس مدرسہ کے بانی اور شرکا، کا قصد بھی خالص دینی تھا، لیکن حکومت اسے دینی مدرسہ ماننے پر راضی نہین ہوئی، "آخر حکومت کی جہالت اور کم فہمی کے باعث طرابلس اور اس کے مضافات اس مدرسہ کے فوائد سے محروم ہوگئے"، مدرسہ بند کرنا پڑا، اور شیخ حسین جسر کے شاگردوں میں جدھر جس کا سینگ سمایا نکل گیا، کچھ مستقل مزاج طرابلس ہی مین رک گئے، انہی میں صاحب سیرت بھی تھے، اور درحقیقت ان کے طلب علم کا صحیح دور اب شروع ہوتا ہے،

"طلب علم سے پہلے[1] ادب و تصوف کی کتابون کا بہت شوق تھا، تصوف کی تمام کتابون میں حجۃ الاسلام امام ابوحامد غزالی کی احیاء العلوم مجھے بہت محبوب تھی، اُسے میں بار بار پڑھا کرتا اور لوگوں کو پڑھکر سنایا کرتا تھا، اور میرے علم وعمل اور دین واخلاق پر اس کتاب کا بہت اثر تھا، اور واقعی یہ کتاب بہت مفید ہے گو بعض حصے نقصان رسان بھی ہیں، علم سے بہرہ ور ہونے کے بعد مجھے نقصانات کا تدارک کرنے مین دقت نہیں ہوئی، حدیث وسنت کے مشغلہ کے بعد احیاء کی علمی غلطیون خصوصیت کے ساتھ جبریہ کے عقائد، اشعریہ اور صوفیہ کی تاویلون تقشف اور نوتراشیدہ عبادتون سے رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا" (ص ۲۰، ۲۱)

مجھے شعرانی کی الیواقیت والجواہر بہت پسند تھی، ان کی دوسری کتابون خصوصاً طبقات[2]

---

[1] یعنی طلب علم کے دوسرے دور سے پیشتر [2] طبقات شعرانی سے مراد لواقح الانوار فی معرفۃ طبقات السادۃ الاخیار ہے عبدالوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ،

کی نسبت اس میں خرافات کم ہیں، نیز ان میں اجماع کا باب دل کو بہت لگتا تھا، خصوصیت کے ساتھ اختلاف کو عزیمت اور رخصت پر محمول کرنا، اس انتخاب اور پسند میں طبعی استعداد کے سوا اور کوئی رہنما نہیں تھا، میں ابتداے نشو و نما سے عبادت و اخلاق میں صوفی تھا، ادب کا رجحان بھی قوی تھا، اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں پڑھیں، منظومات کی ایک بڑی تعداد بلا ارادہ حفظ ہو گئی، شہرزوری[2] کا صوفیانہ قصیدہ اور ابن زیدون[3] کا مشہور نونیہ قصیدہ بھی اسی طرح یاد ہو گیا تھا؛ (ص ۳۰)

علامہ رشید رضا مرحوم کو فنون ادب میں بھی اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی، عام علماے ازہر کی طرح وہ صرف ایک "شیخ" نہیں تھے، شروع ہی سے وہ بکثرت کتب لغت دیکھنے کے عادی تھے، مدرسہ ہی میں ان کی لغوی استعداد کی شہرت ہو گئی تھی جب لغت کی کتابیں نہ ہوتیں، تو شیخ جسر مشکل الفاظ ان سے پوچھتے، اور یہ شافی جواب دیتے، (ص ۳۰)

اسی وجہ سے سید رشید پڑھنے میں اعراب کی غلطی (لحن) شاذ و نادر کرتے تھے، صرف و نحو سے ناواقف ہونے کے باوجود وہ عبارت خوانی میں ممتاز طلبہ پر سبقت لیجاتے تھے حقیقت یہ ہے، کہ صرف و نحو کی کتابی تعلیم ادبی استعداد پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے، ہم اپنے ملک میں تو اس امر کی ہزاروں مثالیں روزانہ دیکھتے ہیں، لیکن امام مرحوم کی زبانی طرابلس الشام کا تعلیمی تجربہ سن کر اپنے خیال و تجربہ کی مزید تصدیق ہوئی،

امام مرحوم کے زمانہ طالب علمی میں وہی متاخرین کا فرسودہ طریقہ تعلیم رائج تھا متون کا حفظ، حواشی کی بھرمار، اصل فن سے تغافل، مغز کی جگہ چھلکوں پر اکتفا، اس دور کی خصوصیتیں تھیں

---

[1] شعرانی کی مشہور کتاب [2] شہرزوری سے مراد غالباً قاسم بن مظفر بن علی شہرزوری ہیں، [3] ابن زیدون (متوفی ۴۶۳ھ) مشہور اندلسی شاعر جس کا نونیہ قصیدہ ہر دور میں پسند کیا گیا ہے،

لیکن صاحب سیرت کو شیخ حسین جسر کی صورت میں نعمتِ غیر مترقبہ ملی، وہ ایک مجتہد الفکر عالم اور اپنے عہد کے علما سے ممتاز تھے، ان کا طریقہ تعلیم بھی جداگانہ تھا، لایعنی شروح وحواشی ان کے حلقۂ درس میں بار نہیں پا سکتے تھے، منطقی کج بحثی اور لفظی چھیڑ چھاڑ کو بھی وہ اہمیت نہیں دیتے تھے، وہ فن پڑھاتے اور شاگردوں کے ذہن ودماغ میں اس کے مسائل اُتار دینا چاہتے تھے، ازہر میں بھی وہ رہے تھے، لیکن کم، اور وہاں بھی شیخ حسین مرصفی جیسے لغوی اور ادیب کی صحبت ملی، جس سے ان کی ادبی صلاحیتیں چمک اٹھیں،

امام مرحوم نے شیخ جسر سے ادبی اور عقلی علوم کی تحصیل کی، جدید علوم سے وہ اچھی طرح واقف تھے، رسالہ حمیدیہ اس کا بہترین شاہد ہے، عربی کے اچھے انشا پرداز اور "عصری" شاعر تھے، یعنی ان کی منظومات متاخرین کی تنگ بندیوں سے بلند تھیں،

حدیث وفقہ کی تحصیل کے لئے انھوں نے علامہ شیخ محمود نشابہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، شیخ نشابہ ازہر میں متعلم ومعلم دونوں حیثیتوں سے تیس سال قیام کر چکے تھے، اور انھیں اٹھارہ علوں (جس میں جبر ومقابلہ بھی شامل ہے) میں ازہر کی سند حاصل تھی

پہلے پہل ان سے اربعین نووی پڑھی، اور اسکی باضابطہ تحریری اجازت حاصل کی، علامہ عبدالغنی رافعی سے نیل الاوطار کا کچھ حصہ پڑھا لیکن درس وتدریس سے زیادہ ان کی صحبت سے مستفیض

لہ شیخ عبدالغنی رافعی طرابلس الشام کے رافعی خاندان کے مشہور عالم تھے پچھلی صدی ہجری کے آخر دور میں یہ استاذ الکل کی حیثیت رکھتے تھے، رافعی خاندان مصر وشام میں علم وفضل کی حیثیت سے بہت ممتاز رہا ہے، موجودہ دور میں شام کے عبدالحمید رافعی (شیخ عبدالغنی رافعی کے بیٹے) اور مصر کے مصطفیٰ صادق رافعی اپنی آپ مثال تھے مصطفیٰ صادق رافعی کے متعلق امیر شکیب کا یہ مقولہ زبان زد خاص وعام ہے،

لم تنجب العرب مثله منذ مآت من السنين — عرب کی سرزمین سیکڑوں سال سے ان کا مثیل نہ پیدا کر سکی

ہوا، غزالی کی احیاء العلوم انھیں بھی بہت محبوب تھی، اور شیخ عبد القادر جیلانی کے مواعظ بھی ان کے زیر مطالعہ رہا کرتے تھے، مشہور محدث شیخ محمد قاوقجی[1] سے بھی حدیث مین استفادہ کیا، (ص ۷۱)

درس و تدریس کی جگہ امام مرحوم کو حدیث کا صحیح ذوق ذاتی مطالعہ سے پیدا ہوا احیاء العلوم کی حدیثون کی چھان بین کے سلسلہ مین یہ ذوق پختہ ہو گیا، ہندوستان کی چھپی ہوئی میزان الاعتدال طرابلس مین پہلے پہل آپ ہی نے منگوائی، میزان الاعتدال کا ملنا تھا کہ وعظ و محاضرات کی کتابون کے پرچے اڑنے شروع ہو گئے، مرحوم کی اس شدت کا یہ اثر تھا کہ ان کے رفیق درس شیخ عبد القادر مغربی نے میزان الاعتدال کا نام "المقول الذہبی"[2] رکھ دیا، مرحوم کا علمی ذوق حدیث و دینیات ہی تک محدود نہین تھا، وہ اسی زمانہ مین عبد القادر مغربی کے ساتھ ڈاکٹر فانڈیک کی جدید کتاب النقش فی الحجر بھی پڑھتے تھے، اس مین جدید علوم کی مبادیات بیان کی گئی ہیں، (ص ۷۲ ملخص)

زمانہ طالب علمی ہی مین مرحوم کی ذہانت ضرب المثل ہو چکی تھی، شیخ حسین جسر انھیں بہت مانتے تھے، شاگرد پر استاذ کا اعتماد اس قدر بڑھ گیا تھا، کہ وہ اپنے درس اور تالیفات کے متعلق شاگرد کی رائے دریافت کرتے، اور شاگرد جو آگے چل کر "حق کی آواز" بننے والا تھا، پورے ادب کے ساتھ اپنی رائے بے کم و کاست ظاہر کر دیتا،

طالب علمی کی ساری سرگذشت مین ہمین ایک چیز بہت نمایان نظر آتی ہے، مرحوم بلا سمجھے بوجھے کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہین ہوتے تھے، وہ ہر مسئلہ کو علم و عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے، ان کا یہی ابتدائی جوہر تھا، جس نے انھیں فنون حدیث کا نقاد کامل بنا دیا، تقلید، تصوف، فقہ،

---

[1] سنہ ۲۵ کے درودی جہاد اور سنہ ۳۶ کے فلسطینی جہاد کے قائد فوزی قاوقجی آپ ہی کے خاندان سے ہیں، شیخ محمد قاوقجی اپنے زہد و تقوی کی وجہ سے ولی شمار کئے جاتے تھے، (شکیب ارسلان - ص ۲۴ حاشیہ) [2] میزان الاعتدال کے مصنف امام ذہبی کی نسبت ذہب (سونا) کی طرف تلمیح مقصود ہے (مقول) ہتھوڑے کو کہتے ہین،

ہر کوچہ سے گذرے، لیکن ان کی طبیعت کتاب وسنت کے چشمۂ صافی کے سوا کسی چیز پر قناعت نہ کر سکی،

تصوف اور تنسک — امام مرحوم نے اپنے زہد وتنسک کی مفصل روداد لکھی ہے، حکایت لذیذ تھی زبان شوق اختصار پر قناعت نہ کر سکی، (ص ۸۴۔۹۲)

ہم عبادت کی لذت کے منکر نہیں، اور نہ تنسک وزہد کوئی معیوب چیز ہے، لیکن شب بیداری اور راز ونیاز کی باتون کو مزے لے کر بیان کرنے کا فلسفہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، اگر شیخ محمد عبدہ کی رائے میں ابن عربی نے ان کیفیتوں کے بیان کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے، تو عاجز کی رائے میں علامہ سید رشید رضا نے بھی اپنی کرامتوں کی تفصیل کرکے اسلام کی کوئی خاص خدمت انجام نہیں دی، امام غزالی اور دوسرے صوفیوں کی یہ رائے بالکل صحیح ہے، کہ ان کیفیات واحوال کی شرح وتفصیل فائدہ کے عوض ضرر رسان ہوتی ہے، صاحب سیرت خود احیاء العلوم کے کتاب الغرور کا حوالہ دیتے ہوئے اس خیال کی تائید کرتے ہیں، پھر انہی چیزوں کی تفصیل وبسط میں ایسی ایسی باتیں بیان کرتے ہیں، کہ سید رشید رضا کی خود نوشت سوانح حیات کے بجائے کسی شیخ طریقت کی سرگذشت معلوم ہوتی ہے،

عام صوفیوں سے اتنا فرق ضرور ہے کہ سید رشید جا بجا بدعات کی تنقید کرتے جاتے ہیں، پہلے وہ ورد السحر کا وظیفہ پڑھا کرتے تھے، رمضان میں خاص طور پر اہتمام ہوتا تھا، حدیث اور سلف صالحین کے مشرب سے لذت آشنا ہونے کے بعد صرف قرآن کریم کی تلاوت پر اکتفاء کرنے لگے، (ص ۸۹)

پہلے انھوں نے دلائل الخیرات کی باضابطہ سند اجازت حاصل کی تھی، اور اسے

---

۵۱ ص ۶۱،

تبرکاً اور تعبداً پڑھا کرتے تھے، حدیث وسنت میں لگ جانے کے بعد ان تمام اوراد سے ان کا جی چھوٹ گیا، جن میں وقت کی پابندی بلند آواز کی قید، اور دوسری غیر شرعی اور غیر ماثور ہیئت اور اشکال کے مل جانے سے بدعت کا شبہہ قوی ہوتا تھا، (ص ۵۰)

مرحوم نقشبندیہ طریقہ میں بیعت بھی ہوگئے تھے، اپنی عبادت وریاضت اوراد و وظائف اور ان سب سے بڑھ کر تصور شیخ کا تذکرہ دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں، تشکر یہ ہے، کہ بدعات کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں،

مرحوم نے بار بار اپنے کرامات کا تذکرہ کیا ہے، عام طور پر ملنے والے اور اعزا و اقربا ان کی کرامتوں کو مانتے تھے، لیکن انھیں کبھی دھوکا نہیں ہوا، وہ اپنے مکاشفات کی حتی الامکان تاویل کرتے، اور انھیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے، احیاء العلوم کے کتاب الغرور میں ایسے صوفیوں کا حال پڑھ چکے تھے، اس لئے وہ اعجاب بالنفس کے فتنہ سے بال بال بچ گئے، وہ ان کرامات کی تردید بھی کرتے ہیں،

اس سلسلہ میں شیخ یوسف نبہانی[1] اور شیخ یوسف دجوی[2] سے اپنے قلمی مناظروں کا تذکرہ فرماتے ہیں، اور ان کی خوش عقیدگی کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن ہمیں خلوت کی ملاقاتوں "تزکیہ نفس" اور مکاشفات کا برملا تذکرہ کرنے ہی پر اعتراض ہے، اس سے اصلاح کی توقع کم ہے، نقصانات زیادہ ہیں،

بہرحال اس حصہ میں تصوف اور متصوفین کے متعلق بہت کچھ مسالہ موجود ہے، "منکرین" اور "مومنین"

[1] شیخ یوسف نبہانی شام کے مشہور عالم، صوفی، ادیب و شاعر تھے، ان کا تقوی مشہور تھا، لیکن ولیوں اور پیروں کے بہت معتقد تھے، اور محض اسی وجہ سے وہ شیخ محمد عبدہ اور سید رشید رضا سے انتہائی بغض رکھتے تھے، ان کی وفات کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا، معجم المطبوعات (۱۸۳۳) میں ان کی ۴۰ تالیفات گنائی گئی ہیں [2] یوسف دجوی کا شمار ازہر کے کبار علماء میں ہے، لیکن ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پکے قبر پرست ہیں،

تصوف دونوں اس سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں،

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر — امر بالمعروف اور قلمی و زبانی جہاد کے متعلق امام مرحوم جو لکھتے، کم تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کی کتاب حیات کا سب سے درخشاں باب یہی ہے، وہ فطرت کی طرف سے ناقدانہ طبیعت اور جری دل لے کر آئے تھے، وہ ہر کھری کھوٹی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، سیاست، دین، اخلاق و ادب، ہر شعبۂ زندگی میں ان کے سامنے منکر چیزیں آتی تھیں، وہ اس قسم کی ہر شے کو کتاب و سنت کی میزان پر تولتے تھے، عقل سلیم کی مقیاس لگا کر جانچتے تھے، جو قول یا عمل اس معیار پر پورا اترتا، اسے وہ صدق دل سے قبول کرتے، جو بات اس صراط مستقیم کے خلاف معلوم ہوتی، اسے ٹھکرا دیتے، اس باب میں وہ عوام کی رضاجوئی، یا حکام و عمائد کی خوشنودی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، ان کی ساری زندگی منکرات کے خلاف مسلسل جہاد میں بسر ہوئی، ازہر کی سرکار سے معتوب ہوئے، عثمانی حکومت کے تیر ستم کا نشانہ بنے، مالی نقصانات اور خانگی پریشانیوں کا کیا ذکر، کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل ہے، اور مرحوم اس سے گذر چکے تھے،

امام مرحوم نے کبھی ملازمت کی خواہش نہیں کی، اور نہ وہ شیوخ ازہر کی طرح ہزار بارہ سو ماہوار آسانی سے حاصل کر سکتے تھے، اہل علم کی ایک دوسری قسم کی طرح وہ علم کے غلام بھی نہیں تھے، وہ اپنے علم سے خلق اللہ کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے، اس باب میں بھی وہ احیاء العلوم کا برابر ذکر کرتے ہیں، احیاء کے باب (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کا ان پر بہت اثر تھا، (ص ۹۴)

"نہی عن المنکر" کے سلسلہ میں پہلا واقعہ انھیں اصحاب حال و قال کے ساتھ پیش آیا، مولویہ سلسلہ کے مشائخ اپنے طریقہ کے مطابق "رقص و سرود" میں مصروف تھے، دو چار چکر کے بعد پیر کے

لہ مصنف رح نے جن الفاظ میں اس مجلس سماع کا نقشہ کھینچا ہے، ان کی صحیح تعبیر "رقص و سرود" ہی کے فقرہ سے ہو سکتی ہے، (ملاحظہ ہو ص ۹۵)

آگے جھکتے (یرکعون لہ) اور قدم لیتے تھے، مرحوم کے لئے یہ پہلا موقع تھا، ان سے ضبط نہ ہوسکا، انھوں نے سختی کے ساتھ لوگوں کو اس بدعت سے روکا، اس کی غیر مشروعیت واضح کی، شرکائے مجلس کو اتخذوا دینھم ھزوًا ولعبًا کا مصداق قرار دیا، اپنا فرض ادا کرکے وہ مجلس سے اٹھ آئے، دو چار بندگان خدا ان کی دعوت سے متأثر ہوئے اور ان کے پیچھے ہولئے۔

اس واقعہ کا بڑا چرچا رہا، شیخ حسین الجسر بھی مشائخ طریقت سے تعرض اچھا نہیں سمجھتے تھے، شاگرد کو باز رکھنے کی کوشش کی، شاگرد و استاذ میں دلچسپ مباحثہ رہا، آخر استاذ نے تنگ آکر ارشاد فرمایا "ہمارا مذہب (حنفی) تمھارے مذہب (شافعی) سے حرمت سماع میں زیادہ سخت ہے لیکن میری نصیحت یہی ہے، کہ تم مشائخ طریقت کو نہ چھیڑو" (ص ۹۶)

شیخ حسین جسر بھی دراصل خلوتیہ سلسلہ میں بیعت تھے، اپنے والد سے انھیں "خلافت" بھی حاصل تھی استاذ و شاگرد کا یہ اختلاف یہیں ختم نہیں ہوا، شاگرد نے جب مصر پہونچ کر لوگوں کو شیخ بدوی کی قبر کا طواف کرتے اور ان کے نام کی قسم کھاتے دیکھا، اور مصر کی بدعات کے سامنے طرابلس کی بدعات انھیں ہیچ معلوم ہونے لگیں، تو ان کا جوش عمل اور تیز ہوگیا، المنار میں یہ تیزی نمایاں طور پر محسوس ہونے لگی، صاحب سلسلہ استاذ سے نہ رہا گیا، خط و کتابت کے ذریعہ متصوفین کی مخالفت سے روکنے کی کوشش کی، دلیل عجیب انوکھی تھی، کہ شیخ جسر کے خیال میں سید رشید مسلمانوں کے عیوب غیروں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتے تھے، ان کا علم بدعات کو بدعت تسلیم کرنے پر مجبور تھا، لیکن "سلسلہ" کے تعلقات اَب وجد کی تقلید جواز کے دوسرے حیلے تلاش کرنا چاہتی تھی، شاگرد نے استاذ کے مکتوب کا مفصل جواب گیارہ صفحات میں دیا، اور پوری سعادت مندی کے ساتھ لکھا[۱]:-

"میں ابھی تک اپنے کو آپ کا وہی حقیر شاگرد سمجھتا ہوں، اگرچہ آپ نے عالمیت کی سند اور

---

[۱] اس تاریخی خط کی نقل غالبًا صدیق عزیز شیخ عبدالقادر مغربی کے پاس محفوظ ہے،
(رشید رضا)

تدریس کی اجازت سے مجھے سرفراز فرمایا ہے، حضرۃ الاستاذ کو خوب معلوم ہے کہ میں عہد طالب علمی میں بھی کبھی کوئی بات بلا سوچے سمجھے نہیں مانتا تھا، میرے دلائل یہ ہیں...... اگر آپ میری غلطی کا مجھے یقین دلادیں تو اپنی رائے سے مراجعت اور "المنار" میں اس کا اعلان کرنے کو تیار ہوں"۔

(ص، ۹)

استاذ نے خط کے جواب میں خاموشی اختیار کی، لیکن اخبار "طرابلس" میں اپنے قلم سے شاگرد کی تردید کی، اور شاگرد نے "المنار" میں اس کا جواب دیا، آخر تعلقات کشیدہ ہو گئے، اس کے بعد شیخ جسر کا مصر آنا ہوا، تو سید رشید ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے، رخصت کے وقت شاگرد رشید نے استاذ سے نصیحت کی درخواست کی، استاذ نے حسب سابق متصوفین کی تردید سے باز رکھنے کی کوشش کی، شاگرد نے دلیل طلب کی، اس پر گفتگو ختم ہو گئی، اور یہ اختلاف باقی رہ گیا، (ص۹)

سید رشید جب اپنے استاذ کے مقابلہ میں راہ حق سے ذرہ برابر ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھے تو پھر ازہر کی سرکار سے کیوں مرعوب ہوتے، ہم مبتدعین ازہر اور خصوصاً شیخ یوسف دجوی کی خوب خبر لی، شیخ مراغی کے برسر اقتدار ہونے سے پہلے (مجلۃ الازہر) کا نام نور الاسلام تھا، اس زمانہ میں "المنار" کے ایڈیٹر اور شیخ یوسف دجوی (رکن جماعت کبار علمائے ازہر) سے خوب چپقلش تھی، استاذ محترم حضرت شیخ تقی الدین ہلالی مدظلہ (حال پروفیسر بون یونیورسٹی جرمنی) "دجوی" کی مناسبت سے رسالہ نور الاسلام کو "ظلام الاسلام" کہا کرتے تھے، ازہر اور المنار کی جنگ میں تمام علمائے حق نے المنار کا ساتھ دیا، اور رسالہ نور الاسلام کے اس رویہ کی مذمت میں سب متحد اللسان تھے،

مرحوم کا جذبہ جہاد صرف متصوفین اور علماء سوہی تک محدود نہ تھا بلکہ عمائد سلطنت اور ترک حکام کے منکرات کے خلاف اس جذبہ کا اظہار اور زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا تھا، عہد طالب علمی کے اس قسم کے متعدد واقعات اہل طرابلس میں زبان زد تھے، (ص ۹۰-۱۰۲)

سید رشید صرف علمی و قلمی جہاد پر اکتفا نہیں کرتے تھے، عہد طالب علمی میں گاؤں کے مردوں اور عورتوں کو جمع کرتے، اور انھیں سادہ اسلامی عقائد کی تلقین کرتے، مواعظ میں قرآن کریم سے زیادہ استفادہ فرماتے،

"اس کے علاوہ ابن حجر الہیتمی کی کتاب (الزواجر عن اقتراف الکبائر) سے بہت مدد ملتی تھی، یہ کتاب ان کی تمام تصنیفات پر بھاری ہے، مجھے اسی سے پہلے پہل معلوم ہوا، کہ قبروں کی تعمیر و تزیین اور ان پر چراغ روشن کرنا "بدعت و ضلالت" میں داخل ہے، جس کے مرتکبین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کا مستحق قرار دیا ہے، بعض فقہاء سے ہدم قباب منقول ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں"، (ص ۱۰۱)

امام رشید کے گاؤں میں بھی قبریں تھیں، ان پر چراغان بھی ہوتا تھا، مرحوم نے اس کے روکنے کی پوری کوشش کی، اور ایک حد تک کامیاب ہوئے، آس پاس کی آبادیوں میں بھی ان توہمات کا زور تھا، مرحوم نے ان سب کا قلع قمع کر دیا، (ص ۱۰۵)

"یہ سب عہد طالب علمی کی باتیں ہیں، اس وقت تک امام مجدد شیخ الاسلام ابن تیمیہ یا ان کے شاگرد ابن القیم کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری تھی، بلکہ ابن حجر کی فتاوی حدیثیہ میں ان کے خلاف بہت کچھ پڑھ چکا تھا، اور اسے صحیح خیال کرتا تھا، پھر طرابلس میں مشہور مفسر شہاب محمود آلوسی بغدادی کے بیٹے علامہ خیر الدین آلوسی کی (جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین) دیکھی، تو معلوم ہوا، کہ ابن تیمیہ کا مرتبہ ابن حجر ہیثمی سے کہیں بلند ہے، پھر یہ راز کھلا، کہ ابن تیمیہ پر طعن و

۱؎ متوفی ۹۷۴ھ، ۲؎ امام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ، امام ابن قیم متوفی ۷۵۱ھ، ۳؎ ابن حجر الہیثمی ۴؎ شہر طرابلس مقصود ہے، مرحوم پہلے قلموں میں رہا کرتے تھے، ۵؎ شہاب محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ خیر الدین آلوسی متوفی ۱۳۱۷ھ،

تشنیع کے باوجود ان کی کوئی کتاب ہیتمی کی نظر سے نہیں گذری تھی، صرف انھیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ امام ابن تیمیہ متکلمین کی طرح آیات صفات کی تاویل نہیں کرتے، نیز ابن عربی، ابن فارض، ابن سبعین عفیف الدین تلمسانی اور رومی جیسے قائلین وحدۃ الوجود کی مخالفت اور تردید میں ان کا لہجہ سخت ہے، ابن حجر ہیتمی کو صوفیوں کی محبت میں بہت غلو تھا، ابن عربی سے بھی انھیں بہت عقیدت تھی، اشعری اور مقلد ہونے کے باعث ائمہ سلف اور محدثین کے برخلاف متکلمین کی طرح آیات صفات کی تاویل کرتے تھے، اصل یہ ہے کہ انھیں حدیث اور آثار سلف کا کافی علم نہیں تھا، خیر الدین آلوسی نے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں دونوں (ابن تیمیہ او رہیتمی) کے ساتھ انصاف سے کام لیا ہے۔

"وہابیوں کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا، سنی سنائی باتیں کان میں پڑی تھیں لوگ کہتے تھے، وہابی مبتدع ہیں، مسجد نبوی میں انھوں نے اپنے گھوڑے باندھے ... انکے متعلق کوئی سچی بات سب سے پہلے شیخ عبد الباسط فاخوری کی کتاب (تحفۃ الانام مختصر تاریخ الاسلام) میں نظر سے گذری ان کی تاریخ سے تفصیلی واقفیت قیام مصر کے بعد ہوئی" (ص ۱۰۴ - ۱۰۵)

یہ اس دور کے مجاہد اعظم کی مجاہدانہ زندگی کا آغاز تھا، یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں، جب مرحوم مصر نہیں آئے تھے، طرابلس کا ماحول ان کے مناسب نہیں تھا، دوستوں کے مشورہ سے مصر کا قیام اختیار کیا، اور چالیس سال تک مسلسل اعلاے کلمۃ اللہ میں مشغول رہے، ان چہل سالہ کارناموں کی تاریخ لکھنا، دنیاے اسلام کی تمام دینی و سیاسی تحریکوں کی تاریخ لکھنے کی کوشش کرنا ہے،

طلبۂ علم کے لئے سبق صاحب سیرت نے یہ آپ بیتی حالات سے مجبور ہو کر لکھی تھی، ازہر کی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں شیخ محمد عبدہ کی طرح انھیں بھی بدنام کرنے کی پوری کوشش کی گئی، مرحوم نے اپنی برأت کے سلسلہ میں یہ صفحات سپرد قلم کئے تھے، پھر بھی حتی الامکان "خود ستائی" سے قلم پاک رہا ہے، مرحوم نے

اپنے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے بہت زیادہ مشہور عرب لیڈر عبدالحمید زہراوی (جنھیں ترکان احرار کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا) آج سے پچیس سال پیشتر لکھ چکے تھے، زہراوی کی ستایش سند کی حیثیت رکھتی ہے، امیر شکیب ارسلان بھی صاحب سیرت کی زندگی میں ان کے متعلق اتنا کچھ لکھ چکے ہیں، کہ آج بھی اس پر ایک حرف کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا، یہ تو خیر اپنوں کی قدرشناسی تھی، غیروں میں مسٹر چارلس آدمس امریکن عالم و مستشرق نے اپنی کتاب Islam and Modernism in Egypt (صاحب سیرت کے انتقال سے کچھ ہی پہلے لکھی تھی، جس میں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے علاوہ المنار اور صاحب المنار کا تذکرہ مفصل اور شاندار الفاظ میں کیا گیا ہے، کہنا یہ ہے کہ صاحب سیرت مدح و ستایش کے بھوکے نہیں تھے، انھوں نے یہ اوراق اصلاح اور دوسروں کی عبرت کے لئے مرتب فرمائے تھے، خود ان کی ترتیب و استنتاج کے مطابق اس آپ بیتی سے مندرجۂ ذیل اہم سبق ملتے ہیں:۔

۱۔ **مدارس میں زیادہ مدت تک تعلیم حاصل کرنا مفید نہیں** اصل یہ ہے کہ دینی اور ادبی علوم کی تحصیل میں زیادہ وقت صرف کرنے سے غور و فکر کی قوت کمزور ہو جاتی ہے، اور طالب علم کا علم کتابوں کے اندر محدود ہو کر رہ جاتا ہے، مرحوم کی سند میں، شیخ حسین جسر نے تحریر فرمایا تھا، کہ انھوں نے کل آٹھ سال تعلیم حاصل کی ہے، اور اس اثنا میں بھی وہ دوسرے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا،

مدرسوں میں زیادہ عرصہ تک وقت ضائع کرنے سے، ذہانت اور قوت فکر کو جو صدمہ پہنچتا ہے اسکے متعلق امام شیخ محمد عبدہ کی ایک دلچسپ اور سبق آموز رائے سننے کے قابل ہے،

---

۵۱ زہراوی کی تحریر غالباً "المؤید" میں شائع ہوئی تھی، ۵۲ الاسلام والتجدید فی مصر کے نام سے اس کا عربی ترجمہ بھی ۱۳۵۲ھ میں شائع ہو چکا ہے،

مشہور سیاسی مفکر و مصلح شیخ عبدالعزیز شاویش جب پہلے پہل یورپ سے پڑھ کر واپس آئے تو سید رشید رضا مرحوم نے شیخ محمد عبدہؒ کی خدمت میں عرض کی، کہ شاویش کو اپنی مخصوص جماعت کا رکن بنا لیا جائے، محمد عبدہ نے فرمایا کہ "انھوں نے یورپ میں کیا پڑھا ہے"؟ شاگرد رشید نے کہا "ابھی تو دریافت نہیں کیا، لیکن وہ پر جوش اور ذہین نوجوان ہیں"، استاذ کا ارشاد ہوا "اچھا تو کم از کم یہ دریافت کرو کہ انھوں نے مدرسہ دارالعلوم میں داخلہ سے پہلے ازہر میں کتنی مدت گذاری تھی؟ اگر دو چار سال سے زیادہ وہ ازہر میں رہے ہوں گے، تو یقین مانو ان کی ذہنی صلاحیتیں خراب ہو چکیں اور جہل باقی رہ گیا" (ص ۲۵-۱۲۴)

۲- **خلوص نیت اور مقصد کی تعیین** طالب علم کی کامیابی کے لئے نیت کی پاکیزگی، اور مقصد کی تعیین ضروری ہے، صاحب سیرت عہد طالب علمی اور اس کے بعد اپنے مقصد حیات کو کبھی نہیں بھولے، دنیاوی جاہ و ثروت کے آگے کبھی ان کا سر خم نہیں ہوا، دین کی خدمت اور قوم کی اصلاح ان کی زندگی کے خاص مقاصد تھے، اور وہ اس راستہ سے کبھی الگ نہیں ہوئے، ازہر اور علماے ازہر سے سید رشید کو بڑی شکایت یہی تھی، کہ انھوں نے طلب جاہ کی خاطر اپنا اصلی مقصد پس پشت ڈال دیا،

صاحب سیرت کا پختہ عقیدہ تھا کہ طالبین جاہ و ثروت اور علماے سو کے مقابلہ میں دنیا اور اسکی قوتیں مجاہدین اور علماے ربانیین کے سامنے زیادہ جھکتی ہیں، اللہ کے بندے دنیاوی آسایش و راحت پر دائمی خوشی اور ابدی کامرانی کو ترجیح دیتے ہیں، شیخ محمد عبدہ کہا کرتے تھے، "اگر ازہر کی اصلاح کی توقع نہ ہوتی، تو میں حکومت کا عہدہ کبھی قبول نہ کرتا" ان کی زبان سے یہ بھی بارہا سنا گیا، "اگر میں مالدار بننا چاہتا، تو دنیا کے بڑے سرمایہ داروں میں آج میرا شمار ہوتا" (ص ۱۲۶)

عاجز کا تو یہ خیال ہے کہ اس مسئلۂ خاص میں سید رشید رضا اپنے استاذ سے بھی سبقت لے گئے تھے، اور اسی لئے اس مقام پر اہلِ زہر کے متعلق ان کا قلم بہت تیز ہو گیا ہے،

۳- ترکِ تقلید و اجتہادِ فکر سید رشید آغازِ عہد طلب سے استقلالِ فکر کے پرجوش حامی رہے وہ کوئی مسئلہ بلا دلیل قبول نہیں کرتے تھے یہ روش ان کی آخری عمر تک قائم رہی، اسی لئے علم حدیث اور اسکی مختلف شاخوں میں ان کا پایہ اتنا بلند ہوا، ہم طلبۂ علم کو نصیحت فرماتے ہیں:۔

"اے طالب مسلم! خوب ذہن نشین کرلے، فقہ میں جس چیز کو اجتہاد سے تعبیر کرتے ہیں، خواہ اجتہاد مطلق ہو یا کسی ایک مذہب کے اندر اس کا مرتبہ احکام شرعیہ کے استقلالی علم سے کہیں بلند ہے، میں تو تم کو مسائل کی چھان بین میں صرف ذاتی فہم پر اعتماد اور سوچ سمجھ کر (اقتناع) آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہوں، یہ علم کا ادنیٰ درجہ ہے، اس کے بغیر تمھیں کسی فن کا صحیح علم نہیں حاصل ہو سکتا، اگر استقلال فہم کو بھی چھوڑ بیٹھے، تو پھر تم "جہل مطلق" یا "جہل تقلیدی" کے درجہ سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے .... ان لوگوں کی تقلید ہرگز نہ کرنا، جو یہ کہتے ہیں کہ بعض علوم پہلے علماء پر ختم ہو چکے، اور پچھلوں کے لئے صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ بلا سوچے سمجھے ان کی ہر بات مان لیا کریں"

علوم کی ہمہ گیری (الاحاطۃ بالعلم) اللہ کی صفت ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (رب زدنی علماً) کہنے کا حکم ملا، انسان کی لکھی ہوئی کوئی چیز کامل اور آخری نہیں ہو سکتی، علم حدیث کی شاخوں میں جرح و تعدیل، اور "نقد رجال" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں"۔ (صفحہ ۱۳۰)

۴- علم صحیح کی نشانی آخری صدیوں میں جہاں بہت سے عیوب اہل علم میں آگئے وہاں ہٹ دھرمی، اور اپنی رائے پر (غلط یا صحیح) اصرار بھی ہے، سید رشید علماء کے اس عیب کے خلاف سختی سے متنبہ کرتے ہیں، مباحثوں اور قلمی مناظروں میں وہ خود بھی اپنی غلطی کے اعتراف میں خفت محسوس نہیں کرتے تھے، سید رشید کی رائے میں صحیح علم کی نشانیاں یہ ہیں:۔

جہل کا احساس نقص کا اعتراف، زیادتی علم کی ضرورت، ہر چیز سے استفادہ کی خواہش اور عقل و فہم کی مزید تربیت و تثقیف کی حاجت" الخ

راقم الحروف نے اپنے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی شخصیت میں ان نشانیوں کی جھلک دیکھی ہے، حدیث، ادب و لغت اور مختلف علوم میں اعلیٰ دستگاہ کے باوجود وہ آج تک سچے طالب علم ہیں کسی استفسار کے جواب میں "لا ادری" یا "لیس عندی فیہ تحقیق" کہنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں، استاذ ممدوح بھی امام مرحوم کے ہم مشرب اور خاص دوستوں میں تھے، شاید یہ انہی کا فیض ہو، (باقی)

پیام تعلیم (باتصویر) سالگرہ نمبر ۱۹۳۸ء

پیام تعلیم کے سالناموں نے بچوں کے رسالوں میں ریکارڈ قائم کر دیا ہے، ان سالناموں کو بچے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اس سال کا سالنامہ ہم اور بھی احتیاط سے نکال رہے ہیں، اب کی اس میں زیادہ تر مضامین مشغلوں پر ہوں گے، یہ مشغلے اس قدر دلچسپ ہوں گے، کہ بچوں کا پورا سال نہایت دلچسپی سے کٹے گا، اور دلچسپی ہی دلچسپی میں وہ بہت کچھ سیکھ جائیں گے، اس میں فوٹو کی تصویروں کے علاوہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں بھی بیشمار ہوں گی، ان دنوں ہمارے طرز تعلیم میں جو انقلاب ہوا ہے، اس کے اعتبار سے یہ استادوں کے لئے بھی رہنما کا کام دے گا، آپ اپنے بچوں کے لئے ضرور منگوائیے، قیمت صرف: ۸ر

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی۔ لاہور، لکھنؤ،

"منیجر"

آخری شاہانِ تیموریہ کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رفیق دارالمصنفین

بہادر شاہ ظفر

(۴)

مشکل پسندی | مگر ظفر کا زورِ طبع اور کمالِ فن اس وقت نظر آتا ہے، جب وہ نہایت مشکل اور سنگلاخ ردیف اور قافیے اختیار کرتا ہے۔ اسکی مثالیں اس کے دیوان میں اس کثرت سے ہیں، کہ اس مضمون کے محدود صفحے ان کے متحمل نہ ہوسکیں گے، گو سخن شناسی کا تقاضا تو یہی تھا، کہ اس نے جتنے مشکل قوافی میں طبع آزمائی کی ہے، اور جن سنگلاخ زمینوں میں جولانیاں دکھائی ہیں، ان سب کی داد دل کھول کر دی جاتی، مگر ہم تھوڑے سے اشعار پر اکتفا کرتے ہیں

قوافی کی مثالیں:

پارۂ ساغر و شیشہ نہیں ابرک کے ورق ساقیا کیونکر کھون شیشے کو عینک کے ورق

یون ہین تختِ دل سیپارۂ مرا اشک کے ساتھ جیسے قرآن سے ہو ہا تھ مین کودک کے ورق

س غزل مین چومک کے ورق، زردک کے ورق، چشمک کے ورق، مشک کے ورق

بلبک کے ورق وغیرہ بھی قافیے ہین،

ٹکڑے خاک پہ دلہا کے پاش پاش کے بھنک جو چھینکے بھی تو سر راہ اپنی کاش کے بھنک

ہلال عید فلک پر ہو منفعل کیا کیا، زمین پہ ناخن پا تو جو دے تراش کے پھینک

ماش کے پھینک، تلاش کے پھینک، خراش کے پھینک، معاش کے پھینک، قماش کے پھینک کو بھی استعمال کیا ہے،

ترے بیمار غم کا حال ہمدم یہ ناتوانی سے کہ اس نے آج بستر پر ذرا کروٹ نہین لی

بقیہ قوافی نٹ کھٹ نہین بدلی، پٹ پٹ نہین بدلی، چوکھٹ نہین بدلی، جھٹ پٹ نہین بدلی، اٹ سٹ نہین بدلی، وغیرہ،

دل جل گیا ہمارا جگر بھن گیا تمام الفت تمھاری شعلہ رخو بھاڑ مین پڑے

کھڑکاڑ مین پڑے، تاڑ مین پڑے، چوپاڑ مین پڑے، ہڑواڑ مین پڑے، پوچھاڑ مین پڑے دھاڑ مین پڑے وغیرہ،

یہ خانہ باغ ہے موجود سینۂ پر داغ جو سیر دیکھے تو وہ دل کی شہ نشین پہ ٹکے

زمین پہ ٹکے، انگبین پہ ٹکے، آتشین پہ ٹکے، مہ جبین پہ ٹکے، نگین پہ ٹکے، یاسمین پہ ٹکے وغیرہ

اسی طرح مختلف سنگلاخ زمینون مین ظفر نے جو زور طبع دکھایا ہے، وہ خاص اسی کا حصہ ہے، وہ نئی نئی زمینین نکالتا تھا، اور ان مین اشعار کہکر اپنی مشکل پسندی کا اظہار کرتا تھا، اس کے معترف مولینا محمد حسین آزاد بھی ہین، جو ظفر کے تمام کلام کو ذوق کے خوان شاعری کی محض زلہ ربائی سمجھتے ہین، وہ بادل ناخواستہ رقم طراز ہین کہ ظفر شاعری مین طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ تھا،

اس کی ان جدتون کے نمونے بھی اس قدر زیادہ ہین، کہ اس کا ایک ایک شعر بھی نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا، کچھ نمونے ملاحظہ ہون، خط کشیدہ قوافی مین پوری پوری زبانین ہین

جو درد ہوتا تو غل مچاتا جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہے نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

ہم اپنا عشق چمکائیں تم اپنا حسن چمکاؤ کہ حیران دیکھ کر عالم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

زبان میں ہو اثر میری تو شاید دل پھرے اُس سے اگر ناصح دعا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو

بجز رونے کے ہاں چشم عنایت ہو تو کیونکر ہو کہ بے اشک ندامت جوشش رحمت ہو تو کیونکر ہو

رباب و چنگ ہو بزم طرب ہو اور مطرب ہو دف و نے ہو، دہل ہو پھر تو جلیں ہوں تماشا ہو

کس سے انھوں نے مہرووفا کی جس سے لیا دل اس سے دغا کی ان سے ہو کیا امید کرم یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہونگے

شرارہ سے کہتے تھے شعلے شب کو نالوں کے کہ چمکے چرخ پر اختر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

نہیں گل تن پہ عشق دلربا میں پھول کرتے ہیں تماشا ہم نے یہ رنج و بلا میں پھول کرتے ہیں

غم نہیں ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہیں ہم ہے تو ہے سب کچھ میسر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

خالی نہیں خلش سے محبت کے کوئی بھی یاروں کھٹکتی جان میں یہ گل کی پھانس ہے

ظفر کی طبیعت کو مشکل زمینوں میں جولانی دکھانے میں خاص مناسبت تھی، وہ خود کہہ گیا ہے کہ

دل اپنا فکر غزل میں ظفر نہیں لگتا زمین غزل کی نہ ہووے اگر انوکھی سی

اور اس مشکل پسندی کو وہ اپنا امتیاز سمجھتا ہے،

زمین سہل میں تو ہیں سبھی کچھ شعر کہہ لیتے ظفر لکھتے غزل جو ایسی مشکل ہیں تو آپ ہی ہیں

ایک دوسری جگہ کہتا ہے،

ظفر مشکل پسندی تیری سی اب کس کو آتی ہے سخنور دیکھ کر یہ طرز مشکل ہاتھ ملتا ہے

ایک جگہ تو چیلنج دیتا ہے،

ظفر ان قافیوں میں کہہ نہیں سکتا غزل کوئی اگر کہتا بھی ہے تو تجھ سے اصلاح غزل لے ہے

ظفر کی یہ تعلی ایک حد تک بجا ہے، اس کے ہمعصر شعراء میں سے کسی نے بھی ایسے سنگلاخ

قافیون ردیفون اور زمینون مین غزل نہین لکھی ہے، انشا اور شاہ نصیر کے یہان اسکی مثالین ملتی ہین، مگر اتنی نہین،

ظفر اور اساتذۂ فن

ظفر کا زور طبع اسی پر ختم نہین ہوتا، بلکہ ریختہ کے جتنے باکمال شعرا گذرے ہین، ان کی غزلون پر غزلین کہی ہین، ان کی بعض مثالین ملاحظہ ہون،

میر	فائدہ مصر مین یوسف رہے زندان کے بیچ	بھیج دے کیون نہ زلیخا اسی کنعان کے بیچ
ظفر	دم مین دم میرے نہین جان نہین جان کے بیچ	زلف کیا کہتی ہے جھک جھک کے ترے کان کے بیچ
درد	دیکھے جسکو یہان اوسکا اور ہی کچھ دماغ ہے	کرمک شب چراغ بھی گو ہر شب چراغ ہے
ظفر	دنیا فروغ دل مین محبت کا داغ ہے	رہتا بغیر داغ یہ گھر بے چراغ ہے
انشا	بنا کے چھوڑ دون جوا فیون کا شراب مین نب	تو صاف آوے نظر جرم آفتاب مین نب
ظفر	اگر شراب کی موجین نہین شراب مین نب	خط شعاع سے لہرائین آفتاب مین نب
مصحفی	سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن	نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن
ظفر	دیکھے جو ہمارے بت مغرور کی گردن	غلمان کے تن سے ہو جدا حور کی گردن
آتش	ذرہ خورشید ہو پہونچے جو دریا کے پاس	سایہ بن جائے ہما لوٹ کے دیوار کے پاس
ظفر	آبلہ سینہ پہ ہے میرے دل زار کے پاس	یا کہ شیشہ سا دھرا ساقی سرشار کے پاس
ناسخ	ایک شب جو تری محفل مین نہ پائے بار شمع	صبح ہوتے ہوتے ہو مانند رشتہ زار شمع
ظفر	دریا بہائے گر مژہ اشک بار شمع	تو بھی نہ بجھے نہ سوز دل داغدار شمع
شیفتہ	دن سے یہان آنے کی تدبیر ہے،	کیا اثر نالۂ شب گیر ہے،
ظفر	شوق خار دشت دامن گیر ہے	اور مجنون پائے در زنجیر ہے

غالب کا طرز بیان اور ان کی نکتہ آفرینیان اپنی جگہ پر لیکن ایک ہی قافیہ اور ردیف

مین ظفر نے اپنے استاد کی تقلید مین جو اشعار کہے ہین، وہ بھی ذرا سُن لیجئے،

ظفر	غالب
کیا ذکر کچھ کلام مین واعظ کے ہو مزا	ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
محفل میں وصفِ بادۂ و ساغر کیے بغیر	بنتی نہین ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر
واہ اس صورت کدہ مین دیکھتے ہی دیکھتے	سب کہان کچھ لالہ و گل میں نمایان ہو گئین
صورتین کیا کیا نظر سے اپنے پنہان ہو گئین	خاک مین کیا صورتین ہون گی جو پنہان ہو گئین
جس پہ چار آنکھین تری اے آفت جان ہو گئین	وہ نگاہین کیون ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
تیر سی اسکے جگر کے پار مژگان ہو گئین	جو مری کوتاہی قسمت سے مژگان ہو گئین
اے ظفر دل کی پریشانی کا ہی میرے اثر	نیند اسکی ہی دماغ اس کا ہی راتین سکی ہین
یہ جو اس کافر کی زلفین ہین پریشان ہو گئیں	تیری زلفین جس کے بازو پر پریشان ہو گئین
یہان تک ہی ذوق وحشت نور دی کہ دن نکال	اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
مین اپنے بعد مرگ بھی باہر کفن کے پاؤن	ہلتے ہین خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤن

مومن کی ایک غزل کا مطلع ہے،

کہ بنا ہم گہر صفحۂ دریا کاغذ،	نامہ رونے مین جو لکھا تو یہ بھیگا کاغذ

ظفر نے قافیہ کے تغیر کے ساتھ اسی ردیف مین کئی غزلین کہی ہین،

دیا آنکھون سے بھی ہم کو نہ لگانے کاغذ	جوش گریہ کا برا ہو کہ ترے نامہ کو
نہ آئے جب تلک اس یار کی تحریر کا کاغذ	دل بیتاب کو تسکین ہو کیا قاصد کی باتون سے

ظفر سے متقدم اور اس کے معاصر شعرا کی غزلون کے مقابلہ مین جو اسکی غزلین نقل کی گئی ہین ان کا ہرگز یہ منشا نہین کہ

ظفر تیرے سخن کے روبرو کس کا سخن چمکے سخن کی تاب و طاقت ہی نہیں ہے سخندان میں

یا :-

سخنوری میں ظفر کون تم سے ہو ہمسر خدا نے ہے تمھیں دل و دماغ دیا،

بلکہ صرف اس قدر دکھانا مقصود ہے کہ

ظفر کہتے ہیں ہم بھی وضع استادانہ کہتے ہیں

ظفر و میر اوپر غزل سے ظاہر ہے کہ با کمال شعراء کے کلام کے مقابلہ میں ظفر کی طبع آزمائی دکھائی گئی ہے معنوی حیثیت سے بھی اس کے کلام میں مختلف اساتذہ کا رنگ پایا جاتا ہے، میر کے رنگ میں کہتا ہے،

تیرے جس دن سے خاک پا ہیں ہم خاک میں لیک کیمیا ہیں ہم،
تیرہ بختی میں ہیں یہ بخت سفید، کیا مگر سایۂ ہما ہیں ہم
ہم ہیں جوں زلف عارض خوباں گو پریشان ہیں خوشنما ہیں ہم[1]

یہ کراہا ترا بیمار الم درد کے ساتھ کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا
میں وہ مجنون ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا
بالیں پہ اس کے شور مچاؤ نہ ہمدمو نازک بہت ہے عشق کے بیمار کا دماغ
یہاں تلک روئے جدائی میں تری دن رات ہم اشک کی جا چشم سے لخت جگر پیدا ہوا

میر کے طرز پر چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں لکھی ہیں مثلاً

---

[1] اسی قافیہ اور ردیف میں میر کی غزل کا مطلع ہے،

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم، لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم،

میر کی اس غزل پر ظفر نے مخمس بھی لکھا ہے، جو اس کے دیوان جلد اول صفحہ ۱۹۴ پر ملاحظہ ہو،

گور کنج فراغ ہے اپنا داغ اپنا چراغ ہے اپنا،
کون کنج حزن میں ہو مونس ایک دل سوز داغ ہوا اپنا،

دردِ دل درد آشنا جانے اور بے درد کوئی کیا جانے
ہو نمک سود گر نہ زخم جگر دل محبت کا کیا مزا جانے

میر اور ظفر کے ملتے جلتے ہوئے مضامین،

میر کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ
ظفر داغ دل میں آگ لخت دل میں چشم تر میں آگ عشق کی سوزش سے ہے پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ
میر جل جل کے سب عمارت دل خاک ہو گئی کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ
ظفر ہو گیا میں خاک جل کر پڑ رہی ہے سوز دل اپنے دامن کو بچا ہے میری خاکستر میں آگ
میر یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں یہ کیسے عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہے آگ
ظفر جی جلائیں کیوں نہ میرا یہ بتان سنگدل دل ظفر ان کا ہے پتھر اور ہے پتھر میں آگ
میر اللہ ری عندلیب کی آواز دلخراش جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل
ظفر آجائے گر ہوائے گلستان قفس تلک بلبل کا دم ہوا ہو یہ کہکر کہ ہائے گل
میر تیری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہ کہاں کھو یا جگر خون کشتہ دل آزردہ میر اس خانہ ویران کو
ظفر تجھے دل دے کے میں آگا فریب نہ کھو بیٹھا خرد کو ہوش کو طاقت کو جی کو دین و ایمان کو

ظفر میر کے رنگ میں خود میر صاحب کی روح سے خراج تحسین حاصل کرتا ہے،

یہ غزل پڑھتے اگر بزم سخندان میں ظفر کیونکہ تحسین کے لئے پھر نہ سر میر ہلے،

ناسخ و ظفر | ظفر کی قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ وہ متضاد رنگ میں کامیاب طبع آزمائی کرتا ہے،
ناسخ اور میر کا اختلاف ذوق ظاہر ہے، مگر میر کے بعد جب وہ ناسخ کے رنگ کی طرف متوجہ

ہوتا ہے تو وہ رند مشرب عاشق بن جاتا ہے، اور اس کوچہ کا بھی ویسا ہی کامیاب رہ نورد نظر آتا ہے، مثلاً

کرتا ہے قتل وقت جوابِ سخن مجھے
ہنس دینا ان کا اور نہ کہنا جواب سے

اللہ رے شرم آئے جو وہ شب کو خواب میں
پنہاں رکھا حجاب سے منہ کو نقاب میں

کبھی افسوس وہ اور ہم نہ محفل میں بہم بیٹھے
جو ہم اٹھے تو وہ بیٹھے جو وہ اٹھے تو ہم بیٹھے

وصل کی رات نہ باتوں میں گذارو ساری
بس گلے ہو چکے گر ہیں تو سحر پر رکھو

جس کو سمجھے لب پان خوردہ وہ مالیدہ مسّی
مردماں دیکھئے پھولی وہ کہیں شام نہ ہو

ہے ڈوپٹہ سرخ جو وہ رشک گل اوڑھے ہوئے
باغ میں گل برقعِ خجلت میں گل اڑ ہو کے ڈھکے

گلوں کے ہونگے گریباں چاک گلشن میں
رہیں گے بند قبا تیرے گر کھلے کے کھلے

نہیں ہے سرخ وہ موبافِ جعدِ مشکیں پر
بغور دیکھ ظفر ہے بہار شام شفق

جھلک رخسار آتشناک کی بجلی سی کوندی ہے
ہوا کے جھونکے اس عارض پہ جب چلمن ہلاتی ہیں

یہ معاملہ بندی جس طرح ناسخ کے یہاں اعتدال سے بڑھ کر رکیک وسخیف بن گئی ہے، اسی طرح ظفر کے یہاں بعض اوقات بہت ہی مبتذل ہوگئی ہے، مگر اس قسم کے خارجی مضامین میں ناسخ کے ساتھ طبع آزمائی کرکے ظفر اپنی تخیل نگاری اور مضمون بندی کا بھی ثبوت دیتا ہے، مثلاً:۔

ناسخ — کیا اثر پھیلا ہے تیرے روئے آتشناک کا
صورت مجمر ہے دیواروں کے ہر روزن میں آگ

ظفر — حلقۂ زلف میں ہے اس کا رخ آتشناک
بحرِ حسن کی روشن ہوئی گرداب میں آگ

ناسخ — اسقدر سوزش ہے اے جراح میرے زخم میں
لگ اٹھیگی دم میں تنکے کی طرح سوزن میں آگ

ظفر — ہے شرار اشک خوں سے چشم طوفاں زا میں آگ
عشق کی گرمی سے دیکھو لگ گئی دریا میں آگ

ناسخ میری آنکھوں سے اگر بخت دل سوزاں گرے بولے ہمدم دیکھئے ہو آپ کے داماں میں آگ

ظفر تیرے دیوانے کی آنکھوں سے جو ٹپکے اشک گرم کیا تعجب گر لگا دے دامن صحرا میں آگ

آتش و ظفر | اسی طرح آتش کے ساتھ طبع آزمائی کرتا ہے،

آتش مے نے کئے عذار بت شوخ و تنگ سرخ کندن کا اور آگ میں ہوتا ہے رنگ سرخ

ظفر کب چشم سرمہ سا ہے تری مست خواب سرخ اس جام نیلگوں میں ہے رنگ شراب سرخ

آتش دل دوستی بت کا نہ پابند ہو یارب دشمن کا بھی دب جائے نہ پتھر کے تلے ہاتھ

ظفر فرہاد بسر آتا ہے اس عشق سے شیریں پر کیا کرے جو دب گیا پتھر کے تلے ہاتھ

آتش تبدیل شب وصل سے ہو روز جدائی بالش کے عوض ہو سر دلبر کے تلے ہاتھ

ظفر ہے جی میں تمنا یہ کہ سوتے ہیں تو لگا ہے آجائے مرا عارض دلبر کے تلے ہاتھ

آتش مستی میں طلبگار تو ساقی سے ہے مے کا کاٹوں گا میں کانپے گا جو ساغر کے تلے ہاتھ

ظفر دل ہاتھ میں اس کا لیا پر ہے یہ ظفر حال جنبش میں رہے جیسے کہ ساغر کے تلے ہاتھ

آتش پاؤں کو ان کے چھوا میں نے تو ہنس کے کہا کاٹے جاتے ہیں تو ایسے ہی گنہگار کے ہاتھ

ظفر میں نے چوری سے جو شب زلف کو چھیڑا تو کہا کاٹنے چاہئے اس دزد سیہ کار کے ہاتھ

آتش کرتا ہے ناز وہ شہ خوباں نئے نئے آئین تازہ تازہ ہیں فرمان نئے نئے

ظفر ناز و ادا و غمزہ تو ہیں شیوۂ قدیم انداز ان کے اور ہیں اکثر نئے نئے

آتش رخسار خط نکالے گا اس شاہ حسن کا پیدا کرے گا مور سلیمان نئے نئے

ظفر آغاز خط سے کیا ہی نکالے ہیں دیکھنا طوطی باغ حسن نے یہ پر نئے نئے

آتش خاک چھنوا رہی ہے کوچۂ قاتل کی تلاش ساتھ اپنے خراب اپنی قضا پھرتی ہے

ظفر دے کے دل قاتل بے رحم کو پھر ان کیونکر کہ نہ تقدیر پھرے ہے نہ قضا پھرتی ہے

اور کہیں کہیں زورِ بیان میں ظفر آتش سے سبقت لیجاتا ہے، مثلاً

آتش — پھوٹا لحد میں دل کا پھپھولا تو دیکھنا — ہو جائے گا مزار کا آتش کے سنگ سرخ

ظفر — خون جوش میں ہے تیرے شہیدوں کا زیر خاک — نکلا زمیں کے پردے سے جو آفتاب سرخ

آتش — سوزشِ دل کا بیان کچھ کچھ کیا تھا رات کو — موم ہو کر بہ گئی سن کر مرا افسانہ شمع

ظفر — دریا بہائے گرچہ وہ اشکبار شمع — تو بھی بجھے نہ سوزِ دلِ داغدار شمع

آتش — داغِ دل کی روشنی کافی ہے آتش گور میں — غم نہیں اس کا نہ ہوا پنے سرِ مدفن چراغ

ظفر — اس دل جلے کو چاہیے کیا گور کا چراغ — ہے داغِ دل ہی کشتۂ رنجور کا چراغ

آتش — کوتاہی ہے سرشت جو ثابت قدمی سے — آنسو بھی نہ اندیشۂ گلگیر سے ٹپکے

ظفر — ہر اک آنسو کا قطرہ ہے جو دانہ کہربا کا — دمِ گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر نکلے

آتش — جوشِ جنوں نے گو کہ مجھے زرد کر دیا — چہرے کو میرے رکھتے ہیں لڑکوں کے سنگ سرخ

ظفر — ہے میرے اشکِ خون سے ظفر راہِ عشق میں — ہر سنگ ریزہ صورتِ لعلِ خوش آب سرخ

سراپا نگاری سراپا نگاری کا جتنا مکمل نمونہ ظفر کے یہاں ہے، وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں، معشوق کے اوصاف و لوازم کی قلمی تصویر کھینچنے میں اس نے پوری پوری غزلیں کہی ہیں، جن میں زیادہ تر رنگ تو ناسخ و آتش کا ہے لیکن بعض اوقات زبان کی سادگی، بیان کی بےتکلفی، اور خیالات کی برجستگی میں ظفر ناسخ و آتش سے بڑھ جاتا ہے، مثلاً ظفر زلفِ یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دیتا ہے،

کھول کر زلفِ سیہ اس نے جو دیکھا آئینہ — صاف دریا پر نظر کالی گھٹا سی آگئی

کھول دی اس نے عرق افشاں جو وہ زلفِ دراز — کیا زمیں سے جھوم کر بدلی برسنے لگ گئی

زلف کو کھول کے آئینہ جو دیکھا تو نے — رنگ بدلی نے بھی کیا کیا لبِ جیحوں بدلے

ڈھانپ لے منہ کو قمر سے وہین دامانِ سحاب　　تیرے عارض پہ اگر زلف گرہگیر ہلے

زلف اس رخ سی جو سرکی تو یہ سوجھا شب کو　　اے ظفر مہ نکل آیا جو گئی ہٹ بدلی

آتش اور ناسخ نے بھی زلفِ یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دی ہے، مگر ان کے یہان صرف ایک ایک شعر ملا،

آتش　کم نہین کالی گھٹا سے یار کی زلفِ سیاہ　　دیکھ لے طاؤس کا فرکو تو چلانے لگے

ناسخ　ہمیشہ رہتی ہین زلفیں عذارِ تابان پر　　عجب ہے چاند کہ ہوتا نہیں سحاب جدا

زلفِ یار کی ناگن، سنبل اور زنجیر سے تشبیہیں آتش، ناسخ، اور ظفر کے یہان بکثرت ہین، مگر مندرجۂ ذیل اشعار ظفر کی ندرتِ تخییل اور جدتِ طبع کا نتیجہ ہین، جو ناسخ اور آتش کے یہان نہیں،

زلف یون روئے عرق آلودہ پر لہرائے ہے　　صبح جون ناگن گلون پر چاٹنے اوس آئے ہے

زلف یون چہرے پہ بلتی ہی ہوا سے اس کے　　جس طرح مار سیہ کھائے ہو بل پانی کے بل

رُخِ گلنار پر تیرے کہان ہی زلف خم گشتہ　　بہم اے بحرِ خوبی حلقہ گرداب آتش ہے

رُخ گلنار پہ عرق گر ابر تر بن جائیگی　　برق تو میری بھی آہ پر شرر بن جائیگی

ہٹا دو زلف کو تم مصحفِ رُخ سی غضب ہے یہ　　کہ پھیلے سورے قران پاؤن اس کج طبع کافر کے

خدا محفوظ رکھے اس صنم کی زلف سی دلکو　　کہ یہ سیدھا مسلمان اور وہ کج طبع کافر ہی

زلف اس روئے کتابی پر ظفر،　　سورۂ واللیل ہے قرآن مین

مصحفِ رخسار پر کافر ترے گیسو نہین　　ہے تماشا حافظ قرآن ہوئے ہندو ہین

لٹکی عجب انداز سے ہی رخ پہ تری زلف　　ایسا خط تعلیق مین ہمنے لام نہ پایا

خالِ رخِ یار پہ ظفر نے جو مضمون بندی کی ہے، وہ بھی آتش اور ناسخ کے یہان نہین، مثلاً

چشم مست بت مے نوش پہ یہ خال نہین نیلوفر کا ہی دھرا ساغر لبریز پہ گل

خال ہے دنبالہ چشم فسون گر کے تلے نیلوفر کا پھول ہی، یا شاخ عنبر کے تلے

خال رخ پر زلف کب واں سر جنبیدہ ہے شاخ سنبل نیلوفر پہ یہ مگر جنبیدہ ہے

خال اب نہ ترہ زلف سیاہ فام دکھاؤ تارا مجھے مت ایک سر شام دکھاؤ

نہیں رخسار پر اس مہ جبین کے خال کا حل گل خدا جانے کہ یہ کن تیرہ بختون کا ستارا ہے

خال رخ یار کا کشتہ ہون لایا گردش مین ستارا مجھے

دیکھے ہے خال رخ یار کو یون طائر دل دانہ پر جیسے پڑے مرغ ہواگیر کی آنکھ

سورۂ صاد ہے چشم اس کی کہ جس پر یہ ظفر خال سے کاتب قدرت نے بنایا مطلق

اے ظفر اس خال رخ پر بال لفو نکے نہین من سوا پنے ہین یہ کالے لہر کھا کر کھیلتے

یہ سیاہی سے لکھا مضمون خال رخ ترا ہے بیاض ماہ پر تنویر مین لکھا ہوا،

چشم یار کو ناسخ اور ظفر جام سے تشبیہ دیتے ہین، مثلاً

ناسخ کر دیا تری یاد چشم و گردن جانان نے مست سامنے سے ساقیا اب شیشہ و ساغر اٹھا

ظفر ہم کو اس دور مین ہو کیون طلب ساغر ہے یہ تو جب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو،

ناسخ چشم ساقی سے نہ کیون عشق ہو میرے دل کو کون شیشہ ہی بھلا جس کو نہین جام ہی کام

ظفر مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی وہ چشم مست ساقی جام جم ہے،

قامت یار پر ناسخ آتش اور ظفر تینون نے طبع آزمائی کی ہے،

ناسخ کون ہے جو نہیں مرتا ہے تری قامت پر کیون نہ ہو سرو چمن قالب بیجان ہوتا

آتش سرو گڑ جائین گے گل خاک مین مل جائینگے پانوں رکھے تو چمن مین وہ سرفراز اپنا

ظفر صدقے اے رشک چمن اس قد موزون کے ترے سیدھا ایسا کوئی سرو چمنی ہووے تو ہو

نزاکتِ یار پر آتش و ظفر کی شاعرانہ تخیل دیکھئے،

آتش وہ نازنین یہ نزاکت مین کچھ یگانہ ہوا، جو پہنی پھولون کی بدھی تو درد شانہ ہوا

ظفر کیا نزاکت ہو کہ کل عکس در گوش ہو آہ یہ پڑا بوجھ کہ در داس کے ہوا شانے مین

آتش نہ یہ نزاکت پری مین دیکھی نہ حور مین نزاکت آتش جو ہار پھول کا اس نے پہنا تو بوجھ اٹھایا ہزار من کا

ظفر چہ شد اللہ رے نزاکت کہ اگر زلف کا عکس بوجھ ڈالے تو لچکتی وہ کمر اور بھی ہے

ناسخ اور آتش اپنی اپنی جگہ پر مسلم الثبوت استاد ہین، لیکن ظفر کے اشعار مین نمایان خصوصیت یہ ہے، کہ اس کے طرز بیان مین تکلف، تصنع اور آورد نہین، شاید اسی وجہ سے کہہ گیا ہے کہ

اے ظفر ایک ہے تو فن سخن مین استاد کیون نہ قائل ہوں ترے ناسخ و آتش دونون

خاتمہ ظفر کی شاعری پر میری طویل خامہ فرسائی ناظرین کے لئے گران خاطر ہورہی ہوگی، مگر یہ طوالت شاید اس کا ردعمل ہے، کہ ظفر جس نے ہزارون اشعار کہکر اپنے خون جگر کو کاغذ کے صفحون پر بہایا ہے، عام طور سے یا تو ادنی درجہ کا شاعر یا ذوق کا محض زلہ ربا سمجھا جاتا ہے،

انصاف ہی جب اہلِ سخن مین نہ ہو ظفر چاہے سخن کی اپنی کوئی ان سے داد خاک

اسکی شہرت کو سب سے زیادہ نقصان مولانا محمد حسین آزاد سے پہونچا جنھون نے اس کے دیوان کے مجموعون کو سرتاپا "ذوق کی طرف منسوب کر دیا، چنانچہ ایک زمانہ تک اہل نظر بھی اسکی شاعری کو ذوق کی کمائی سمجھکر قابلِ التفات نہیں سمجھتے تھے، لیکن ارباب بصیرت نے اصل حقیقت کو دکھا کر اس غلط فہمی کو دور کیا، اور ظفر ایک مستقل شاعر مانا گیا، پھر بھی غالب مومن اور ذوق کی آوازۂ شہرت کے سامنے اسکی شاعری دب گئی، اس کے علاوہ اہلِ ذوق کی طبیعتین بھی بدل گئین، غالب کی فلسفہ طرازی مومن کی بلند پروازی، اور دونون کی دلنشین فارسی ترکیبون کے سامنے ظفر کی سادگی پھیکی اور بے مزہ ہوگئی،

ظفر کی شاعری مین غالب اور مومن کی معجز طرازیان نہ سہی لیکن قادر الکلامی کا دائرہ اتنا تنگ نہیں جس نے سوز و گداز اور حزن و ملال کا صحیح مرقع کھینچا، اخلاقی مسائل اور صوفیانہ نکات کو عام فہم بنایا، سادگی اور سلاست کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، قلعہ معلیٰ کی زبان اور محاورات کو اپنی شاعری مین محفوظ کیا اور اپنے زور طبع سے پرانے اساتذۂ فن کی یاد تازہ کی، کیا اسکو ہم ایک قادر الکلام شاعر اور استاد نہیں کہہ سکتے ہین ؟

سخن دان و سخن گو یون تو دنیا مین ہزارون ہین ۔۔۔ ظفر پر ہم نے تیری سی سخنگوئی نہین دیکھی

بے شبہہ اوسکی شاعری معائب سے خالی نہین، گو وہ خود تو یہ کہہ گیا ہے،

آج کس اہل سخن کو اس قدر مقدور ہے ۔۔۔ کر سکے جو اے ظفر تیرے سخن پر اعتراض

تاہم جس نے بیس ہزار اشعار کہے ہون، ظاہر ہے کہ وہ سب اچھے نہ ہون گے، اس کے دیوان مین مبتذل اور ادنیٰ درجہ کے اشعار ضرور ہین، خصوصاً جب وہ اپنے رنج والم اور اندوہ و غم کو بھول کر تفریح طبع کے لئے اشعار کہتا ہے، تو اکثر ان کا رنگ بہت ہی شوخ ہو جاتا ہی اور ان کے مضامین جرأت کی معاملہ بندی سے بھی گر جاتے ہین، یا جب وہ محض مشکل قوانی اور سنگلاخ زمینوں کی خاطر شعر کہتا ہے، تو وہ بھی بہت ہی معمولی درجہ کے ہوتے ہین، اس کو احساس تھا کہ مشکل قوافی اور زمینون مین اعلیٰ معیار کا شعر کہنا مشکل ہے،

ظفر ہے تیری غزل کی وہ سنگلاخ زمین ۔۔۔ کہ تیغ فکر سخنور کی دھار گر جائے،

پھر بھی صرف اپنی قادر الکلامی کے اظہار کیلئے غزلین لکھتا ہے، اور اپنی جدت اور ذہانت پر تعلّی کرتا ہے،

جنھیں سخن کا ہے دعوی ذرا کھو ان سے ۔۔۔ کہ ایسی جلد رقم تم کوئی غزل تو کرو

لیکن ظفر کے پورے دیوان پر خود اسی کا ایک شعر بہت ہی جامع تبصرہ ہو سکتا ہے،

کوئی غزل پر اپنی جو نازاں لگے تیری غزل کے ہو — شعر شاد ے اسکو ظفر اک اس مین کا اک آہین کا

یعنی ظفر خود اس کا خواہان تھا، کہ اس کے دیوان کا انتخاب ہو، مگر اسکو نہ خود اتنی فرصت نصیب ہوئی، اور نہ کوئی اس کا قدر دان پیدا ہوا، کہ میر اور غالب کی طرح اس کے دیوان سے بھی اچھے اور عمدہ اشعار منتخب کر کے ایک مجموعہ تیار کرتا، اب بھی اگر کسی صاحب ذوق کی کوشش سے اس کے دیوان کا انتخاب شائع ہو جائے تو یہ کہنے مین تامل نہ ہوگا کہ

پروئے تو نے کیا تار سخن مین گوہر معنی — ظفر تحسین کنان محفل مین اب سارے سخندان ہیں

اور شاید یہ بھی کہ

ترا سخن وہ مزے دار ہے کہ حشر تلک — رہین گے اسکے ظفر طبع نکتہ دان پہ مزے

ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی ایک تاریخی غلطی

از

جناب سید اسد انوری فرید آبادی بی ایس سی

ڈاکٹر بینی پرشاد کی انگریزی کتاب "ہسٹری آف جہانگیر" مطبوعہ ۱۹۲۲ء تاریخ اور سوانح کی ان چند کتابوں میں سے ہے، جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ ہر طرح سے کامیاب ہیں، کیا بلحاظ واقعات کی صحت اور تکمیل اور کیا طرز بیان، ترتیب اور زبان یہ کتاب صحیح معنوں میں اعلیٰ درجہ کی کتاب کہی جانے کی مستحق ہے، اسکی ایک معمولی سی غلطی کو ظاہر کرنے سے یہ مدعا ہرگز نہیں ہے، کہ اوسکی اہمیت میں کسی طرح کی بھی کمی کیجائے بلکہ یہ طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اتنی اچھی کتاب میں کوئی بھی نقص پایا جائے۔ اس کی بلند پایہ تحقیق ہی اسکی مقتضی ہے کہ ایک چھوٹی سی غلطی کا ازالہ بھی کر دیا جائے۔

اکبر کے آخر وقت تاج وتخت کی وراثت کا جو جھگڑا پیدا ہو گیا تھا، وہ گو مشرقی درباروں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی، لیکن اس حیثیت سے یہ نہایت اہم تھا، کہ ہندوستان کی مسلمان بادشاہی میں غالبًا یہ پہلا موقع تھا، کہ وارث تخت وتاج کے انتخاب میں ہندو امرا بھی سازشوں میں شریک تھے، ایک طرف راجہ مان سنگھ کی قیادت میں زیادہ تر راجپوت اور مرزا عزیز کوکا اس کوشش میں تھے کہ خسرو کو تخت پر بٹھا دیا جائے، دوسری طرف چند امرا تخت کے جائز وارث جہانگیر کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے، اکبر کے دربار میں راجپوتوں کا زور تھا، پھر خسرو سے ان کا صلبی تعلق اور ملک کی اکثریت کی ان کے ساتھ ہمدردی، یہ چیزیں جہانگیر کے لئے بہت یاس انگیز تھیں لیکن اس آڑے وقت مین شیخ فرید

سید مرتضیٰ خان بخاری جو اکبر کے عہد میں بعہدۂ میر بخشی ممتاز تھے، جہانگیر کے کام آئے، ابھی اکبر کا انتقال بھی نہ ہوا تھا، کہ شیخ شاہزادہ سلیم کو اپنے گھر لے گئے، اور وہاں چند دیگر امرا کی موجودگی میں جہانگیر کی بادشاہت کا اعلان کردیا، شیخ کی موقع شناسی، سیاست، ہمت، اور سب سے زیادہ ان کی قابلِ احترام واوب ذات، یہ جادو ایسا چلا کہ اس وقت کسی کو اختلاف وانحراف کی ہمت نہ ہوئی لیکن مخالف محاذیوں آسانی سے فتح ہوجانے والا بھی نہ تھا، خسرو آگرے سے نکل بھاگا، اور لاہور تک لوٹ مار کرتا ہوا جا پہنچا، یہ وقت بھی جہانگیر پر کچھ کم سخت نہ تھا، دارالسلطنت میں بھی مخالفت کی آگ سلگ ہی رہی تھی، کہ یہ شعلہ بھڑک اٹھا، اس دفعہ بھی ہر پھر کر جہانگیر کی نظر شیخ فرید پر ہی پڑی اور شیخ کو ایک دستے کے ساتھ خسرو کے تعاقب میں فوراً روانہ کیا، اور خود بھی پیچھے پیچھے ہولیا، ادھر خسرو لاہور سے پلٹا، بھیرون وال کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی، میدان شیخ کے ہاتھ رہا، اور خسرو گرفتار ہوا، شام کو بادشاہ جہانگیر بھی آپہنچا، شیخ سے بغلگیر ہوا، اور شیخ ہی کے خیمہ میں رات گذاری یہاں تک تو سب مورخین کو اتفاق ہے لیکن اس کے آگے ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب نے لکھا ہے،:-

"اگر ایک طرف شاہنشاہ نے غداری اور بغاوت کی سزا میں سخت گیری کو روا رکھا، تو دوسری جانب نمک خواری اور وفاداری کا صلہ بھی بہت فراخدلی سے دیا گیا، شیخ فرید بخاری کو "مرتضیٰ خان" کے عالیشان خطاب سے نوازا گیا، اور مقام فتح یعنی بھیروں وال کا نام فرید آباد رکھ کر بطور جاگیر فاتح (شیخ فرید) کو بخشدیا"..... صفحہ ۱۵۰

حالانکہ واقعہ یہ ہے، کہ اس مقام (بھیروں وال) کا نام فتح کی خوشی میں فتح آباد رکھا گیا تھا نہ کہ فرید آباد،

نہ معلوم ڈاکٹر صاحب موصوف سے اس غلطی کا امکان کیسے ہوا، غالباً شیخ فرید کے نام کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب نے "فرید آباد" کا نام زیادہ قرین قیاس سمجھا لیکن تمام کتب تاریخ

سے بلا شبہ یہ ثابت ہے، کہ اس جگہ کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا، کسی ایک بھی کتاب میں فرید آباد نہیں ہے، ہاں ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب شائع ہو جانے کے بعد سے بعض دوسرے مورخین نے بھی اس غلطی میں ان کی پیروی کی ہے، مثلاً

مہندرا کالج پٹیالہ کے پروفیسر بنرجی صاحب نے جو ڈی لیٹ (De laet) کی کتاب پر نوٹ لکھے ہیں، اس میں انھوں نے دانستہ صحیح نام کو نظر انداز کرکے ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی پیروی میں اس جگہ کا نام فرید آباد لکھا، اسکی تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیے،

پرانی تاریخی کتابوں میں یہ تذکرہ یوں ہے:-

۱- مآثر الامراء، نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان حصہ دویم صفحہ ۹۲۷

"ہمہ روز دو سہ ساعت از شب گذشتہ جنت مکانی بر جناح استعجال رسیدہ شیخ را در آغوش گرفت و در خیمہ او بیتوتت فرمودہ آن مکان را (کہ از پرگنہ بھیروں وال بود) حسب الالتماس شیخ پرگنہ ساختہ بفتح آباد موسوم نمودہ بشیخ عنایت کرد و شیخ را بخطاب مرتضیٰ خان و صاحب صوبگی گجرات بر نواخت"

۲- آئین اکبری، ترجمہ از بلوک مین، ۱۸۷۳ء ایڈیشن،

"بھیروں وال کے پاس جنگ ہوئی، شام کو جہانگیر پہونچا، اور شیخ فرید کو گلے سے لگا لیا، اور شیخ ہی کے خیمہ میں شب گذاری، اس ضلع کا نام پرگنہ فتح آباد رکھا گیا، اور وہ شیخ فرید کو دے دیا گیا"

بھیروں وال پر بلوک مین نے فٹ نوٹ بھی لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:-

De laet از The Empire of the Great Mogal کا ترجمہ S. Bonnerjea حاشیہ از T. S. Hoyland مطبوعہ ۱۹۲۸ء

بھیرون وال یا جواب بھیرووال کے نام سے ہمارے نقشوں میں درج ہے، دریائے بیاس کے داہنے کنارہ پر اس سڑک پر واقع ہے، جو جالندھر سے امرتسر جاتی ہے"۔

۳۔ نامۂ مظفری، از منشی محمد ظفر حسین خان صاحب سلیمانی مطبع مجتبائی لکھنؤ صفحہ ۲۵۶

"اس مقام مقسوم کو جو پرگنہ بھیرون وال مشہور تھا، شیخ کی حسب خواہش پرگنہ فتح آباد سے موسوم کیا"۔

۴۔ ڈی لیٹ (De Laet متوفی ۱۶۴۹ء) نے بھی اپنی کتاب میں ص ۱۰۵ پر یہی لکھا ہے کہ "اس مقام کا نام فتح پور رکھا گیا"۔

ظاہر ہے کہ فتح پور سے مطلب فتح آباد سے ہے، کیونکہ اس سے تو ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کو بھی اختلاف نہیں کہ نام کا آخر جزو "آباد" تھا، نہ کہ "پور" لیکن اس کتاب کے محشی ڈاکٹر بنرجی نے اس پر نوٹ نمبر ۲، اس طرح لکھا ہے "فتح پور اس مقام کا نام بھیرون وال تھا، یہ شیخ فرید کو جو آیندہ مرتضیٰ خاں کہلائے گئے، دیدیا گیا، شیخ فرید نے اس کا نام فرید آباد رکھا" ظاہر ہے کہ مسٹر بنرجی نے بغیر کوئی وجہ بتائے متن کتاب کے نام کو بدل کر ایک نیا نام اپنی طرف سے رکھدیا ہے، اگر مسٹر بنرجی کوشش بھی فرماتے تو سوائے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے ان کو کسی اور جگہ اس مقام کا یہ نام نہ ملتا،

اسی طرح اور کتابوں کے حوالے سے بھی یہ دکھایا جا سکتا ہے، کہ اس مقام کا نام فتح آباد ہی رکھا گیا تھا، ان صریح شہادتوں کے علاوہ قیاس بھی یہی چاہتا ہے، کہ اس جگہ کا نام کم ازکم فرید آباد تو نہیں رکھا گیا ہوگا، کیونکہ شیخ نے اسی زمانے میں دلی کے قریب ۱۰ میل جانب جنوب ایک قصبہ فرید آباد بسایا تھا، جو اب تک آباد اور خوشحال ہے یہ قصبہ ۱۰۱۴ھ میں آباد ہو چکا تھا، جیسا کہ وہاں کی جامع مسجد کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے، جو یہ ہے:-

بعہد شاہ نور الدین جہانگیر شہنشاہے بدین وداد واحسان

اساس دین بنائے خیر بنہاد | فرید عصر و ملت مرتضےٰ خان
بعز و شوکت و جود و سخاوت | خلف ابن الخلف تا شاہ مردان
ز خیر البقاع از فنا ہنوز | پئے تاریخ این جاوید بنہان

اور یہ قرین قیاس ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ ۱۰۱۴ھ میں تو شیخ فرید دلی کے قریب ایک قصبہ فرید آباد کے نام سے بساتے اور شروع ۱۰۱۵ھ میں وہ بھیروں وال کا نام بھی فرید آباد رکھتے یا لکھتے کیونکہ خسرو ذی الحجہ ۱۰۱۴ھ میں آگرہ سے بھاگا تھا، اور ۵۲ روز بعد شیخ نے اس کو بھیروں وال کے مقام پر قید کر لیا تھا،

اس میں شک نہیں کہ ۱۰۱۴ھ میں فرید آباد (دلی) یہاں آباد ہو چکا تھا، خود جہانگیر جب خسرو کے تعاقب میں آگرہ سے شیخ فرید کے پیچھے پیچھے چلا ہے، تو راستہ میں دلی کے قریب فرید آباد میں جمعرات ۱۱ اپریل ۱۶۰۵ء کو قیام کیا، ڈی لیٹ نے بھی آگرہ سے لاہور کی منزلیں گنواتے وقت فرید آباد کے مقام کو دلی سے دس کوس جنوب میں بتایا ہے[۱] غرض یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ شیخ فرید نے بیک وقت دو قصبے فرید آباد کے نام کے بسائے، مختصر یہ ہے کہ قیاس قرینہ اور سب سے زیادہ صریح تاریخی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہے، کہ خسرو کی گرفتاری کے بعد بھیروں وال کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا نہ کہ فرید آباد۔

---

[۱] تزک جہانگیری ترجمہ بیورج صفحہ ۵۶ The empire of the great mogal ص ۵۲

رقعات عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم و ادب سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقایق کا انکشاف ہوتا ہے ضخامت ۶۰۰ صفحات چھپائی لکھائی، کاغذ، بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب، قیمت: ۔ ۔ ۔ "منیجر"

جاپان میں مسلمان

کوبے مسجد کو تسلیم کرانے کی کارروائی

از

پروفیسر برلاس دہلوی استاذ ہندستانی مدرسۃ السنہ خارجہ ٹوکیو (جاپان)

جاپان میں چھ سو سے اوپر مسلمان آباد ہیں جن میں آدھے تاتاری ہیں، جو انقلاب روس کے بعد وہاں سے ہجرت کرکے جاپان میں آباد ہو گئے ہیں، اگرچہ کثرت انہی کی ہے، مگر ان کے راستے میں بہت سی مشکلات حائل ہیں، ان کے لئے سب سے بڑی تکلیف کی بات یہ ہے کہ انھیں استقلال حاصل نہیں، ان کے پاس کسی ملک کا پاسپورٹ موجود نہیں جس کی وجہ سے وہ حقوق شہریت کا مطالبہ نہیں کرسکتے، انھیں صرف یہاں رہنے کی رعایت حاصل ہے وہ کئی شہروں میں بسے ہوئے ہیں، اور چھوٹی موٹی تجارت کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی تعداد ٹوکیو، کوبے اور ناگویا میں ہے،

ان کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا درجہ ہے، جو تعداد میں دو سو کے قریب ہیں، اور سب کوبے میں رہتے ہیں، گو یہ تاتاریوں سے کم ہیں، مگر حالت میں استقلال ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں، یہ سب تجارت میں مصروف ہیں، اور خوش حال ہیں، دوسری قوموں کے مسلمان سو سے کم ہوں گے مگر ان میں سے ہر قوم کے افراد کی تعداد اتنی کم ہے، کہ ان کا کچھ اثر نہیں،

غیر مستقل حالت کے باوجود تاتاری دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ منظم ہیں، انھوں نے اپنی مادی اور روحانی ضروریات کی نگرانی کے لئے الگ الگ لیڈر بنا رکھے ہیں، جن کو سب تاتاری

مانتے ہیں، انھوں نے اپنے بچوں کی دینی تعلیم کے لئے ٹوکیو میں مدرسہ قائم کر لیا ہے، اور دوسرے مسلمان اپنے بچوں کو انگریزی مدارس میں بھیجتے ہیں، اور دینی تعلیم سے غافل ہیں، تاتاری جاہے جس شہر میں ہوں، جہاں وہ پانچ چھ بچے بھی جمع کر سکتے ہیں وہاں انھوں نے مدرسہ قائم کر لیا ہے، انھی مدارس کی عمارتوں میں وہ تہوار مناتے ہیں، عیدین اور جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، ایسے مواقع پر دوسری قوموں کے مسلمان جنمیں ہندوستانی بھی داخل ہیں، ہمیشہ ان مدارس سے استفادہ کرتے ہیں،

کوبے کی مسجد کی تعمیر دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی کوشش کا نتیجہ ہے، مگر انھوں نے صرف مسجد بنانے پر قناعت کی، اس میں اپنی قوم کا کوئی امام یا واعظ نہ رکھ سکے، جو اُن کو ان کی زبان میں دینی مسائل سمجھاتا، یا نیک و بد سے آگاہ کرتا رہتا، اور ان کے بچوں کو دینی تعلیم دے سکتا، یہ سب کام تاتاری انجام دے رہے ہیں، مگر تاتاری امام اور معلمین تاتاری زبان بولتے ہیں، جو ہندوستانی مسلمان نہیں سمجھتے، تاتاری مسلمان اپنی روحانی ضروریات پوری کرنے کے لئے اتنا کچھ کر رہے ہیں مگر انھیں جاپان میں مسجد بنانے کا خیال نہیں آیا،

جاپان میں سب سے پہلے مسجد بنانے کا سہرا ہندوستانی مسلمانوں کے سر ہے، جنھوں نے دس برس پہلے اس کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا، اور تعمیر شروع کرنے کے بقدر روپیہ اکٹھا کرنے میں انھیں پانچ چھ برس لگے، تاتاری مسلمانوں نے بھی حتی المقدور چندہ دیا، دوسری قوموں کے مسلمانوں سے بھی کچھ روپیہ وصول ہوا، مگر دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی ہمت سے یہ کام ہوا، کچھ روپیہ ہندوستان سے مسلمانوں نے بھیجا، بہت سا کوبے کے تاجروں نے دیا، یہ سب کچھ ہوا لیکن اگر جناب فیروز الدین صاحب دہلوی کا دستِ کرم شامل نہ ہوتا تو اتنی شاندار اور خوبصورت مسجد بننی مشکل تھی، کیونکہ نصف سے زیادہ رقم انھوں نے ادا کی ہے، یہ مسجد ۱۹۳۵ء میں مکمل ہوئی اور اسی زمانہ میں اسکی افتتاحی تقریب ہوئی،

مسجد بنانے کا ارادہ مستحکم ہونے کے بعد کوبے مسجد کمیٹی نے اسے مسلمانون کی عبادت گاہ تسلیم کرانے کی کارروائی شروع کر دی، حکومت جاپان کے دستور العمل کی رو سے ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے، مگر پچاس برس ہوئے حکومت کی جانب سے ایک حکم نافذ ہوا تھا جسکی رو سے صرف تین مذہب یعنی شنتو، بدھ اور عیسائی تسلیم کئے جاتے ہیں، اگرچہ اور مذاہب کے پیروؤن کو اپنے طریقہ کے بموجب عبادت کرنیکی اجازت حاصل ہے، کوبے کے مقامی حکام نے تعمیر مسجد میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی، مگر اسے مسلمانون کی عبادت گاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اس صورت میں مسجد کمیٹی والون کے لئے یہ راہ کھلی ہوئی تھی، کہ ٹیکس سے بچنے کے لئے عمارت کی رجسٹری بحیثیت ایک جلسہ گاہ کے کرا لیتے، مگر انھون نے بڑی سمجھداری سے کام لیا، اور اسے عبادتگاہ تسلیم کرانے پر مصر رہے،

چار سال ہوئے مسجد کے افتتاح کی تقریب کے موقع پر اراکین مسجد کمیٹی سے اس مسئلے پر گفتگو کے سلسلے میں میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ توکیو جا کر بڑے بڑے لوگون اور حکومت کے اعلی عہدیدارون سے مل کر کوشش کرین، مگر ابھی ان کو کوبے میں کوشش کرنی باقی تھی، اس لئے انھون نے مجھ سے خواہش کی کہ توکیو آنے کے بجائے سفرائے دول اسلامیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے درخواست کیجائے، کہ وہ اسلام کی خدمت میں ہماری امداد کرین، میں نے اسکی تعمیل کی، میرے معروضہ پر سفرائے دول نے فرمایا کہ ہم امداد کرنے کے لئے آمادہ ہیں لیکن جب تک صحیح واقعات فراہم نہ کئے جائیں، ہم مداخلت نہیں کر سکتے، پچھلے سال مسجد کمیٹی نے میری تجویز پر کوبے میں اعلی پیمانے پر جلسۂ میلاد النبی منعقد کرنے کا انتظام کیا تھا، اور اس میں بڑے بڑے لوگوں اور حکومت کے اعلی عہدیدارون کو شرکت کی دعوت دی تھی، اور مجھ ہی کو جلسے کی صدارت کیلئے مدعو کیا تھا، اس موقع پر میں نے پھر توکیو کی دعوت کا اعادہ کیا، مسجد کمیٹی والوں نے توکیو میں کوشش کرنے کی معقولیت کو تسلیم کیا، مگر کاروبار سے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے آیندہ پر ملتوی کر دیا،

کوبے کے عہدیدار وقتاً فوقتاً ٹیکس کی ادائی کی یاد دہانی کرتے رہتے تھے، اگرچہ کبھی تقاضے میں سختی نہیں کی لیکن اس سال ان کے تقاضے نے بہت سخت لہجہ اختیار کر لیا، اور مسجد کمیٹی والے ٹوکیو میں کارروائی کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنے پر مجبور ہو گئے، انھوں نے مجھے وفد میں شریک ہونے کی دعوت دی، اور اس کی سرپرستی کرنے کی خواہش کی، اور ٹوکیو کا تمام کام میرے سر ڈال دیا کہ میں ہی سفراے دول اسلامیہ کی خدمت میں وفد کی باریابی کا انتظام کر کے وقتِ ملاقات طے کروں، میں ہی بڑے بڑے لوگوں سے ملانے کی کوشش کروں، اور میں ہی اعلیٰ عہدیداروں کی خدمت میں ... کا انتظام کروں، اس کے لئے فرصت اور ... ہی دونوں کی ضرورت تھی، خوش قسمتی ... کی تعطیل تھی، اس لئے میں کوبے مسجد کمیٹی کو پورا ایک مہینہ دے سکا، اگرچہ اس خدمت پر مجھے اپنے مطالعہ اور تحریری کام قربان کرنا پڑا یہ کام توقع سے زیادہ دقت طلب ثابت ہوا، اور مجھے تمام کرنے کی غرض سے عشرہ کے لئے ٹوکیو سے باہر جانا پڑا،

کوبے مسجد کمیٹی کے وفد کو شرف باریابی بخشنے سے پہلے سفراے دول اسلامیہ یہ جاننا چاہتے تھے، کہ اس مسئلہ میں ان کی مداخلت ضروری ہے بھی یا نہیں، اسلئے ان کو اس کی اہمیت جتانی ضروری تھی، چنانچہ بعض سفارت خانوں میں مجھے سخت جد و جہد کرنی پڑی، وفد کو اس بات پر بجا طور سے فخر ہے، کہ ہز ایکسیلنسی خسرو آیدِ سفیر دولت ترکی نے شرف باریابی بخشا، اور امداد کا وعدہ فرمایا، ہز ایکسیلنسی عبدالوہاب داؤدی سفیر دولت ترکی، ہز ہائی ایکسیلنسی حبیب اللہ خان طرزی سفیر دولت افغانستان نے نہایت مہربانی سے وفد سے وعدہ فرمایا، کہ ہم حتی الامکان امداد کرینگے، ہز ایکسیلنسی علی محمد شیبانی قائم مقام سفیر دولت ایران بڑے جوشیلے مسلمان ہیں، اگرچہ وہ بوجہ چند در چند ٹوکیو میں تشریف نہ رکھتے تھے، اور وفد کو شرف باریابی نہ بخش سکے تاہم انھوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میں حتی الامکان کوشش کرونگا،

مجھے چند بااثر جاپانی حضرات کی امداد حاصل کرنے میں بھی توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، یہ حضرات اسلامی ملکوں کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور اعلیٰ حلقوں میں ان کی رسائی ہے، ان کو مسلمانوں کی مشکلات کا احساس ہے، انھوں نے ہمیں یقین دلایا، کہ ہم مسجد کا ٹیکس معاف کرانے اور جاپان میں اسلام کو مذہب تسلیم کرانے کی کوشش کریں گے، بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ ان حضرات سے مسجد کمیٹی کا تعارف کرانا درحقیقت مفید ہوا،

میں نے جناب ماتسوؤ صاحب کا محکمۂ امور مذہبی کے ڈائرکٹر سے بھی جو وزیر تعلیم کے ماتحت ان معاملات میں حکم کا درجہ رکھتے ہیں، ملاقات کا انتظام کیا تھا، میں جناب توزاوا صاحب ڈائرکٹر مدرسۃ السنۂ خارجہ کا نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً کوبے مسجد کے معاملات میں میری بہت اعانت فرمائی، اور جناب ماتسوؤ صاحب سے ملاقات کا انتظام کرنے میں کافی کوشش فرمائی، صاحب موصوف نے وفد کی معروضات بڑی خندہ پیشانی سے سماعت فرمائیں، اور اس ملاقات کی خاطر اوقاتِ دفتر کے بعد بڑی دیر تک ٹھہرے رہے، اگرچہ اس ملاقات کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، تاہم صاحب موصوف نے ہمیں یقین دلایا، کہ حکومت اس معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی ہے، اسلام کوئی اکیلا مذہب نہیں ہے، جو باضابطہ تسلیم کئے جانے سے محروم ہے، بلکہ جاپان میں اور مذاہب بھی ہیں، جو تسلیم کے لئے درخواست کر رہے ہیں، حکومت جملہ معاملات پر وسیع نقطۂ نظر سے غور کر رہی ہے، اور ایک قانون مرتب کرنے میں مصروف ہے، جس سے تمام مشکلات حل ہو جائیں گی، سردست دوسرے مذاہب کو چھوڑ کر ایک مذہب کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا، صاحب موصوف نے ہمیں یہ بھی بتایا، کہ چند روز ہوئے، اسی مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے برطانوی سفارت خانے سے ایک سکریٹری صاحب تشریف لائے تھے،

کوبے مسجد کمیٹی مستحقِ مبارکباد ہے، کہ اس کے وفد نے توکیو میں تین دن کے اندر اس قدر

کام انجام دے لیا، اگر مسجد کمیٹی کو معقول رہنمائی حاصل ہوتی، تو اس میں شک نہیں، کہ اس سے زیادہ کام اور اس سے بہتر طریقے سے انجام پا سکتا تھا، افسوس ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس کے مشوروں میں دخل حاصل نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے فیصلوں میں تنگ نظری کا غلبہ ہے، ٹوکیو میں وفد کا جملہ کام تین دن میں ختم ہوگیا، مگر کوبے میں جو تیاری دفتر میں بیٹھ کر کی جا سکتی تھی، وہ مکمل نہ ہو سکی، باوجود میری یاددہانی کے کوئی تحریری یادداشت مرتب نہیں کی گئی تھی، سفرائے مسلم دول کے یہاں تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا، کیونکہ بہت سی باتیں میری سابقہ ملاقاتوں اور مراسلات میں واضح ہو چکی تھیں، مگر جناب ڈائرکٹر صاحب محکمۂ امور مذہبی کی ملاقات کے وقت ایک تحریری یادداشت پیش کرنی نہایت ضروری تھی،

وفد مرتب کرنے میں مسجد کمیٹی سے ایک سخت غلطی ہوئی، وہ یہ کہ وفد کے جملہ اراکین ہندستانی مسلمان منتخب کئے گئے اور دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو رکنیت سے خارج رکھا گیا، پانچ اراکین میں سے کم از کم دو غیر ہندوستانی مسلمان ہونے چاہئیں تھے، تاکہ اسے عالم اسلامی کی نمایندگی حاصل ہوتی، اس غلطی کی وجہ سے ایک اور غلطی یہ ہوئی، جسے غلط حکمت عملی کہا جا سکتا ہے، کہ وفد کی اس منزل میں سفیر برطانیہ کی خدمت میں سفارش کی درخواست لیکر جانا کوئی دانشمندی کی بات نہ تھی، اس کے لئے بہترین طریقہ یہ تھا، کہ اس معاملہ کو کلیۃً اہل جاپان کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جاتا، اور جب تک اعلیٰ حکام انکاری جواب نہ دیدیتے، اسوقت تک غیر مسلم دول کے سفراء کو تکلیف نہ دی جاتی، شاید جناب مانسوؤ صاحب کو برطانوی مداخلت ناگوار گذری کہ انھوں نے صاف جواب دیدیا، جو جاپانی دستور کے خلاف ہے،

تاہم ہم لوگ ہز ایکسیلینسی سر رابرٹ کریگی صاحب سفیر برطانیہ کے نہایت ممنون ہیں، کہ آنجناب نے ہمارے وفد کو شرف باریابی بخش کر مسلمانوں کے معاملات میں اس قدر دلچسپی کا اظہار فرمایا، اور

بڑی گرمجوشی سے مسجد کے معاملے کو ہاتھ میں لیکر وزیر خارجہ کی توجہ اسکی جانب منعطف فرمائی، مگر ہمیں اس بات کا سخت رنج ہے کہ آنجناب کو وزارتِ خارجہ سے مایوسانہ جواب ملا،

ہم نے کتنی ہی غلطیاں کی ہوں، اور کیسی ہی غلط حکمت عملی برتی ہو، مگر یہ بڑی خوشی کا مقام ہے، کہ وفد کی سعی انجام کار مشکور ہوئی، مارچ کے آخری ہفتے ہی میں بادِ مخالف کا رُخ بدل گیا، اور کوبے کے مقامی حکام کے طرزِ عمل میں ہمدردانہ انداز نظر آنے لگے، وہ اب اس کوشش میں سرگرداں ہیں، کہ مسجد کمیٹی کا بار ہلکا کرنے کی کیا تدبیر کی جائے یقین ہے کہ حل بھی نکل آئے گا، ہم حکومت کے مراحم کے نہایت شکرگذار ہیں،

تابعین

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل ہو، اسلئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہو، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدین، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، امام ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعۃ الرائیؒ، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریحؒ وغیرہ، چھیانوے اکابر تابعین کے سوانح ان کے علمی مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت :- ۵۰۰ صفحے، قیمت :- للعہ

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

تاریخ ہند کی کانگریس کا دوسرا اجلاس

اس کانگریس کا دوسرا اجلاس ۹ ، ۱۰ اکتوبر کو الہ آباد میں بڑی عمدگی اور خوش نظمی کے ساتھ منعقد ہوا، ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نمایندوں کے علاوہ دیگر اصحاب جنھیں تاریخ سے دلچسپی ہے، مختلف مقامات سے آئے تھے، جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب بیان کی گئی ہے، جلسہ سے ایک روز قبل، ۸ تاریخ کو نواح الہ آباد کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے لاریوں اور موٹروں میں مہمانوں کے لیجانے کا انتظام تھا، چنانچہ وہ دن اسی میں صرف ہوا، اسی روز شام کو خان بہادر سید ابو محمد صاحب کی صدارت میں رائے بہادر برایگ دیال نے ایک مضمون ان سکوں پر پڑھا جو حال میں اودھ میں دستیاب ہوئے، مغرب کے بعد مسٹر امچند منچندا نے میجک لینٹرن کے ذریعہ سے لاہور کے شالامار کی عمارات اور باغ کا مظاہرہ کیا، اور لفظ شالامار کی تحقیق پر ایک مفصل لکچر دیا،

۹ اکتوبر کی صبح کو آنربیل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیم نے نمایش کا افتتاح کیا، اس نمایش میں سکہ جات، فرامین شاہی، اور قدیم ایام کی تاریخی تصاویر مختلف کمروں میں بڑی خوبی سے مرتب کی گئی تھیں، یہ نمایش رائے بہادر پنڈت برج موہن ویاس نے بڑی محنت سے مرتب کی تھی، اُسی روز سہ پہر کے وقت ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب بنارس نے ہسٹری کانگریس کا افتتاح

سینٹ ہال میں کیا، اس کے بعد سر ڈگی ڈریک برکمین صاحب چیرمین پبلک سروس کمیشن وصدر استقبالیہ ہسٹری کانگریس نے خطبہ استقبالیہ پڑھا، پھر ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ بھنڈر کا ر نے اپنا عالمانہ خطبۂ صدارت پڑھا، انھون نے اس مین ہندوستان کی قدیم تاریخ پر بحث کی، اور خطبہ کے خاتمہ پر ڈاکٹر سر شفاعت احمد خان صاحب کی اس تجویز کا تذکرہ کیا، کہ ہندوستان کی ایک مکمل تاریخ لکھی جائے، اور اس بات پر زور دیا، کہ اس اجلاس میں اس مسئلہ کا فیصلہ کیا جائے،

اُسی روز شام کو دو شعبہ جات کے اجلاس ہوئے، ایک آثارِ قدیمہ بصدارت رائے بہادر کے این، ڈکسٹ، اس میں سب سے اول خان بہادر مولوی ظفر حسن سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ نے ملا اقبال خان کے ایک کتبہ پر مضمون پڑھا، جو موضع کھیرا متصل دہلی کی ایک قدیم عیدگاہ میں لگا ہے، اور جس کی تاریخ تحریر ۸۰۷ھ ہے، ملا اقبال خان محمود شاہ تغلق کے عہد میں گویا کہ سلطنت کا مالک تھا، اس کتبہ مین مغلوں کے حملے اور دہلی کی بربادی کے حالات مفصل درج ہین، اس کے بعد متعدد مضامین پڑھے گئے،

اسی وقت دوسرے کمرہ میں ماڈرن (زمانہ حال کی) تاریخ کا اجلاس بصدارت ڈاکٹر بال کرشنا پرنسپل راجہ رام کالج کولاپور منعقد ہوا، خطبۂ صدارت کے بعد موصوف نے ایک مضمون پڑھا، جس میں واقعات سے ثابت کیا، کہ ہندوستان میں انگریزوں کی فتح اتفاقی نہ تھی، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد صرف تجارت نہ تھا، بلکہ ابتدا ہی سے تجارت کے ساتھ ملک گیری مدنظر تھی، اس کے بعد سر ی نواس اچاریہ پروفیسر یونیورسٹی انا ملائی، کا مضمون "کرناٹک اور نصیر جنگ" پر ہوا، پھر ڈاکٹر کرشنا سنہا لکچرر کلکتہ یونیورسٹی کا مضمون "حیدر علی کے تعلقات حکومت برطانیہ کے ساتھ" پر ہوا جس میں موصوف نے حیدر علی کے خلاف خوب زہر اُگلا، اور بیان کیا کہ اگرچہ وہ میسور کا نجات دہندہ تھا، مگر اُس نے نوجوان راجہ کو قید میں رکھا تھا حتیٰ کہ اُسے زہر دے کر مار ڈالا، اس کے ذاتی کیرکٹر کی نسبت

کہا کہ وہ لڑکیوں کو مار ڈالتا تھا، اور اُس نے چار ہزار عورتوں سے شادی کی تھی، مگر بعد کے ایک ہندو لکچرر سے جب سوال کیا گیا، تو اُس نے صاف الفاظ میں کہا کہ حیدر علی کی بیویوں کی نسبت جو کہا گیا ہے، اُس میں بہت مبالغہ ہے،

اس کے بعد ڈاکٹر کالی کنکر دت نے ورلبھ رام نائب سراج الدولہ کی نسبت جو مضمون پڑھا، اس میں صاف الفاظ میں کہا کہ اُس نے مثل میر جعفر کے سراج الدولہ کے ساتھ نمک حرامی کی، مسٹر جگدیش نرائن سرکار، پٹنہ کالج نے اپنے مضمون میں سترہویں صدی میں شورے کی تجارت میں انگریزوں کی مداخلت کے حالات بیان کئے، ڈاکٹر اے، ایل سری واستو ڈونگر کالج بیکانیر نے ۱۷۶۵ء کے صلحنامہ واقع الہ آباد پر مضمون پڑھا، جو انگریزوں اور شاہ عالم کے درمیان ہوا تھا، اُس میں انگریزوں کی برتری کو تسلیم کر کے دکھایا، کہ واقعی اہل ہند کمزور تھے، اور اس میں انگریزوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ مراعات کی تھیں، اودھ کی نسبت بتایا کہ وہ آخر تک کمپنی کا وفادار رہا، اسی شعبہ میں دوسرے روز ڈاکٹر پی باسو لکھنؤ نے حکومت اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالی تعلقات پر مضمون پڑھا، جس میں دکھایا کہ انگریزوں نے بنگال کے روپیہ سے جنوبی ہند میں کام کیا، اور اُسی روپیہ کے دباؤ میں نظام کے ساتھ مساویانہ صلح کی، اور انگریزوں کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ مرہٹوں میں باہمی رقابت تھی، خلاصہ یہ کہ خود ہندوستان کے آدمیوں اور روپیہ سے ہندوستان فتح ہوا،

اُسی وقت "ہندوستان کی قدیم تاریخ"، اجلاس بصدارت دیوان بہادر ڈاکٹر کرشنا سوامی آئنگر ہوا، جس میں (۱۹) مضامین تھے، ان میں سے بہت سے پڑھے گئے،

لکچروں کے اختتام پر رات کو ایک مقامی ہندو رئیس کی طرف سے مہمانوں کا ڈنر ہوا، پھر دوسرے روز ۱۷ اکتوبر کو ایک وقت میں تین اجلاس ہوئے،

۱۔ باقی ماندہ قدیم تاریخ کے مضامین،

۲۔ مرہٹوں کی تاریخ کا شعبہ بصدارت پروفیسر وتروامن پوتدار جس میں سات مضامین تھے

۳۔ سکھوں کی تاریخ کا شعبہ بصدارت پرنسپل سیتا رام کوہلی جس میں چار مضامین تھے، مسلمانوں اور سکھوں کا چونکہ مقابلہ رہا ہے، اس لئے قدرتی طور پر ان میں مسلمانوں کی زیادتیاں نمایاں کی گئیں،

ایک نبجے سے ۴ بجے سہ پہر تک "شعبۂ سلطنت" کا اجلاس بصدارت پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا، جس میں دس مضامین تھے، ان میں سے خاص مضامین فیروز شاہ تغلق محمد بختیار خلجی، سفرنامہ ابن بطوطہ فیروز شاہ بہمنی پر تھے، صاحب صدر نے شروع اجلاس میں یہ فرمایا تھا، کہ بجائے کل مضمون پڑھنے کے ان کی خصوصیات بیان کردی جائیں، اور ان پر سوالات ہوں، اس کی وجہ سے اس شعبہ میں عالمانہ بحثیں ہوئیں، اور پروفیسر حبیب صاحب کی ظرافت اور خوش بیانی کی وجہ سے یہ اجلاس پرلطف رہا،

اُسی وقت دوسرے کمرہ میں "شعبۂ تاریخ راجپوت" کا اجلاس بصدارت ڈاکٹر سرندیر ناتھ سین منعقد ہوا، جس مین سولہ مضامین تھے، ان اجلاسون کے بعد ۴ بجے شام کے مہمانوں کا ایٹ ہوم ہوا، پھر رات میں راؤ صاحب سری نواس اچاری کا ایک لکچر "جنوبی ہند کی تاریخ" پر ہوا، اس کے بعد راؤ بہادر کے این ڈکسٹ ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ کا لکچر میجک لینٹرن کی امداد سے ہوا، اور سب سے آخر میں خواجہ محمد احمد صاحب مہتمم عجائب خانہ حیدرآباد دکن کا لکچر میجک لنٹرن کے ذریعہ میسکی کے بارہ میں ہوا،

۱۰ راکتوبر کو جو آخری دن تھا، صبح کے وقت "مغل تاریخ" کا شعبہ بصدارت مسٹر آر۔ پی۔ کھوسلا منعقد ہوا، جس میں دس مضامین تھے، اس کا پہلا مضمون "اورنگزیب اور شہزادہ محمد اکبر کی خط و کتابت"

پر تھا، ہالینڈ کے باشندے ڈاکٹر ہرمن گوئٹز کا مضمون "راجپوتانہ اور مسلمانون کے فن تعمیر" کے بارہ میں تھا، مسٹر این ایل احمد اسمٰعیل کالج اندھیری نے شاہجہان کے زمانے کے دربار کے ایک گروپ پر بحث کی تھی۔ کہ اس میں کن کن درباریوں کی تصاویر اور کس کس زمانہ کی تھین، پروفیسر ایم ایل رائے چودھری بھاگلپوری نے ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ پر سخت جرح کی، اور اُن کے تعصب کو نمایاں کرکے دکھایا،

سید حسن عسکری ایم اے پٹنہ کالج نے شیخ علی حزین کے قیام بنارس وسفر پٹنہ کی تاریخوں کا تعین مختلف خطوط سے بڑی محنت سے کیا، مسٹر رام شنکر اوستی، ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی نے شیر شاہ پر ایک مضمون پڑھا،

اسی روز سہ پہر کو کانگریس کا آخری اجلاس میور کالج میں منعقد ہوا جس میں اول کانگریس کے قواعد پاس ہوئے، اس کے بعد کچھ رزولیوشن پاس کئے گئے، پھر مجلس عاملہ کے ممبروں کا انتخاب ہوا، آخر میں ڈاکٹر ہینڈر کار، پریسیڈنٹ نے اپنی تقریر میں کہا کہ کانگریس کا اجلاس جس میں آٹھ شعبہ جات تھے، بخیر و خوبی ختم ہوا، اور لوگون نے اس میں بڑی دلچسپی لی، اس کے بعد مہمانون کی طرف سے خان بہادر عزیز الحق اسپیکر بنگال اسمبلی نے شکریہ ادا کیا، اور دوسرے اصحاب نے تقریریں کین ختم جلسہ پر اسی مقام پر بڑے اہتمام سے ایک ایٹ ہوم دیا گیا،

پاس شدہ رزولیوشن حسب ذیل ہیں:۔

ا:۔ حسب ذیل ممبروں کی ایک کمیٹی بنائی جائے، جو اس مسئلہ پر غور کرے کہ آیا ہندوستان کی ایک ایسی تاریخ مرتب کیجا سکتی ہے، جو سائنس پر مبنی ہو اور جملہ ضروری امور پر حاوی ہو، یہ کمیٹی کانگریس کے آیندہ سیشن میں اپنی رپوٹ پیش کرے، ممبران یہ ہین:۔

ڈاکٹر ہینڈر کار (پریسیڈنٹ جلسہ) سرجادو ناتھ سرکار، دیوان بہادر ڈاکٹر کرشنا سوامی

آئنگر راؤ بہادر کے این، ڈکشٹ، پروفیسر محمد حبیب، راؤ صاحب سی، ایس سری نواس اچارئی،
پروفیسر کے اے نیلکنٹھ شاستری، پروفیسر ڈی، دی پوتدار، ڈاکٹر ایم، ایچ کرشنا، ڈاکٹر سر سیدرانا تھ
سین، ڈال بال کرشنا، سری جے چندر ودیا شنکر، پروفیسر سری رام شرما، ڈاکٹر سر شفاعت احمد خان
مسٹر وی، آر پوڈ دوال، مسٹر بی وی کرشنا راؤ،

۲۔ مختلف صوبجات اور ریاستون کی گورنمنٹون سے درخواست کیجائے، کہ وہ اپنے اپنے دارالحکومتوں میں مثل دہلی کے ریکارڈ آفس یعنی تاریخی دفاتر قائم کریں، اور ان میں معتبر علمار کو مطالعہ کرنے کی اجازت دین،

۳۔ ڈاکٹر نکولس رویرچ نے تاریخی اداروں اور آثار قدیمہ کی حفاظت کے لئے جو بین الاقوامی معاہدہ تیار کیا ہے، جس کی رو سے یہ چیزین ایام جنگ میں محفوظ رکھی جائیں گی، اُسکی یہ کانفرنس پرزور تائید کرتی ہے،

۴۔ مرکزی اور صوبجاتی گورنمنٹوں سے درخواست کیجائے، کہ ہندوستان کے متعلق جو قلمی دستاویزین، انگلستان، فرانس، ہالینڈ، اور پرتگال میں موجود ہیں، ان کے فوٹو لیکر انھیں دہلی کے مرکزی دفتر تاریخ اور صوبوں کے دارالحکومتوں میں محفوظ کر دین،

مسلمانون کا نقطۂ نظر افسوس کہ اس اہم تاریخی کانگریس میں مسلمانوں کا بہت کم حصہ تھا، جس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی، کہ مختلف یونیورسٹیوں کے اسٹاف میں ہی مسلمانوں کی کمی ہے، یہ مسلم ہے، کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخیں خاص اثرات اور خاص اصول کے تحت میں لکھی گئی ہیں، جو مختلف اقوام میں باہمی منافرت کی موجب ہین، اسی لئے اس کانفرنس میں ایک جدید تاریخ مرتب کئے جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، مگر اس اجلاس میں بعض ہندو مورخون کی ذہنیت کا جو مظاہرہ ہوا اس سے یہ اندیشہ ہے، کہ اب جو تاریخ لکھی جائے گی، کہیں وہ بھی نتائج کے اعتبار سے پہلے سے

بدتر نہ ہو، یہ غنیمت ہے، کہ کانگریس میں کچھ مسلمان پروفیسروں کا بھی حصہ ہے، مگر خود اسی کانفرنس میں ایک مسلمان مورخ نے سکندر لودھی کے بارہ میں جو روایات بیان کین، اور کہا کہ اس نے مندرون کو توڑا، اور ہندوؤں کو ذلیل کیا، اگر اس قسم کی باتیں اس جدید تاریخ میں جگہ پا گئیں تو صدہا سال کے لئے وہ ہندو مسلمانون میں حدفاصل کا کام دیتی رہیں گی، امید ہے، کہ ڈاکٹر سر شفاعت احمد خان اور پروفیسر محمد حبیب جو تاریخی کمیٹی کے ممبر ہین، خاص طور پر اس ضروری امر کو پیش نظر رکھیں گے، ممبران کمیٹی کا جب انتخاب ہو رہا تھا، اس وقت دو اور مسلمانون کے نام پیش کیے گئے تھے، مگر پریسیڈنٹ صاحب نے اس وقت یہ کہہ کر خارج کر دیئے، کہ مسلمانون کے حقوق کی حفاظت کے لئے ڈاکٹر سر شفاعت احمد خان کافی ہین، اس سے بعض مسلمان حاضرین کو مایوسی اور اُن کی دل شکنی ہوئی، مگر حقیقت یہ ہو کہ اس دور میں مسلمانون کو اپنی قلیل تعداد سے ہرگز افسردہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ کمی کی جگہ کیفیت یا نوعیت یا اپنی قابلیت کی طرف زیادہ توجہ کرنا چاہئے، جب کہ ان کی قوم اقلیت میں ہے، تو ہر جگہ ان کی اقلیت ہونا لازمی ہے، البتہ وہ اپنی محنت اور قابلیت سے نمایان ہو کر دوسرون پر غالب آسکتے ہیں، خود اسی کانگریس کے سال حال کے خطبۂ صدارت کو دیکھنا چاہئے، تو وہ تنگ نظری کا ایک نمونہ تھا، جس کی وجہ سے تمام ایڈریس صرف ہندوؤں کے زمانہ قدیم پر محدود رہا، برخلاف اُس کے اس سے پچھلی کانگریس کا خطبۂ صدارت ڈاکٹر سر شفاعت احمد خان کا تھا جس میں ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور پر کشادہ دلی سے بحث کی گئی تھی، اور اس میں ہر مسئلہ پر اس وسعت کے ساتھ نظر ڈالی گئی تھی، جس سے پوری رہنمائی ہوتی ہو، اور تاریخ کے ہر شعبہ کے متعلق ایسی معلومات فراہم کی گئی ہین، اور کتابوں کے نام دیئے گئے ہین، کہ ایک عامی شخص انھیں پڑھکر ایک اچھا خاصا تاریخدان بن سکتا ہے، اسی طرح آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس میں جو ہر سال منعقد ہوتی ہے، اس میں چند مسلمان اس کے اجلاسوں

میں شریک ہو کر وہاں نمایاں حصہ لیتے ہیں، اور اپنی قوم کی عزت کو قائم کرتے ہیں،

پس ضرورت اس امر کی ہے، کہ مسلمان اپنی اقلیت تعداد کے خیال کو جس سے ذہنیت پست ہوتی ہے، بھلا کر ہمت اور جوانمردی کے ساتھ ملک کے تمام علمی اور سیاسی اداروں میں شریک ہو کر وہاں اپنی برتری ثابت کریں،

سب سے آخر میں ہم اس کانگریس کی کامیابی پر ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں صاحب سکریٹری کانگریس کو دلی مبارکباد دیتے ہیں، کانگریس کے تمام کام نہایت عمدگی کے ساتھ مثل ایک مرتب اور مکمل مشین کے انجام پاتے تھے، اور خوبی یہ تھی، کہ چاروں دنوں میں کوئی کسی قسم کی بدنظمی نہیں ہوئی، اور ہر چیز نہایت سکون اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے اپنے وقت پر ہوئی،

(ذوالقرنین، ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

تاریخ صقلیہ جلد اول

مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی، اور اسپین کی طرح اس کو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانچسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہے، کہ اسکی کوئی تاریخ، اردو عربی میں کیا انگریزی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اس کی تاریخ مرتب کی گئی ہے، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اور مسلمانوں کے مصائب اور جلاوطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے،

ضخامت۔ ۵۴۰ صفحے قیمت:۔ للعہ

"منیجر"

اخبارِ علمیہ

برقیہ کی ایک نئی شکل

ماہرینِ طبعیات کی تحقیقات عموماً یا تو سب سے بڑے ذرہ کائنات یا سب سے چھوٹے ذرہ برقیہ سے متعلق ہے، کائنات پر سب سے زیادہ عجیب و غریب تحقیق آئنسٹائن کی ہے، جس کا نظریہ مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ فضار میں روشنی سے زیادہ تیز کوئی اور چیز حرکت نہیں کر سکتی ہے، اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ خواہ جہاں سے بھی شروع ہوتی ہو، اور اس کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، ایک سکنڈ میں ۔۔۔ ۱۸۶۰۰۰ میل جاتی ہے،

برقیہ کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ اس سے قوت کا اخراج مسلسل اور متواتر نہیں بلکہ وقفہ سے ہوتا ہے، سائنس کے علما کی یہ کوشش ہے کہ اضافیت اور برقیہ کے نظریوں میں مماثلت پیدا کیے لیکن آئنسٹائن کو بھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی، اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ برقیہ کی ہیئت اور شکل بالکل نامعلوم ہے، گو ماہرینِ طبعیات نے اسکی شکل قرار دینے کی کوشش کی ہے، ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ ایک چھوٹا اور محدود جرم ہے، جس میں برقی قوتیں بھری ہیں لیکن یہ خیال محض اس پر مبنی ہے کہ مادہ کی تمام کمیت کی ثقل برقی مقناطیسیت پر ہے، لیکن نیوٹرون (Neutron) کے انکشاف سے اس خیال کی تردید ہو گئی ہے، کیونکہ اس ذرہ میں برقی قوت نہیں ہے، دوسرا گروہ اس کو ایک نقطۂ ریاضی سے تعبیر کرتا ہے، جس سے لامحدود قوتیں پھیلتی رہتی ہیں، اگر اس سے

واقعی لامحدود قوتیں پھیلی ہیں، تو پھر اسکی شکل بغیر اصول کے قرار دیدی گئی ہے،

کیمبرج کے ایک نوجوان ماہر طبعیات پول ایڈرین مورس ڈیراک نے برقیہ کی ایک نئی شکل قرار دی ہے، جو مندرجۂ ذیل ہے،

یہ ایک برقی نقطہ ہے جس کی شکل محدود ہے، اس کے دو حصے ہیں، اندرونی اور بیرونی، برقیہ خود ساکت رہتا ہے، مگر برقی مقناطیسی شعاع مثلاً روشنی کی لہر کی جنبش سے اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے، اور قبل اس کے کہ اس جنبش سے برقیہ میں حرکت ہو، برقیہ اس کو محسوس کر لیتا ہے، اور اس میں اسراع پیدا ہوجاتا ہے، تاکہ جنبش سے جو حرکت ہو اس کا توازن قائم رہے، چنانچہ برقیہ کے اندرونی حصہ میں وہ قوت جس سے برقیہ کو جنبش کے پیدا ہونے کا احساس ہوتا ہے، روشنی سے زیادہ تیز رو ہے،

اس سے اضافیت کا نظریہ غلط ہوتا نظر آتا ہے، لیکن ڈیراک کا خیال ہے کہ اضافیت کے نظریہ کو کائنات اصغر (Microcosm) سے تعلق نہیں، اس لئے اس کے نظریہ کے غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے،

قدیم انسان

۱۸۵۹ء میں چارلس ڈارون نے جب اپنا نظریۂ ارتقا پیش کیا تو اس کے مقلدین کو یقین ہوگیا کہ شروع میں انسان کے آباء و اجداد بندر تھے، لیکن انسانیت کے موجودہ علماء نے اس نظریہ کو بالکل غلط قرار دیا ہے، انھوں نے متفقہ طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم انسان اپنے انداز دماغی کیفیت اور دانتوں کی ساخت میں انسان نما بندر سے بالکل مختلف تھے، مثلاً انسان کے دماغ کے اندر کی مختلف لکیریں بندر سے زیادہ اُبھری ہوتی ہیں، چباتے وقت بندر اپنے جبڑوں کو اوپر نیچے حرکت دیتا ہے، لیکن انسان کے جبڑے گھومتے ہیں،

تاریخی عہد کے قبل کی جتنی انسانی کھوپڑیاں ملی ہیں، ان سے اسی قسم کے اختلافات ظاہر ہوئے ہیں، ان میں بعض ایسی ضرور ہیں جنمیں بندر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، مثلاً ۱۸۹۲ء میں سائنس کے ایک ڈچ عالم کو جاوا میں ایک سر ملا جس کے جبڑے بندر کے ایسے اور دانت انسان کے جیسے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سر پانچ لاکھ سال سے کم کا نہ ہوگا، اس سے زیادہ پرانا دوسرا سر اب تک نہیں ملا ہے، اسی طرح ۱۹۲۹ء میں چین کے ایک ماہر انسانیات کو ایک سر ملا جس کی ٹھوڑی بندر اور دماغ اور دانت انسان سے مشابہ تھے، ۱۹۱۲ء میں سسکس (انگلستان) میں ایک سر ملا تھا، جس کی پیشانی چوڑی، ہڈی موٹی، دماغ انسان ایسا اور دانت بندر کے جیسے تھے،

گذشتہ اگست میں انسانیات کے علماء کا ایک جلسہ کیمبرج میں منعقد ہوا، اس میں ٹرانسوال کے عجائب خانہ کے ناظم نے ایک بندر کی ایسی ہڈیوں کا ذکر کیا، جو اسکو جنوبی افریقہ کے ایک خطہ میں ملی ہیں، اس خطہ میں درخت نہیں ہوتے ہیں، اسلئے یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ یہاں کے بندر زمین پر چلتے ہوں گے، مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی چال انسان کی طرح ہوگی، کیونکہ ان کے پاؤں کی ہڈیاں نہیں ملی ہیں، مگر جو ہڈیاں ملی ہیں، ان میں سر کا حصہ گردن سے ملحق ہے، جس طرح عموماً گوریلا اور چمپانزی کا ہوتا ہے، جبڑے بندر کے ایسے اور دانت بالکل انسان کے جیسے ہیں،

ان شواہد کی موجودگی میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ شروع میں انسان بندر تھے، مگر انسانیات کے جدید علماء کا خیال یہ ہے، کہ انسان بندر نہ تھے، بلکہ بندروں کی ایک مخصوص نسل انسانوں سے مشابہ تھی،

ایک عجیب و غریب گھڑی

بلجیم کے ایک گھڑی ساز نے ایک ایسی گھڑی بنائی ہے، جس کو نیویارک کے سائنس و

عجائب روزگار میں شمار کرتے ہیں، اسکی اونچائی ۱۰ فیٹ، وزن ۵۰۰ ۴ پونڈ ہے، اس میں ۹۴ ڈائل، ۱۴ اشین ہین، جو ہیئت کے تمام معلومات فراہم کرتی مین آفتاب اور دوسرے سیارون کی گردش، ماہتاب کا تشکل، خط استوا میں زمین کی رفتار، منطقة البروج میں آفتاب کی حرکت، چاند گرہن اور سورج گرہن سے متعلق تمام معلومات اس گھڑی سے حاصل ہو جاتے ہین، ڈائل کی ایک سوئی جو زمین کے خط مستقیم کی مخروطی گردش سے متعلق ہے، ۲۶۰۰۰ سال میں ایک چکر پورا کرے گی، یہ گھڑی بجلی سے چلتی ہے، اگر بجلی کا خزانہ خراب ہو جائے، تو یہ دو روز تک خود بخود چلتی رہے گی، یہ نیویارک کی نمایش میں پیش کیجائے گی، جہان بائیس صندوقوں میں جہاز سے بھیجی گئی ہے،

سینما کی صنعت

امریکہ کے ایک رسالہ کا بیان ہے، کہ ممالک متحدہ امریکہ میں ہر ہفتہ سینما دیکھنے والوں کی تعداد ۸۰۰۰۰۰۰۰ سے ۸۵۰۰۰۰۰۰ تک ہوتی ہے، اور تمام دنیا کی تعداد ۲۲۰۰۰۰۰۰۰ ہے، سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں فلموں کی تیاری مین ۱۳۵۰۰۰۰۰۰ ڈالر خرچ ہوئے، ہالی ووڈ کے اداکاروں کی تنخواہ ۸۶۰۰۰۰۰۰ ڈالر ہے، ممالک متحدہ میں ۱۸۵۰۰ تھیٹر ہیں، اس صنعت میں ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا ہے،

"ص ع"

فہم انسانی

از مولینا عبد الباری ندوی

یعنی ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب "ہیومن انڈراسٹینڈنگ" کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کے ساتھ اس کے خیالات فلسفہ پر بحث و تبصرہ، حجم ۲۸۰ صفحات، قیمت: عہ

منیجر

مطبوعات جدیدہ

ید بیضا، از جناب ڈاکٹر نجم الدین احمد صاحب جعفری تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۹ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت عہ پتہ:۔ آرمی پریس شملہ،

یہ کتاب مصنف کے مذہبی اور بعض معاشرتی مضامین کا مجموعہ ہے، ان میں قرآن پاک، اسلامی تعلیمات اور سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں کو جدید مذاق کے مطابق پیش کیا گیا ہے، اُن پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ، روشنی ڈالی گئی ہے، جو ہر زمانہ خصوصًا موجودہ دور میں کسی نبی اور الہامی صحیفہ کی صداقت اور کسی مذہب کی حقانیت کا معیار اور اس کے عالمگیر ہونے اور انسانی فلاح کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں، مثلاً اتحاد عالمگیر مساوات طبقات انسانی کی تقسیم اور ان کے ساتھ طرز عمل، مزدور سرمایہ دار اور وطنیت وغیرہ کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، اسی نقطہ نظر سے سیرت پاک کے اصلاحی اور اخلاقی پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے، اور ذات گرامی کو بحیثیت محسن اعظم پیش کیا گیا ہے، افسوس ہو کہ نادانستہ یا جدید مذاق کی رعایت میں بعض آیات کے ترجمہ (ص ۲۷، ۶۳) اور بعض بعض واقعات کی تعبیر میں (ص ۲، ۲۸، ۳۳، ۶۰، ۶۷) نیک نیتی سے لغزشیں ہوئی ہیں، کہیں کہیں بعض نام میں بھی تحریف ہے، جیسے (ابو بن ربیب ص ۶۲) شاید ابن اُبی ہو اس قبیل کی بعض اور فروگذاشتیں بھی ہیں،

نذر ولی، از طالبات جامعہ عثمانیہ تقطیع اوسط ضخامت ۲۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن:

ولی دکنی کے دو صد سالہ جشن میں حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین بھی وہان کے صاحب قلم مردوں

سے پیچھے نہیں رہیں، بلکہ "ولی کی درگاہ" میں ان کی "نذر" مردوں کی نذر سے بڑھ گئی، ولی کی یادگار کے سلسلہ کے بیشتر مضامین نظر سے گذرے، مجموعی حیثیت سے نذر کے مضامین ان سب میں گران پایہ ہیں، اس مجموعہ میں ولی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جامعہ عثمانیہ کی ایم اے کی چار طالبات کے مبسوط و محققانہ مضامین ہیں، "ولی کا تخیل" لطیف النساء بیگم "کلام ولی اور تصوف" نجم النساء بیگم، "ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری" نسیم النساء بیگم، "ولی کا فن شاعری" جہاں بانو بیگم، یہ چاروں مضامین جامعہ عثمانیہ کی طالبات کے ادبی ذوق اور علمی استعداد کا بہترین نمونہ ہیں، ہم نے سب مضامین بالاستیعاب دیکھے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ اس وسعت نظر اور ژرف نگاہی کے ساتھ ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے، ہر مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت جامع اور مکمل ہے، خصوصاً "ولی کا تخیل" نہایت جامع اور مبسوط ہے، تنہا یہی مضمون ولی کی پوری شاعری پر تبصرہ کے لئے کافی تھا، دوسرا مضمون اور حیثیتوں سے بہتر ہے، بلکہ صوفیانہ مصطلحات اور رموز و نکات کے لحاظ سے "رابعہ بصری" کا رسالہ معلوم ہوتا ہے، لیکن ہر شعر کو تصوف کے معنی پہنانے میں نہ کامیابی ہوئی ہے، اور نہ اسکی ضرورت تھی، تیسرے مضمون میں ولی کی معلومات کا دقت نظر سے التفات کیا گیا ہے، چوتھا مضمون فنی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے بہتر ہے، خصوصاً ادبی حیثیت سے بہت خوب ہے، غرض یہ گلدستہ رنگ و بو ہر لحاظ سے ایوان ادب کی زینت بننے کے لائق ہے، یہ چاروں مضامین اس پایہ کے ہیں کہ اگر وہ معزز خواتین کے ناموں سے منسوب نہ ہوتے، تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا، کہ نوآموز طالبات کے ہیں، یا کسی پختہ کار اہل قلم کے پختہ کاری سے قطع نظر ہونہار طالبات نے رنگین اشعار کی شرح میں مردوں کے جذبات تک کا نہایت کامیاب چربہ اُڑایا ہے، ہم جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں،

ذکر غالب، مؤلفہ جناب مالک رام صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۲ صفحے،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

مرزا غالب کے حالات میں مستند مطول کتابیں تو کئی ہیں لیکن کوئی ایسی کتاب ابتک نہ تھی، جو اختصار کے ساتھ جامع اور مستند بھی ہو، جناب مالک رام صاحب نے مذکورۂ بالا کتاب میں غالب کے پورے سوانح اور ان جملہ معلومات اور تحقیقاتوں کو جو اب تک غالب کے متعلق ہو چکی ہیں، اختصار کے ساتھ جمع کر دیا ہے، گویا یہ کتاب اس سارے لٹریچر کا نچوڑ ہے، جو غالب کے متعلق اردو میں فراہم ہو چکا ہے، لائق مؤلف نے بعض جزوی اضافے خود بھی کئے ہیں، اس کتاب میں غالب کی ایک نئی تصویر اور ان کے آگرہ کے مکان "کالا محل" کا جو ابتک موجود ہے، فوٹو بھی ․ یدیا گیا ہے،

قرآن پاک مؤلفہ جناب عبد الواحد صاحب جامعی تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴ر

پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی،

مکتبہ جامعہ بچوں کے لئے جو مفید کتابیں شائع کر رہا ہے، قرآن پاک اُن میں کا ایک مفید تر رسالہ ہے، اس میں بچوں کو بتایا گیا ہے، کہ قرآن کیا ہے؟ اور اس نے کیا کر دکھایا؟ یعنی کلام اللہ کا نزول اس کی تاریخ، اس کے حالات، رسول اللہؐ اور صحابہ کا اس پر عمل، حفظ قرآن، اس کی تعلیم کا انتظام، اس کی کتابت، اشاعت، اعجاز قرآن کے بعض مؤثر واقعات، قرآن سے متعلق بہت سے ضروری معلومات کو جمع کر دیا گیا ہے، ابتدا میں توریت و انجیل، اور نزول قرآن سے پہلے کے کچھ حالات بھی دیدئے گئے ہیں، تاکہ دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں قرآن پاک کی برتری اور اس کی تعلیم کے صحیح اثرات کا اندازہ ہو سکے، زبان نہایت سادہ اور آسان ہے، بچوں کے علاوہ معمولی پڑھے لکھوں کیلئے بھی یہ کتاب مفید ہے،

"م"

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۱

معارف

مجلس المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

سہ دارہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی تھا عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں۔ اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں سے، تقطیع خورد ﷲ و ﷲ، حصہ سوم تقطیع کلاں سلے، للعہ، تقطیع خورد معہ، وعہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں عے، سے، تقطیع خورد مجہ، وعہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ، للعہ،

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۲ | ماہ شوال المکرم ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء | عدد ۶

مضامین

شذرات

غم کمال

آخر اُس عیسیٰ نفس کو بھی موت آگئی جس نے بیمار ٹرکی کو شفا، اور اس کو موت کے پنجے سے چھڑا کر زندگی بخشی تھی، دنیا نے اس کا ماتم کیا، اور عجیب تر یہ ہے کہ انھوں نے بھی اس کا ماتم کیا جنھون نے اس کو تختۂ دار پر چڑھانے مین کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اسکی تلوار نے ہر بیڑی کو کاٹا اور ہر زنجیر کے ٹکڑے کئے اور پرانی ٹرکی کو جلا کر اس کی راکھ سے ایک نئی ٹرکی بنا کر کھڑی کی، سنہ ۱۹۲۰ء مین کون خیال کر سکتا تھا کہ اتحادیون کے پنجۂ ستم سے بچکر یہ شکار صحیح وسلامت نکل آئے گا، مگر اس کی تدبیرون نے آخر ہر تدبیر کو شکست دی، ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا ع

قاہری با دلبری پیغمبری است

ایسا سیاسی پیغمبر اگر کوئی ہوا ہے تو وہ مصطفیٰ کمال اتاترک تھا، جو تاج وتخت، خدم وحشم بادشاہی دربار اور شان وشوکت کے بغیر ملک پر حکمرانی کرتا تھا، اس نے اسلام کے اس سیاسی رنگ کا دھندلا سا منظر پیش کیا تھا جس کے دیکھنے کو خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانون کی آنکھین بیتاب تھین، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت ورحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے۔

ہندوستان کی اسلامی دنیا گذشتہ مہینہ ایک اور صدمۂ عظیم سے دوچار ہوئی، یہ مولانا شوکت علی صاحب کی ناگہانی موت کا سانحہ ہے، یہ وہ شخصیت ہے جس نے تیس برس تک مسلمانون کی خدمت کی، وہ نہ عالم تھے، نہ مقرر تھے، نہ دولتمند تھے، وہ جیسا کہ خود کہا کرتے تھے سپاہی تھے، اَن تھک کام کرنے والے، نڈر، پُر دل اور پرامید، وہ کبھی کسی حال مین ناامید نہین ہوتے تھے، انکی تقریر چند فقرون کی ہوتی تھی، مگر وہ فقرے لوگون مین رُوح پھونک دیتے تھے، وہ اپنے ساتھیون کو بھی کبھی مایوس نہین ہونے دیتے تھے، یہ انھین کا کام تھا کہ ۱۹۲۰ء سے مرتے دم تک سارے ہندوستان کو چھان مارا تھا، تیس برس کی جانکاہ محنت کے بعد موت نے سپاہی کی کمر کھولدی اور وہ ابدی آرام کے لئے دائمی نیند سو گیا، جامع مسجد دلی کی سیڑھیان اس کا خوابگاہ ہین، چشم اعتبار اس کے لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ پائیگی،

زباندانِ محبت بودہ ام دیگرنمی دانم	ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا
حزیں از پاے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم	سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

ندیم گیا، جو صوبہ بہار میں علم و ادب کا پرانا خدمتگذار ہے، وہ ایک سال سے مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین کے ہاتھون مین ہے، وہ چاہتے ہین کہ اس رسالہ کے ذریعہ اپنے صوبہ کی علمی و ادبی خدمت کرین، اس رسالہ کے استحکام اور پریس کے قیام کے لئے انھون نے یہ تجویز کی ہے کہ پچیس پچیس روپے کی یکمشت رقم سو آدمی ادارۂ ندیم کی نذر کرین اور ادارۂ ندیم تاعمر اپنا ماہوار رسالہ اور مطبوعات ان کی خدمت مین پیش کرتا رہیگا، اس تجویز پر عمل کرکے متعدد صاحبون نے اس کی ہمت افزائی کی ہے، مگر ابھی تک مطلوبہ تعداد پوری نہین ہوتی ہے، امید ہے کہ صوبہ بہار کے اہل ہمت اس ادارہ کی امداد کرکے اپنے صوبہ مین علمی و ادبی کام کرنے والون کا حوصلہ بڑھائینگے،

ہمارے پرانے مصنفین اوراہل قلم مین ایک نام مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی کا ہے، موصوف سے میری پہلی ملاقات ۱۹۰۴ء مین اس وقت ہوئی تھی جب لکھنؤ مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا، جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ندوہ مین ٹھہرے ہوئے تھے، اتنے مین ان کی ملاقات کو مولوی عبدالرزاق صاحب آئے، شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "یہ مولوی عبدالرزاق المتخلص بہ البرامکہ ہین" واقعی موصوف البرامکہ کے مصنف ہی کی حیثیت سے معروف ہین، اور ایک زمانہ تھا کہ المامون کے بعد البرامکہ ہماری ادبی کتابون مین سرفہرست تھی،

ایک زمانہ سے موصوف کا نام ہماری علمی دنیا سے اس طرح غائب ہے کہ اکثر لوگ یا تو ان کو بھول گئے، یا یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اس دنیا سے چل بسے، لیکن بحمدللہ کہ موصوف ابھی تک زندہ اور علمی کامون مین مصروف ہین، وہ ایک زمانہ سے ریاست بھوپال مین تحصیلداری وغیرہ کی خدمتون پر رہے اوراب اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال نے ان کو اپنے ہان صیغۂ تاریخ کا مہتمم مقرر فرمایا ہے، مولوی صاحب موصوف نے اس خبر کے ساتھ بجا طور سے یہ مصرع لکھا ہے؛

عید ہوئی ذوق والے شام کو

ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا اجلاس اس سال دسمبر کی آخری تاریخون مین دلّی مین ہو رہا ہے، امید ہے کہ اہل علم مختلف گوشون سے آکر شریک ہونگے، اور اپنے علمی مقالات پڑھین گے، دارالمصنفین کی طرف سے ناظم کے علاوہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین اس مین شریک ہونگے،

مقالات

مقالاتِ شبلی جلد ہشتم

کا

دیباچہ

مولینا شبلی مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ اُن کے متفرق اخباری مضامین، مختلف مفید تجاویز اور منصوبوں پر مشتمل ہے، اس مجموعہ پر سرسری نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑ جاتی ہے، اشاعتِ اسلام، وقفِ اولاد، اوقافِ اسلامی، تعطیلِ نماز جمعہ، مجلسِ علم کلام، اشاعتِ کتبِ قدیمہ، ترجمۂ انگریزی قرآن مجید، تالیف سیرت نبوی وغیرہ مختلف قومی اور مذہبی تجویزیں، انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیں، ان میں سے کچھ کو اپنی کوششوں سے پورا کر دیا، کچھ ایسی تھیں جو مناسب فضا نہ ہونے سے بارآور نہیں ہوئیں،

اشاعتِ اسلام کا کام انھوں نے باقاعدہ شروع کر دیا تھا، اور مجھے میری قومی خدمت کی تعلیم کی غرض سے مددگار ناظم بنایا تھا، یاد ہوگا، کہ ۱۹۱۰ء میں ارتداد کا جو عظیم الشان طوفان اٹھا تھا اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے تھے، ان میں ایک سربرآوردہ نام مولانا مرحوم کا بھی ہے، وہ شاہجہاں پور وغیرہ خود دورہ کو نکلے، راجپوتانہ کے اطراف میں معتمد آدمی بھیجے، ندوہ میں سنسکرت پڑھانے کا انتظام کیا، کئی طالب علموں کو اس درجہ میں داخل کرکے ان کو اس حد تک تیار کیا کہ اسی درجہ کے ایک مسلمان طالب علم نے شاید ۱۹۱۱ء کے ندوہ کے اجلاسِ دہلی میں جب ٹھیٹ ہندی

میں تقریر کی تو حاضرین کو اس کے پیدائشی پنڈت ہونے کا گمان ہوگیا اور وہ اس وقت دور ہوا جب لوگوں نے اس سے قرآن سنانے کی فرمایش کی، اتفاق دیکھئے کہ اس کے قرآن کا لحن بھی نہایت دلآویز تھا، اس وقت اس نے سورۂ رحمٰن کی قرأت اس خوبی سے کی کہ سارا مجمع آئینۂ حیرت تھا، دل سینوں میں تڑپ رہے تھے، اور چاروں طرف سے تعریف و تحسین اور انعامات کی بارش ہورہی تھی،

وقف اولاد کا مسئلہ جس میں سرسیدؔ ناکام رہ چکے تھے، مولانا کی کوششوں سے ایسا کامیاب ہوا کہ حکومتِ وقت کو اس کے آگے سرجھکانا پڑا، اور مسٹر محمد علی جینا کی تحریک سے اسمبلی نے اسکو قانون بنانا منظور کیا،

نماز جمعہ کی تعطیل کے مسئلہ کو اٹھایا، اور اس حد تک اسکو گورنمنٹ سے منوالیا کہ جو مسلمان نماز جمعہ میں جانا چاہیں، وہ ایک مقرر وقت کے لئے جاسکتے ہیں، اسی سلسلہ میں مولینا کی ایک گفتگو یاد آئی جن دنوں وہ اس تحریک کو چلا رہے تھے، فرمایا، بھائی اگر تعطیل منظور ہوگئی، اور مسلمان عام طور سے نماز پڑھنے نہ جائیں، تو اسلام کی کیسی بدنامی ہوگی، جہانتک عام مسلمان ملازمین کا تعلق ہے، ان کا یہ خوف غلط نہ تھا،

ان کی سیرۃ نبوی کی تجویز ایسی سرسبز ہوئی، کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کرسکتی ہے،

عام اوقافِ اسلامی کا کام انھوں نے اخیر زندگی میں شروع کیا تھا، اور ناتمام رہا تھا، مگر اکثر صوبوں میں ان کی ناتمام کوششوں کی آواز بازگشت گونجی، اور سالہا سال کے بعد صوبوں کی حکومتوں نے اسکے متعلق اب کچھ نہ کچھ کیا ہے،

مولینا عملاً سیاسی نہ تھے، مگر اپنے خیالات میں نہایت سخت سیاسی تھے، اتحادِ عالم اسلامی کے وہ سب سے پہلے سفیر تھے، علماء اور رہنمایانِ قوم میں سے سب سے پہلے انہی نے اسلامی ممالک

کا سفر کیا، اور سلطان ٹرکی سے اعزاز کا تمغہ پایا، جب وہ واپس آئے تو انگریزی حکومت نے ان پر کڑی نگرانی رکھی، کئی سال تک وہ جاسوسوں کے نرغہ میں رہے، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عثمانی خلافت اور اتحادِ اسلامی (پین اسلامزم) کے جس سے اوس زمانہ میں بہت کچھ ڈرا جاتا تھا، ہندوستان میں مبلغ ہیں، مسئلۂ آرمینیا پر ان کا مضمون (جو ۱۸۹۶ء میں لکھا گیا) اسی اثر کا نتیجہ ہے،

ٹرکی جانے بلکہ علیگڈہ جانے سے بھی پہلے روم و روس کی لڑائی میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کر کے بھیجا تھا، پھر طرابلس اور بلقان کی لڑائی کے زمانہ میں ان کا جو حال تھا، اُسے اس وقت تک جب تک کہ ان کی نظم شہرآشوب اسلام" جسکی ردیف کب تک" ہے، موجود ہے، بھلایا نہیں جا سکتا، لکھنؤ کے جس جلسہ میں انھوں نے یہ نظم پڑھی تھی، یہ کہنا چاہیئے کہ وہ طرابلس اور بلقان کی ہمدردی کا جلسہ نہ تھا مجلس ماتم تھی، اس زمانہ میں ان پر اتنا گہرا اثر تھا، کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر رو دیتے تھے، اور کبھی کبھی جب کوئی خوشی کی خبر آتی، تو بہت خوش بھی ہو جاتے تھے،

اس زمانہ کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک رات کو کوئی دس بجے کے قریب مجھے اور ندوہ کے بعض طالب علموں کو یاد فرمایا، اس ناوقت کی طلب سے ہم لوگ گھبرا گئے، پہنچے، تو دیکھا، کہ سامنے مصر کے عربی اخبارات پڑے ہوئے ہیں، اور مولانا بہت خوش ہیں، فرمایا کہ بھئی ابھی مصر کے نئے اخبارات پڑھ رہا تھا یہ خبر پڑھکر بہت خوشی ہوئی، کہ ترکوں نے طرابلس کو خودمختار بنایا، اور انور بے نے ترکوں کی فوجی ملازمت سے استعفا دیکر طرابلس کی خودمختار حکومت کی سربراہی قبول کر لی، اکیلے خوشی مناتے نہیں بنتا تھا، اسلئے تم لوگوں کو بلایا، اسکے بعد اسی وقت بازار سے مٹھائی منگوائی، اور ہم لوگوں کو کھلائی،

مولینا کو کالج میں سرسید کے ساتھ رہتے تھے، مگر مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ موصوف کو سرسید کے آخری سیاسی خیالات سے حد درجہ اختلاف تھا، اور اسکو وہ ہندوستانیوں، اور

مسلمانوں کے حق میں بہت مضر سمجھتے تھے بلکہ ملانیہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے، اور اس وقت
اکی کانگریس کے خیالات سے پوری طرح متفق تھے، دونوں بزرگوں کا یہ سیاسی اختلاف
بہت حد تک ان کے تعلقات کو کشیدہ کرنے میں معین ثابت ہوا،

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں جمہوریت اور شخصی بادشاہی کے عنوان پر طالبعلموں
کا مناظرانہ مکالمہ تھا، سرسید، مولینا اور دوسرے استاد بھی شریک تھے، مولینا نے جمہوریت کی تمہید
میں زبردست تقریر فرمائی، جلسہ ختم ہوگیا، اور لوگ اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے، صبح کو جب مولینا
سرسید سے ملے، تو سرسید نے کہا آپ نے مجھے رات بہت تکلیف پہنچائی، رات مجھکو اس وقت
تک نیند نہیں آئی جب تک کہ میں نے آپ کی تقریر کے جواب میں ایک مضمون لکھکر آپ کے
دلائل کی تردید نہ کرلی،

۱۹۱۲ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ اور طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے ہنگاموں کی بدولت
مسلمانوں کے ہیجان کے زمانہ میں سب سے پہلا مضمون جس نے مسلمانوں کے سیاسی خیالات کا رُخ
بدل دیا، مولینا کے قلم سے نکلا تھا جسکی سرخی "مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ" ہے، اسی کے ساتھ
یا اسی کے قریب قریب زمانہ میں دوسرا انقلاب انگیز مضمون نواب وقار الملک مرحوم کا تھا،
جس میں تقسیم بنگال کی تنسیخ پر غم و غصہ کا اظہار تھا، مولینا نے اس مضمون کا ذکر کیا تھا، اور اسکو
"بہادرانہ مضمون" فرمایا تھا،

اس زمانہ میں مسٹر محمد علی جینا کی سرکردگی میں مسلم لیگ نے "سوٹ ایبل گورنمنٹ" کی
تجویز منظور کی تھی، مولینا اس قید کے سخت مخالف تھے، اس وقت مسلم لیگ پر ان کی جو نظمیں
چھپیں، اور جو ان کے اردو کلیات میں موجود ہیں، وہ اُن کے خیالات کی آئینہ دار ہیں، ان
نظموں کو یہ مقبولیت حاصل تھی، کہ جس ہفتہ اخبارات میں ان کی کوئی نظم شائع ہوتی تھی، تو وہ بچہ

بچہ کی زبان پر آجاتی تھی،

مسجد کانپور کے ہنگامہ میں ان کی نظموں نے مسلمانوں کے جذبات میں آگ لگا دی تھی،

ع:- ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں

والی نظم تو ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک ایک ایک مسلمان بچہ کی زبان پر تھی،

سنہ ۱۹۱۲ء میں جو بڑا انقلاب انگیز سال تھا مسلمانوں کی آزادانہ نویسی کا سال آغاز بنتے، جب لاہور سے زمیندار نے رنگ بدلا، اور کلکتہ میں الہلال نمودار ہوا، تو وسط ہند کیسے خالی رہتا چنانچہ لکھنو میں سید میر جان کی کوشش سے مولینا کے زیر مشورہ مسلم گزٹ نکلا، مولینا اس میں کبھی نام سے اور کبھی بے نام مضمون لکھتے تھے، مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کو اسکی اڈیٹری کے لئے مولینا ہی نے بلوایا تھا،

انگریزی ترجمۂ قرآن کی تجویز قریب قریب پوری ہو چکی تھی، نواب عماد الملک بلگرامی نے جو اپنے زمانہ کے بے نظیر انگریزی انشا پرداز تھے، مولینا کی تحریک سے پندرہ پاروں تک ترجمہ کر چکے تھے، جو مطبوعہ مسودہ کی صورت میں اب بھی موجود ہے، پھر مولینا حمید الدین صاحب مرحوم جب دار العلوم حیدرآباد میں پرنسپل ہو کر گئے، تو نواب صاحب نے ان کے مشورہ و استصواب سے اپنے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی کی، مگر نواب صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے یہ مسودہ نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات و تعلیمات سرکار نظام سے منگوانا چاہا تو اس نظر ثانی شدہ مسودہ کا پتہ نہ چلا جس کا بہت افسوس ہے،

صفحہ ۷۰ پر ایک "اہم تجویز" کے نام سے ۱۱ فروری سنہ ۱۹۱۴ء میں دار المصنفین کا تخیل پیش کیا تھا، وہ اسکی فکر میں تھے، کہ اسی سال نومبر سنہ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے وفات پائی، ان کے بعد اس

سیرت سید رشید رضا

(۲)

از

مولینا مسعود عالم ندوی کیٹلاگر اورنٹیل لائبریری پٹنہ وسابق مدیر الضیا

شیخ محمد عبدہ اور سید رشید رضا | دنیا میں نیرنگیِ اخلاق کے نمونے بھی عجیب و غریب نظر آتے ہیں شاگرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو پھولنے پھلنے کے بعد استاذ و مربی کا نام بھی نہیں لیتے اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ہر قول و عمل کی نسبت استاذ کی طرف کرتے ہیں، اور استاذ ہی کو اپنی تمام نیکیوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں، امام سید رشید رضا کا تعلق آخری گروہ سے تھا، وہ مسلسل پینتیس سال "استاذ امام" کا کلمہ پڑھتے رہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ انھوں نے اپنی شخصیت شیخ عبدہ کی ذات میں گم کردی تھی، یہ تم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے، کہ آج امام سید رشید رضا کی توصیف میں شیخ محمد عبدہ کا "خلیفہ" کہنا کافی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ سید رشید مختلف حیثیتوں سے استاذ پر سبقت لے گئے تھے، جیسا کہ اہل نظر[۱] سے پوشیدہ نہیں، یہ موقع اس بحث کا نہیں ہے، بلکہ اُن حالات پر روشنی ڈالنا مقصود ہے جنکے ماتحت طرابلس الشام کا سیدزادہ گھر بار چھوڑ کر مصر کو اپنا وطن بنانے پر مجبور ہوا، اور انتہائی ناموافق ماحول کے باوجود

[۱] راقم الحروف کی یہ رائے عرصہ سے ہے، حسن اتفاق کہ خود امیر البیان نے بھی اپنی ایک تحریر میں ایک گونہ اسکی تائید کی ہے، ان کی رائے میں عقلی علوم اور خطابت میں شیخ محمد عبدہ کا پلہ بھاری تھا، اور نقلی علوم و انشا میں سید رشید کا مرتبہ بلند تھا، (ص ۲۵۵-۶)

اس نے اپنی ساری زندگی خدمت اسلام کے لئے وقف کردی،

سید رشید ابھی طرابلس الشام میں طلب علم کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے، کہ دنیائے اسلام میں سید جمال الدین کا غلغلہ بلند ہوا، پھر کچھ دنوں بعد جب العروۃ الوثقیٰ کی اشاعت ہوئی، تو استعماری قوتوں کی بنیادیں ہلنے لگیں، اہل حق کے دلوں میں جنبش پیدا ہوئی، یہ ایک مقناطیسی قوت تھی، جو نوجوانوں اور جوان ہمت بوڑھوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، سید رشید بھی ان چند سابقین اولین میں تھے، جن کے دل العروۃ الوثقیٰ کی پہلی آواز سے متاثر ہوئے، اور یہیں سے سید جمال الدین اور ان کے دست راست شیخ محمد عبدہ کے ساتھ ان کی عقیدت شروع ہوتی ہے، رفتہ رفتہ یہ عقیدت ولولہ جہاد اور جوش عمل میں تبدیل ہوتی گئی، سید رشید نے پہلے پہل سید جمال الدین کو ۱۳۱۰ھ میں عقیدتمندانہ خط لکھکر استفادہ اور رفاقت کی تمنا ظاہر کی تھی، سید جمال الدین کی صحبت سے استفادہ کا موقع تو مرحوم کو نہ ملا، لیکن شیخ محمد عبدہ سے ملنے کے مواقع برابر ملتے رہے، پہلی ملاقات طرابلس میں ہوئی، گو اس ملاقات میں گفتگو کا موقع کم ملا، لیکن عقیدت مند کی عقیدت میں اور اضافہ ہوگیا، اس کے تھوڑے دنوں بعد شیخ محمد عبدہ پھر طرابلس تشریف لائے، اس مرتبہ قیام ذرا طویل ہوا، اس قیام میں سید رشید برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور ان کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے، مختلف قسم کے سوال کرتے، اور تشفی بخش جواب پاکر خوش ہوتے،[1]

۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۴ھ تک سید رشید کا ذوق و شوق بڑھتا رہا، ابھی سید جمال الدین سے ملنے کی توقع باقی تھی، کہ شوال ۱۳۱۴ھ (مارچ ۱۸۹۶ء) یہ امید ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگئی، مشرق کا بیدار کنندہ سلطان عبدالحمید[2] کی عنایت سے آستانہ میں ہمیشہ کے لئے محو خواب ہوگیا...... اب سید رشید رضا کی

[1] ان ملاقاتوں کی تفصیل تاریخ الاستاذ الامام جلد اول میں ملے گی، [2] سید جمال الدین کی موت کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے، امیر شکیب ارسلان نے سلطان عبدالحمید کو بری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، (ملاحظہ ہو حاضر العالم الاسلامی تذکرہ سید جمال الدین)

تجویز کو عملی صورت میں جس طرح لایا گیا، وہ آپ کے سامنے ہے،

ندوہ کی تعمیرات کی تجویزوں کے سلسلہ میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی، ان کی تجویز کو پڑھکر والی بھاولپور کی جدّۂ محترمہ مرحومہ نے پچاس ہزار روپیہ یکمشت دیدیئے، دارالاقامہ کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ خود انھوں نے اور ان کے متعدد دوستوں نے اپنے اپنے نام کے کمروں کیلئے ایک ایک ہزار دیئے، جن سے ندوہ کے موجودہ بورڈنگ کے کچھ کمرے بنے ہوں گے،

ندوہ کے فارغ شدہ طلبہ کی دستاربندی کا جلسہ جسکی تحریک ص ۴۹۶ پر درج ہے انتہائی کامیابی سے ہوا، یہی جلسہ میری علمی کامیابیوں کا دیباچہ ہے، استاذ نے خوش ہوکر اپنے سر سے پگڑی اتار کر بھرے جلسہ میں شاگرد کے سر پر باندھی، واقعہ کی تفصیلات دارالعلوم کی اس سال کی روداد میں درج ہیں،

قدیم عربی کتابوں کی اشاعت کی جو تجویز انھوں نے ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی، گو اس وقت پوری نہیں ہوئی، لیکن عجیب بات ہے کہ جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انھوں نے لیا تھا، ان میں سے ایک (مناقب شافعی للرازی) کے سوا سب کتابیں انکی زندگی میں چھپ گئیں، اور وہ دائرۃ المعارف جسکے کام سے ان کو مایوسی تھی، ان کے "حبیب صمیم" اور بانی کار کے خلف الرشید اور ان کی درسگاہ کے چند تعلیم یافتوں کے ہاتھوں اسکی ایسی کایا پلٹ ہوئی، کہ اس باب میں مولانا مرحوم کے اکثر ارادے پورے ہو گئے،

علم کلام کی مجلس خط و کتابت سے آگے نہیں بڑھی،

اس میں ایک مضمون المامون کی کسی تنقید کے جواب میں ہے، مولینا مرحوم کی عادت یہ تھی، کہ ان کی کتابوں پر جو تنقیدیں لکھی جاتی تھیں، وہ ان کا جواب نہیں دیتے تھے، اخیر زمانہ میں جب "طالب العلم" کے نام سے ہمارے "فلسفی دوست" مولینا عبدالماجد کی

نہایت سخت تنقید الناظر میں مولینا کی تصنیف الکلام پر شائع ہوئی، تو مجھے سخت غصہ آیا، اور اسی حالت میں میں مولینا کے پاس آیا، اور یہ سمجھا کہ جب میرا یہ حال ہے، تو مولانا کا کیا حال ہوگا، مگر دیکھا، کہ دریا کی سطح بالکل ساکن ہے، میں نے بڑے جوش سے جواب لکھنے کی تجویز کی، تو میری ساری گرم گفتگو کا جواب اس مختصر سے ٹھنڈے فقرہ میں دیا، جو وقت اس میں خرچ کیا جائے، اس میں کوئی اور نیا کام کیوں نہ کر لیا جائے "!

اس کلیہ میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ المامون پر ایک تنقید کا جواب ہے، یہ تنقید اس نوجوان کے قلم سے نکلی تھی، جواب نواب صدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے مخاطب ہیں، مولینا کا جواب ۲۲ فروری ۱۸۸۸ء کے اخبار آزاد لکھنؤ میں شائع ہوا تھا، جس کے اڈیٹر شوق قدوائی مرحوم تھے، جواب کا لہجہ گو تلخ ہے، مگر یہ تلخی کیسی خوشگوار تھی، کہ اسی تعلق سے ایک نے دوسرے کو پہچانا، اور اس کے بعد مولینا کی تصنیفات پر تقریظ و تنقید فاضل شروانی کے بدیع الاسلوب قلم کا دلچسپ کارنامہ بن گئی،

یہ مضامین جو متفرق اخباروں اور رسالوں سے بمشکل جمع کئے گئے ہیں، حق یہ ہے کہ اس مشکل کام کی انجام دہی کا سہرا مولینا کے ایک معتقد ندوی مولوی معین الدین صاحب قدوائی (بارہ بنکی) کے سر ہے، اب اتنے دنوں میں وہ کچھ سے کچھ ہوگئے، اور زمینداری کے کاروبار نے اس مذاق سے ان کو دور کر دیا ہے، مگر ان کا یہ کام یادگار رہے گا،

بیتابی بڑھی، والدین کو کسی نہ کسی طرح راضی کرکے چپ چاپ مصر پہنچ گئے، اور شیخ محمد عبدہ کی خدمت میں یک بیک حاضر ہوئے، اور صاف صاف عرض مدعا کیا،

میری غرض صرف آپ سے استفادہ کرنا ہے، میری رائے میں آپ ہی مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا ہیں" (ص ۱۷۱)

گفتگو دیر تک رہی، شیخ نے فرمایا "مسلمان تو اپنے مستقبل سے مایوس ہیں، صرف مجھے انکی کامرانی کا پورا یقین ہے، میرے علاوہ مصر میں صرف ایک[1] آدمی ایسا ہے، جس سے آدھی توقع ہے"

اس گفتگو کے بعد استاذ و شاگرد میں روزانہ مبادلۂ خیالات ہونے لگا، دونوں اکثر مسائل میں متفق الرائے تھے، فرقۂ بہائیہ اور بعض دوسرے مسئلوں میں اختلاف بھی تھا، رفتہ رفتہ تعلقات مستحکم ہوتے گئے، آخر شعبان ۱۳۱۵ھ میں "المنار" کے اجرا کی تجویز بھی مرتب ہو گئی، سید رشید نے استاذ امام کی نگرانی قبول کی، پیر و مرید کی طرح دونوں میں معاہدہ ہوا، استقلال فکر کے سرگرم حامی، شاگرد کا عہدنامہ سننے کے لائق ہے:-

"میں عہد کرتا ہوں کہ صوفیوں کے طریقہ کے مطابق ایک مرید کی طرح آپکا تبع رہوں گا، لیکن میری ایک شرط ہے، جس کا حق مجھے برابر حاصل رہے گا، وہ یہ کہ جو بات میری عقل سے باہر ہو گی، اسکی حکمت دریافت کروں گا، اور جو چیز میرے سمجھ میں نہیں آے گی، اسے قبول نہیں کروں گا، اور وہی کام کروں گا، جسکے فائدہ کا مجھے یقین ہو گا"

"ان اسال عن حکمۃ مالا اعقلہ ولا اقبل الا ما افھمہ ولا افعل الا ما اعتقد فائدتہ" (ص ۱۰۵)

"المنار" کے اجراء کے بعد علمی و اصلاحی اتحادِ عمل کے ساتھ ساتھ ذاتی تعلقات بھی گہرے ہوتے گئے،

---

[1] یہ شیخ عبدالکریم سلمان کی طرف اشارہ تھا، (سید رشید)

شیخ محمد عبدہ کا اعتماد شاگرد پر اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام راز کی باتیں ان سے کہتے، نجی امور میں مشورہ کرتے، اخبارات میں بعض مضامین کی ان کے ذریعہ خفیہ تردید کراتے، انھیں شاگرد سے صرف ایک مسئلہ میں اختلاف تھا، وہ ترکی حکومت کے خلاف کچھ لکھنا پسند نہیں کرتے تھے، سید رشید قلم کو روکتے تھے لیکن کبھی کبھی جذبات استاذ کی نصیحت پر غالب آجاتے، مرحوم نے خود کسی جگہ لکھا ہے۔

"عثمانی حکومت کے خلاف جی بھر کے لکھنے کا موقع استاذ امام کی وفات کے بعد ہی ملا۔[۱]

رجب ۱۳۱۵ھ میں یا اسکے لگ بھگ سید رشید استاذ امام کی خدمت میں مصر حاضر ہوئے، ۱۳۲۳ھ میں شیخ محمد عبدہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، شاگرد رشید جذبہ شوق میں مصر گیا تھا، چنانچہ ذوق خدمت میں وہیں کا ہو رہا، بارہ سال کی رفاقت میں محمد عبدہ اور رشید رضا کی روحیں تحلیل ہو کر باہم ایک ہو گئی تھیں، مرض الموت میں شیخ محمد عبدہ کے دل سے کچھ شعر نکلے، جو ان کے خیالات کا آئینہ اور استاذ و شاگرد کے باہمی تعلق و وحدت فکر کے بہترین شاہد ہیں"۔

ولستُ اُبالی ان یقال محمد أبَلّ او اکتظت الیہ المآتم

مجھے اس کی پروا نہیں، کہ محمد عبدہ کی صحت کی خبر دی جائے یا اس کے ماتم میں خلقت کا ہجوم ہو

ولکنہ دین اردت صلاحہ أحاذر ان تقضی علیہ العمائم

لیکن (صرف) "دین" کا خیال ہے، جس کی بھلائی کی میں نے (کچھ) کوشش کی، ڈر ہے کہیں "عمامے" (علماء) اس کا خاتمہ نہ کر دیں،

فیارب ان قدرت رُجعی قریبۃ الی عالم الارواح وانفض خاتم

الٰہی اگر میرا سفر آخرت قریب ہے، اور اگر میری زندگی کا سر بمہر لفافہ ٹوٹ چکا ہے،

فبارک علی الاسلام وارزقہ مرشدا رَشیدا یضیٔ النہج واللیل قاتم

تو اسلام پر نگاہ کرم کر، اور اسے (یعنی دین اسلام کو) ایسا "رشید" (صالح)، رہنما عطا کر، جو رات

[۱] المنار ۱۳۲۳ھ،

(گمراہی) کی تاریکیوں میں (لوگوں کو) راہِ حق دکھلا سکے۔ (ص ۱۸۰)

مشہور ہے کہ جب سید رشید کے استاذ الاستاذ اور شیخ محمد عبدہ کے مرشد حکیم مشرق امام الاحرار سید جمال الدین افغانی کو مصر چھوڑنا پڑا، تو لوگوں نے دریافت کیا "آپ ہمیں کیا کہتے ہیں؟ اور پوری قوم کو کس پر چھوڑتے ہیں؟" جواب ملا "محمد عبدہ کو چھوڑ رہا ہوں، وہ مصر کے لئے کافی ہے"۔ حکیم مشرق کے قول کی تصدیق مصر کی گذشتہ چالیس سالہ تاریخ دیکھتی ہے، اسی محمد عبدہ کے آغوشِ تربیت میں سعد زغلول، عبدالکریم سلمان، عبدالعزیز شاویش، قاسم امین، شیخ علی یوسف پروان چڑھے، اور پھولے پھلے، اور شیخ محمد عبدہ کے شاگردوں ہی کے ہاتھوں مصر کے سیاسی واجتماعی انقلابات کی تکمیل ہوئی، شیخ محمد عبدہ کے رفیق اور تحریکِ عرابی کے سرگرم لیڈر، مشہور ادیب و وزیر محمود سامی باشا بارودی جب سیلون کی جلاوطنی سے مصر واپس گئے، تو انھوں نے بھی بالکل اسی طرح شیخ محمد عبدہ سے پہلی ملاقات میں سوال کیا:

"سید جمال الدین ہم لوگوں کیلئے آپ کو چھوڑ گئے تھے، آپ نے اُن کے بعد اصلاح کا علم بلند رکھا، مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آپ کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ نہ جائے، فرمایئے آپ کے بعد کوئی ہے؟ جس سے اصلاح و تجدید کی امیدیں وابستہ کی جا سکیں"۔

استاذ امام نے فرمایا:-

"ہاں، میرے پاس ایک شامی نوجوان ہے جو میرے بعد کام کو سنبھال لے گا، میں اُسے آپ کی خدمت میں تعارف کیلئے بھیجوں گا"۔

اُستاذ نے شاگرد سے خود اس گفتگو کا تذکرہ کیا، اور سید رشید محمود سامی بارودی سے ملے اور اتنے تعلقات بڑھے کہ بارودی بھی اس شامی نوجوان کے قدرشناس بلکہ ایک اعتبار سے عقیدتمندوں میں شامل ہو گئے، محمود سامی بارودی کو اپنے تمام فضل و کمال اور منصب و جاہ کے باوجود الناس

سے عشق تھا، اشاعت سے پیشتر جس ترتیب سے اجزا طبع ہوتے جاتے ان کے پاس بھیج دئے جاتے۔

(ص ۱۰۷)

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے، کہ بارہ سال کی رفاقت میں شاگرد و استاذ ایک ہو چکے تھے، اسلئے کوئی تعجب نہیں، اگر امام سید رشید رضا جیسے مخلص اور راست باز انسان نے استاذ امام کی مدح و توصیف کے پیچھے اپنے کو گم کرنے کی کوشش کی ہو، جس کی سیکڑوں مثالیں ان کی تالیفات اور خصوصاً المنار میں ملتی ہیں، لیکن جو اپنے کو سچائی سے مٹانا چاہتا ہے، قدرت اسے زندۂ جاوید بناتی ہے اور بقائے دوام کے خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہے، صاحب سیرت بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہے۔

سید رشید اور امیر شکیب ارسلان | صاحب سیرت اور سوانح نگار دونوں کا طریقۂ فکر تقریباً متحد ہے، سید جمال الدین سے عقیدت اور شیخ محمد عبدہٗ کی شاگردی میں بھی دونوں شریک ہیں، فرق اتنا ہے کہ صاحب سیرت کی نشو و نما ایک دیندار اور ذی علم خاندان اور تعلیم و تربیت خالص مذہبی ماحول میں ہوئی، اور دین ہی کی خدمت میں انھوں نے اپنی زندگی گذار دی، ادب و شاعری یا سیاسی زعامت ان کے لئے ضمنی چیزیں اور مذہبی اصلاح کے لوازم کی حیثیت رکھتی تھیں، اس کے برعکس امیر شکیب ارسلان ایک ذی ثروت اور دنیاوی حیثیت سے بارسوخ خاندان کے چشم و چراغ ہیں، ان کا خاندان صدیوں سے سیف و قلم کا مالک رہا ہے، خود امیر شکیب طرابلس کے جہاد میں بنفس نفیس شریک رہے ہیں، ان کے چھوٹے بھائی امیر عادل ارسلان جو آج کل آستانہ میں شامی سفیر کی حیثیت سے مقیم ہیں، ۱۹۲۵ء کے دروزی جہاد میں مجاہدین کی قیادت کر چکے ہیں، ان کے بڑے بھائی امیر نسیب ارسلان مرحوم، مشہور شاعر اور سیاسی لیڈر تھے، اسی خاندان کے ایک رکن امیر مجید ارسلان، جنگ عظیم سے پہلے ممالک متحدہ امریکہ میں عثمانی سفیر رہ چکے تھے، مختصر یہ کہ امیر شکیب امراء (نوابوں) کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا مطمح نظر سید رشید مرحوم کی طرح خالص

دینی ہونا دشوار تھا، اپنے خاندانی رسوخ کے باعث وہ عثمانی حکومت سے بہت قریب تھے، ان کے آباو اجداد عرصہ تک حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے تھے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد وہ خود پارلیمنٹ (مجلس "مبعوثان") میں برابر شام کے نمایندہ منتخب ہوتے رہے، انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان، وزرار، اور دوسرے ترکی امرار سے ان کے گہرے تعلقات تھے، امیر شکیب خالص عرب ہیں، منذر بن ماء السماء شاہ حیرہ سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا ہے، حضرت عمر فاروقؓ کے مبارک عہد میں ان کے جد امجد حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، لیکن آستانۂ خلافت سے خاندانی وابستگی کی وجہ سے ترکوں کے متعلق ان کے جذبات دوسرے عرب رہنماؤں سے مختلف ہیں، امیر شکیب کو ترکوں سے محبت ہے، آلِ عثمان سے عشق ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں امیر البیان اور امام مرحوم ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں، ترکوں اور آلِ عثمان کے علاوہ دوسرے مسائل میں امیر البیان اور سید رشید اکثر متفق الرائے رہے، اور اگر کبھی معمولی اختلاف رائے بھی ہوا، تو کشیدگی اور بدگمانی کی نوبت نہیں آئی،

امیر البیان اور صاحب سیرت کے تعلقات کی ابتدا کس طرح ہوئی، یہ دلچسپ کہانی خود امیر البیان کی زبانی سنی جائے تو بہتر ہے:۔

"جہانتک یاد پڑتا ہے، کوئی ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء کا ذکر ہے، مجھے بیروت میں معلوم ہوا، کہ ایک نوجوان طرابلسی ادیب میری تلاش میں ہے لیکن پتہ نہ چل سکا، کچھ دنوں کے بعد وہ پھر میری جستجو میں پہنچے میں (کوکب الشرق) ہوٹل میں مقیم تھا، ایک متین و شریف نوجوان سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ وہ میرے دیوان "الباکورۃ الجنیۃ"[۱] کی بہت تعریف کرتے رہے، دیوان کے اکثر اشعار ان کی زبان پر تھے،

۱؎ امیر البیان نے یہ دیوان ۱۸۸۶ء سترہ سال کی عمر میں طبع کرایا تھا، دو تین سال ہوئے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن نئے قصائد کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے عجیب اتفاق کہ خود امام سید رشید رضا (باقی صفحہ ۴۱۹ پر)

لیکن دیوان سے زیادہ سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ سے میرے تعلقات کی کشش انھیں کھینچ لائی تھی، وہ میری زبان سے دونوں اماموں کی باتیں سننا چاہتے تھے، جب میں ان کا ذکر کرتا تو نوجوان کی باچھیں کھل جاتیں، اور چہرہ فرطِ مسرت سے پرنور ہو جاتا، ....

مجھے معلوم ہوا کہ ان کا نام "محمد رشید رضا" ہے، اور وہ قلمون (طرابلس الشام) کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں،

پھر دوسری ملاقات ہوئی، تیسری ملاقات اس وقت ہوئی، جب وہ ۱۳۱۵ھ میں مصر کے ارادہ سے رختِ سفر باندھ رہے تھے، میں اتفاق سے اس وقت بھی (کوکب الشرق) ہوٹل میں مقیم تھا، میرے مخلص ترین دوست سید شرتونی، مؤلف (اقرب الموارد) کے ساتھ وہ بھی کھانے پر مدعو تھے، تین چار گھنٹے پرلطف صحبت رہی، سیاحت لبنان سے متعلق میری ایک تحریر "الاہرام" میں چھپی تھی، دونوں کو پڑھکر سنایا، ....

شرتونی کے جانے کے بعد سید رشید نے مصر کے سفر کا راز بتایا، اور اخفار کا وعدہ لیا کیونکہ ممکن تھا، حکام کو اسکی خبر ہو جاتی، تو سفر دشوار ہو جاتا، یہ سلطان عبد الحمید کا زمانہ تھا، سفر کی اجازت مشکل سے ملتی تھی، میں خود پیرس کی نمائش (۱۹۰۰ء) میں جانا چاہتا تھا، لیکن اجازت نہ مل سکی (ص ۵۴۔۱۲۱)

امام سید رشید مصر تشریف لے گئے، المنار کا اجراء ہوا، اور ان کے علم و عرفان کی روشنی دور و نزدیک پھیلتی رہی، اس دوران میں امیر سے خط و کتابت جاری رہی، لیکن ۱۹۱۰ء سے پہلے پھر ملاقات کا موقع نہ مل سکا،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۸) اسس نئے اڈیشن کی طباعت کا اہتمام کر رہے تھے، اور ابھی چھپائی جاری تھی، کہ ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا، ۱؎ حکیم مشرق سید جمال الدین سے امیر البیان کو تعارف حاصل تھا، حاضر العالم الاسلامی میں امیر نے سید جمال الدین سے اپنی ملاقات اور ان کے ارشادات کا مفصل تذکرہ کیا ہے،

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد سید رشید وطن مالوف کی زیارت کو گئے، انجمن اتحاد و ترقی بیروت کے دفتر میں دیر تک صحبت رہی، بارہا محترم امیر مصطفیٰ ارسلان کے گھر پر وہ تشریف لائے، اور مختلف مسئلوں پر جی کھول کر باتیں ہوئیں،

اس سلسلہ میں انھوں نے جامع اموی دمشق میں لکچر بھی دئے، جس پر بڑا ہنگامہ ہوا، لوگوں کو ان کے درس میں تو ہّب کی بو معلوم ہوئی، شیخ صالح تونسی نے بڑا ہنگامہ کیا، اور عوام کو سید رشید کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی، آخر حکومت کی دخل اندازی سے یہ فتنہ فرو ہوا" (ص ۱۴۷)

پھر سننے میں آیا کہ وہ مدرسہ (دعوت وارشاد) کے لئے حصول اعانت کے سلسلہ میں آستانہ تشریف لے گئے ہیں، اراکین انجمن اتحاد و ترقی نے شروع میں تو بڑے وعدے کئے لیکن پھر ٹالنا چاہا، بیچارے سال بھر آستانہ میں مقیم رہے، آخر میں مایوس ہو کر مصر واپس چلے آئے، انھیں یقین ہو گیا تھا کہ انجمن اتحاد و ترقی سے عربوں کی کوئی بھلائی نہیں ہو سکتی اسلئے برابر اسکی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے رہے، (ص ۱۴۸)

۱۹۱۱ء میں طرابلس کے سفر کے سلسلہ میں مصر سے گذرنا ہوا، اس میں سید رشید سے خوب ملاقاتیں رہیں، شیخ محمد عبدہ کے زمانہ میں خدیو مصر سید رشید سے خوش نہ تھے، لیکن استاذ امام کی رحلت کے بعد بارگاہ خدیویت میں سید رشید پھر بار پانے لگے، خدیو نے مجھے طرابلس کے ارادہ سے روکنے کی کوشش کی، لیکن میں جہاد کی نیت کر چکا تھا،

عین منصور (طرابلس الغرب) کی چھاؤنی میں شیخ صالح تونسی[۱] مرحوم سے خوب ملاقاتیں

---

[۱] شیخ صالح تونسی عبدالعزیز شاویش علی یوسف یہ سب ایک خیال کے بزرگ اور اتحاد اسلامی کے سرگرم کارکن تھے، دولت عثمانیہ میں انور پاشا مرحوم سے اس جماعت کے تعلقات بہت خوشگوار اور دوستانہ تھے،

اب اس گروہ کے "باقیات صالحات" میں بوڑھے امیر شکیب اور جوان عبدالحمید سعید کا نام لیا جاسکتا ہے،

رہیں، وہ سید رشید کے دینی خیالات سے سخت اختلاف رکھتے تھے، میں نے ان کی شدت میں کمی کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں شیخ محمد عبدہ اور سید رشید سے بدگمانی پر اصرار تھا، سید رشید سے شیخ صائغ کو اتنی نفرت تھی، کہ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے المنار پڑھتے دیکھا تو ان کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہنے لگے "اس میں گمراہیوں کا انبار ہے، اور بسا اوقات کفریہ باتیں بھی ہوتی ہیں" معاذاللہ!

پہلے ذکر آچکا ہے، کہ ترکوں کے مسئلہ میں امیر البیان اور سید رشید کے خیالات یکساں نہ تھے، یہ اختلاف یوں تو ابتدا سے تھا، لیکن عثمانی انقلاب (۱۹۰۸ء) کے بعد عربوں کا قومی جذبہ جوں جوں روز افزوں ترقی کرتا گیا، عربوں اور ترکوں کے ہمدردوں کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی، جہاد طرابلس کے سلسلہ میں یہ دونوں عنصر عارضی طور پر متحد ہو رہے تھے، کہ جنگ بلقان کے شرارے بلند ہوئے، اور جنگ عظیم کے علامات نمودار ہونا شروع ہو گئے، عربوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا، عرب قائدین اندرونی مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے، اور ارکین اتحاد و ترقی وعدوں پر ٹالنا چاہتے تھے، اس کشمکش میں سید رشید رضا مرحوم طبعی طور پر عرب رہنماؤں کی پہلی صف میں تھے، اور امیر شکیب ارسلان عربوں کے مطالبات سے کامل اتفاق کے باوجود اس برے وقت ترکوں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے،

اگر یہ اختلاف رائے اوسط درجہ کے دو آدمیوں میں ہوتا، تو شاید زیادہ اہمیت نہ ہوتی لیکن امیر البیان اور سید رشید کا باہمی اختلاف، چوٹی کے دو عرب لیڈروں کا اختلاف تھا، اسلئے اسے بہت اہمیت دی گئی، مخالفین نے خوب آوازے کسے، اور آخر کار تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی جو تقریبًا ۹ سال باقی رہی، اس کشاکش کی پر لطف داستان امیر البیان نے خوب مزے لے کر بیان کی ہے، مفصل نہیں تو مجمل طور پر سہی داستان سننے کے لائق ہے،

"جنگِ بلقان کے شرارے بلند ہوئے، تو ہم لوگوں کو خطرہ دامنگیر ہوا، کہ کہیں حکومت طرابلس کی امداد میں کوتاہی سے کام نہ لے، ناچار مجھے برقہ چھوڑ کر آستانہ کا قصد کرنا پڑا، انجمن ہلال احمر مصر نے مجھکو اپنے وفد مقیم آستانہ کا نگران بھی مقرر کردیا تھا، پھر خدیو کے اصرار پر آستانہ سے مصر واپس آیا، سید رشید کی معیت میں خدیو سے ملاقات ہوئی، خدیو کی خواہش تھی، کہ میں مصر ہی میں رہوں، تاکہ وقت پر شیخ علی یوسف اور سید رشید کے ساتھ وہ میری خدمات سے بھی فائدہ اٹھا سکیں، لیکن میں اس خطرناک حالت میں اتحادیوں (اراکین اتحاد و ترقی) کی مخالفت پسند نہیں کرتا تھا، اور اسی بنا پر سرای عابدین (قصر شاہی) ہی میں مجھ سے اور فرید پاشا وزیراعظم سے ایک جھڑپ بھی ہوگئی تھی، یہ لوگ جنگِ بلقان کے دوران میں اتحادیوں پر حملہ کی تجویز کر رہے تھے، اور میں اندرونی اختلافات میں حد سے گذرنا نہیں چاہتا تھا خصوصاً جب کہ بلقانی فوجیں دارالخلافہ کے دروازہ پر عثمانی حکومت کے شکست و ریخت کا خواب دیکھ رہی ہوں ....،

خدیو کو اس جنگ و جدال کی خبر ملی، تو وہ بھی برافروختہ ہوگئے، لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی، حق کے مقابلہ میں، میں کبھی کسی سے نہیں دبا،

اس وقت سید رشید بھی اتحادیوں کے دشمن تھے، المنار میں ان کی برائیوں اور فردگذاشتوں پر سلسلہ وار مضامین شائع ہو رہے تھے، مجھے اس کا علم تھا، اور میں نے کبھی انھیں ان کی سوجھی ہوئی راہ سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی، میری طرح انھیں بھی اپنے سیاسی مشرب کی سچائی کا پورا یقین تھا، اختلافِ رائے کے باوجود تعلقات خوشگوار تھے، کم از کم کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی،

لیکن جنگِ بلقان ہی کے دوران میں افواہ گرم ہوئی، کہ حکومت اپنی عزت و خودداری کے تحفظ کی خاطر لندن سے قرض لینا چاہتی ہے، حکومت کے مخالف بعض شامی لیڈروں نے

تاربازی شروع کردی، اس طریقہ سے وہ قرضہ کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے، مجھے اس روش سے انتہائی تکلیف ہوئی، میں نے عربوں سے سوال کیا، وہ کیا چاہتے ہیں، ؟ اگر اتحادیوں کو قرض دینے کے وہ اسلئے مخالف ہیں، کہ مالی پریشانی کے باعث فوج کو رسد نہیں مل سکے گی، تو انھیں معلوم ہونا چاہئے، کہ عثمانی فوج میں ترکوں کی طرح ہزاروں عرب بھی ہیں، اگر انھیں ترکوں اور خلافت کے علمبرداروں پر رحم نہیں آیا، تو کم از کم اپنے بھائیوں پر تو ترس کھانا چاہئے تھا، میں نے یہ سوال "الشعب" مصر میں پہلے گمنام شائع کرایا، کہ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے، آخر اس جماعت کے سرگروہ رفیق العظمؒ کی طرف سے جواب شائع ہوا، اس جواب میں نہ صرف خبر کی تردید تھی، بلکہ سوال کرنے والے پر خوشامد اور ترکوں کی جا و بیجا محبت کا الزام بھی لگایا گیا تھا، اس پر میں نے اپنے نام سے دوبارہ لکھا، اور اپنے دوست رفیق العظم کو جن کے ساتھ میں اور سید رشید برابر رازدارانہ مشورے کیا کرتے تھے، جواب دیا، کہ میں کسی کی خوشامد نہیں کرتا، زمانہ بتلا دیگا کون جا و بیجا خوشامد کرتا ہے، اور کون غیر ملکی طاقت کا ہاتھ مضبوط کر رہا ہے،

اس پر یہ جماعت بہت برہم ہوئی، اور مجھے اپنا دشمن خیال کرنے لگی، اسلئے کہ یہ لوگ انگریزوں کی مدد سے عربی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، صاحب سیرت بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ انگریزوں کی محبت میں اندھے نہیں تھے، اور ہر حال میں ان کی اطاعت اور رہنمائی میں چلنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، اس حادثہ کے بعد ان سے ملتا رہا، لیکن ایک دوسرے کے مقابل آجانے کی وجہ سے محبت کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں،

لہ آل العظم، دمشق کا مشہور ذی علم اور ذی وجاہت خاندان ہے، اس خاندان کے متعدد افراد عثمانی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے ہیں، رفیق العظم مشہور عربی مفکر اور اہل قلم تھے، متعدد تصنیفات انکی یادگار ہیں جن میں زیادہ مشہور اشہر مشاہیر الاسلام فی الحروب والسیاسۃ کے چار حصے ہیں، ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی،

عجیب اتفاق کہ فرید پاشا سے جس روز قصر شاہی میں جھگڑا ہوا، اسی دن المؤید کے دفتر میں شیخ علی یوسف سید رشید رضا عبد الحمید زہراوی[1]، اور حقی بک ناجی سے ملاقات ہوئی، باتیں ہو رہی تھیں، کہ دفتر میں ایک اہم برقی پیغام موصول ہوا، خبر کا خلاصہ یہ تھا، کہ جرمنی نے تین ارب کی رقم مصارف جنگ کے لئے مخصوص کر دی ہے، اس پر شیخ علی یوسف بولے:۔

مجھے جنگ کے علامات نظر آتے ہیں" اس سلسلہ میں مسئلہ چھڑ گیا، کہ جنگ میں حکومت کو کس فریق کا ساتھ دینا چاہئے، میں نے کہا اکثر دشمن اسلام حکومتیں اس وقت جرمنی کے مقابل صف میں نظر آتی ہیں" زہراوی نے کہا "گویا مطلب یہ ہے، کہ ہم جرمنی کی غلامی قبول کر لیں" مجھے اس جملہ سے بہت اذیت پہونچی، زہراوی کی نیت تعریض کی تھی، میں بھی بول اٹھا نہیں بلکہ انگریزوں کی...... اس پر بات بڑھ گئی، تا آنکہ زہراوی نے کہا :۔

"حکومت، حکومت کیا کہتے ہو، اب حکومت کہیں ہے بھی؟ عثمانی حکومت کا دیوالہ نکل چکا"

میں نے کہا "نہیں ابھی حکومت باقی ہے، انگریز بھی اسے سمجھتے ہیں، لیکن تم لوگ اس کے خاتمہ کی فیرمنا رہے ہو، اور اپنوں کو دوسروں کے سامنے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہو، ہمارے پاس کوئی دو چار حکومتیں تو ہیں نہیں، اگر یہ گئی تو پھر کس کا نام لیں گے"؟

اگر ہم نہیں تو کیا غیروں پر حکومت کی کمزوری چھپی ہوئی ہے"؟ اس پر سید رشید کو بھی بہت طیش آیا، وہ مجھ سے مخاطب ہو کر نہایت غصہ میں کہنے لگے "تم ہمیشہ ہم لوگوں کو بدنام کرتے ہو کہ ہم حکومت کے مٹنے کی تمنا رکھتے ہیں، اور ہم پر بہتان باندھتے ہو،

ابھی وہ جملہ ختم بھی نہ کرنے پائے تھے، کہ میں فرط غضب میں بول اٹھا "غلط، تم بہتان باندھتے ہو"

---

[1] عبد الحمید زہراوی کو عربی تحریک کا امام سمجھا جاتا ہے، اتحادیوں نے انھیں پھسلا کر آستانہ بلایا، اور وہیں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، امیر شکیب ارسلان کی طرح یہ بھی مجلس مبعوثان کے ممبر تھے،

اتنے میں شیخ علی یوسف اور حنفی ناجی درمیان میں حائل ہوگئے، اور دونوں کو ٹھنڈا کیا، یہ پہلا موقع تھا جب صاحب سیرت اور میرے درمیان اختلاف رونما ہوا، .... اور اس واقعہ کے بعد پھر تقریباً نو سال تک ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ رہے، بایں ہمہ مجھے سید رشید کے اخلاص اور سچائی پر پورا اعتماد تھا، ترکوں سے نفرت کے باوجود وہ انگریزوں کے مقابلہ میں انھیں ترجیح دیتے تھے"

(ص ۱۵۱-۱۵۴)

یہ تھی اجمالی سرگذشت اس اختلاف کی جس نے دو دوستوں کو نو سال تک ایک دوسرے سے الگ رکھا، یہ شور و شر اور ہنگامہ و فساد کا زمانہ تھا، جنگ عظیم کے باعث سید رشید دوسرے عرب رہنماؤں کے ساتھ اپنی کارروائیوں میں منہمک تھے، دوسری جانب امیر شکیب آستانہ، اطرابلس اور برلین کا چکر لگا رہے تھے،

لیکن اس قطع تعلق کے باوجود دونوں کے دل ایک دوسرے سے قریب تھے، خط و کتابت کا کیا ذکر اس پر آشوب دور میں خفیہ پیام رسانی بھی دشوار تھی، بہر حال امیر البیان سید رشید کی خیریت ہر وارد و صادر سے دریافت کیا کرتے،

یہ دن بھی گذر گئے، جنگ کی ظلمت کافور ہوئی، شام پر فرانسیسیوں کے قبضہ کے ساتھ عرب رہنماؤں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، امیر فیصل یوسف بے کارواں کی طرح یورپ میں مارے مارے پھرتے تھے، لیکن کوئی پرسان حال نہیں تھا، اس وقت عرب لیڈروں کو امیر شکیب ارسلان کی نصیحت یاد آئی، غداری اور خیانت کا الزام لگانے والے پھر تجدید بیعت کرنے لگے، اب انھیں معلوم ہوا کہ

سیعلم قومی اننی لا أغشهم ۔۔۔ ومهما استطال اللیل فالصبح وا صلہ[۱]

(میری قوم عنقریب جان لے گی، کہ میں ان سے خیانت نہیں کر رہا ہوں)

---

[۱] یہ امیر البیان کی ایک نظم کا مشہور شعر ہے جس نے اب عربی سیاسیات میں تاریخی حیثیت حاصل کر لی ہے

(شک وشبہ کی بھیانک رات کتنی ہی لمبی ہو (سچائی) کی صبح بہر حال نمودار ہو کر رہے گی)

اب انھیں معلوم ہوا کہ "سیعلم الخ" کا کہنے والا ٹھیک کہتا تھا، دوستوں نے پھر رہنمائی کی درخواست کی، سید رشید کے دل میں بھی پرانے رفیق کی یاد تازہ ہوئی، "پیام وسلام" سے عہد الفت کی تجدید کی گئی، مرحوم نے پوری سادگی اور صفائی سے اپنے دوست کو لکھا:۔ (ص ۱۹۰)

"جو ہوا سو ہوا، آئیے اب ہم لوگ سب مل کر صورت حال کی اصلاح کی کوشش کریں"

تعلقات استوار ہو گئے، جنیوا میں شامی کانفرنس منعقد ہوئی، (۱۹۲۱ء) امیر شکیب نے اثنائے جنگ میں "شام کے حوادث" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا، جو "المنار" اور تمام مشہور اخبارات میں شائع ہوا، سید رشید نے اس پر ایک طویل شذرہ بھی لکھا تھا، جس کا ذکر اوپر آچکا، خط وکتابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا،

اس دوران میں ملاقات کے صرف دو موقع میسر آئے، امیر البیان حج کے ارادہ سے ۱۳۴۸ھ میں جب سویز سے گذرے، تو بچھڑے ہوئے دوست ایک دوسرے سے گلے ملے، پورٹ سعید سے سویز تک ساتھ رہا، واپسی میں امیر البیان کی والدہ محترمہ اور ابن عم امیر امین ارسلان کے ساتھ سید رشید بھی پورٹ سعید تشریف لائے، اور برابر ساتھ رہے، اور تین چار روز تک پر لطف صحبت رہی، (ص ۱۹۳)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۵) آستانہ کی عربی انجمن (المنتدی العربی) نے دوران جنگ میں صلاح الدین نامی ایک ڈرامہ کی تمثیل کی تھی، امیر البیان نے اسی سلسلہ میں یہ نظم سلطان صلاح الدین پر لکھی، اور خود تمثیل کے اثناء میں پڑھی تھی، نظم کے آخری چھ سات شعر اس وقت کی سیاسیات سے متعلق تھے، "سیعلم قومی الخ" آخری شعر ہے، باذاق حلقوں میں صرف "سیعلم قومی" کہدینا امیر شکیب کی سیاسی پالیسی کی شرح وتفصیل کے مرادف ہے،

دوسری ملاقات ۳۴ء میں وفات سے تقریباً سال بھر پہلے ہوئی، لیکن اسے ملاقات کہنا بھی ظلم ہوگا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ سلطان ابن سعود اور امام یحییٰ کے باہمی اختلافات طے کرانے کی غرض سے اکابر اسلام کا ایک وفد مرتب ہوا، وفد کی تشکیل میں فلسطین کے محبوب رہنما، اور امام سید رشید رضا کے شاگرد رشید سید امین حسینی کی کوششوں کا بہت دخل تھا، وفد کے ایک رکن[۱] امیر شکیب بھی تھے، جنیوا سے ہوا کے بازو پر اسکندریہ پہنچے، یہاں مصر کے اکابر کا اجتماع تھا، لیکن پولیس کا پہرہ سب پر غالب تھا، ریل سے پورٹ سعید روانہ ہوئے، پولیس کے جوان ہمرکاب تھے، سید رشید فرط محبت سے ضبط نہ کر سکے، درمیان میں کسی اسٹیشن پر ہمت کر کے ڈبہ میں آگئے، پولیس کی نگرانی سخت تھی، اس سے اور "الشباب" کے مجاہد اڈیٹر محمد علی الطاہر سے نوک جھونک ہو چکی تھی، امیر شکیب سے بھی نہ رہا گیا، چنانچہ انتہائی ممانعت کے باوجود انھوں نے بڑھکر مصافحہ کیا، اور پولیس افسر سے کہا "تمھارا جو جی چاہے، کرلو" پھر سید رشید دوسرے ڈبہ میں چلے گئے، یہ آخری ملاقات تھی، اور آخری مصافحہ!! صلح کی مہم پر جنیوا سے ایک اسلام کا سپاہی آتا ہے، وہ اسکندریہ کے ساحل پر اپنے بھائی سے دو باتیں بھی نہیں کرسکتا، دو دوست آمنے سامنے تھے، اور دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز! اللہ جانے آنکھیں دو دوستوں کی محرومی پر گریاں تھیں، یا مسلمانوں کے اس برے دن پر، ؟ زبانیں خاموش تھیں، لیکن امت کے دو دردمند آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم کلامی کر رہے تھے، امام مرحوم میں جرأت زیادہ تھی، اور امیر کی طرح ضابط بھی نہیں تھے، ان کی زبان سے بے اختیار نکلا، لا عجب (کچھ تعجب نہیں)

وھٰذہ آخر کلمۃ سمعتھا من فمہ — میں نے ان کی زبان سے یہ آخری
قدّس اللہ روحہ (ص ۵-۱۴۴) — کلمہ سنا تھا،

۱؎ وفد کے کل چار رکن تھے، سید امین حسینی (صدر) ہاشم اتاسی (شام)، محمد علی علوبہ (مصر) اور امیر شکیب (جنیوا) ۲؎ یہ تمام

سید رشید مرحوم کی تمنا تھی، کہ امیر البیان مصر کو اپنا مسکن بنائیں، اس کے لئے کوششیں بھی ہوئیں، لیکن اجازت نہ مل سکی، پھر بھی کچھ کچھ توقع باقی تھی، کہ ع

آن قدح بشکست وآن ساقی نہ ماند

مکتوبات رشیدیہ | یہ خطوط دو دوستوں کے ذاتی تعلقات کا آئینہ اور لکھنے والے کی سچائی، اور خلوص کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں، کوئی دن نہیں جاتا، کہ مکتوب نگار، مکتوب الیہ کے صاحبزادے امیر غالب کی خیریت نہیں دریافت کرتے، ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق سوالات کرتے، مشورے دیتے، اور بلندی اقبال و دولت (دولت دینی و دنیاوی) کی دعائیں دیتے،

فرانسیسی زبان میں امیر شکیب ایک ماہانہ رسالہ (La Nation Arabe) جنیوا سے نکالتے ہیں، عام طور پر وہ یورپ کے مشہور ارباب سیاست اور بارسوخ لیڈروں کو مفت بھیجا جاتا ہے، اسلئے قدرتی طور پر امیر کو اپنے جیب خاص سے بہت کافی صرف کرنا پڑتا ہے، کبھی کبھی یہ خسارہ ناقابل برداشت حد تک پہنچ جاتا ہوگا کہیں ایک مرتبہ مکتوب نگار کو امیر کے مالی نقصانات کی اطلاع مل گئی، تو ان نے لکھا،

"......اس طرح مجھے آپ کے فرنچ رسالہ کے مصارف سے سخت اختلاف ہے، آپ جس قوم اور جس ملک کے لئے اتنا کر رہے ہیں، اسے اس کا احساس بھی نہیں، اسلئے قطعًا وہ ان قربانیوں کی مستحق نہیں، ان مصارف کا بار اٹھائے بغیر بھی اس سے زیادہ مفید خدمتیں انجام پاسکتی ہیں"۔ (ص ۵۰۰)

امیر شکیب پر مراسلات کا بڑا بار ہے، دنیاے اسلام کے ہر خطہ سے سینکڑوں خطوط

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۷) تفصیل امیر البیان نے اپنے ایک دوسرے مقالہ میں بھی کی ہے جو مرحوم کی وفات پر "جہاد" میں شائع ہوا تھا مجموعہ میں وہ بھی شامل ہے، (ص ۲۷۲)

آتے ہیں، اور وہ اپنی جیب سے سب کا جواب دیا کرتے ہیں، راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ بسا اوقات وہ رجسٹری اور ہوائی ڈاک سے عنایت نامے بھیجا کرتے ہیں، عربی کے تمام مشہور اخبارات دو تین سال بیشتر تک ان کے مضامین سے بلا معاوضہ سرفراز ہوتے تھے، ۱۹۲۹ء میں امیر کی ڈاک کا تخمینہ یہ تھا:۔

سترہ اٹھارہ سو کے لگ بھگ خطوط، اور اخبارات کے لئے ڈھائی سو چھوٹے بڑے مضمون تصنیف و تالیف کی محنت الگ، (ص ۷-۵۲، حاشیہ)

مکتوب نگار کو اپنے دوست کی ان پریشانیوں سے بہت تکلیف ہوتی تھی، بار بار صحت اور مال کی بے سود قربانیوں سے منع کرتے، اپنی اور مسلمانوں کی بھلائی کے نام پر ان سے آرام کی درخواست کرتے، (ص ۵۲۶)

مکتوبات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوجاتا ہے، کہ مکتوب نگار بہت بامروت اور محبت کے آدمی تھے، محمد علی الطاہر کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، کہ امام سید رشید رضا میں کمال عقل اور وسعتِ تجربہ کے باوجود بڑوں کا لڑکپن بھی تھا" امیر غالب کو ایسے لطیف پیرایوں میں محبت و پیار کے پیام بھیجتے ہیں، کہ حیرت ہوتی ہے،

لیکن اس سادگی اور پاکیزگی قلب کے ساتھ وہ قومی اور مذہبی معاملات میں بہت سخت گیر تھے، قومی و مذہبی معاملات تو خیر بڑی چیز ہیں، ادب و انشا میں بھی ان کی نگاہ بہت نکتہ چین اور سخت گیر واقع ہوئی تھی، امیر نے اپنی عہد شباب کی ایک تالیف (آخر بنی سراج) دوبارہ طباعت کے لئے المنار پریس میں بھیجی، نظر ثانی اور پروف کی تصحیح خود صاحب المنار کرتے تھے، امیر کی ابتدائی تصنیف تھی، زبان و ادب کی لغزشیں نظر پڑیں، ان غلطیوں پر ایک خط کیا اچھا خاصہ رسالہ[۵]

---

[۵] امیر کے جوابی حاشیوں کو ملا کر یہ ایک خط مستقل صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، (ص ۲۰۳-۲۰۶)

تصنیف کرکے امیر کے پاس بھیج دیا، وہ لغزشیں غلطیوں کے حکم میں نہیں تھیں، لیکن امیر البیان کی ادبی حیثیت سے ضرور گرفت ہوئی تھیں، ان لغزشوں کے سلسلہ میں دونوں میں خوب رسہ کشی رہی، یہ غلطیاں دراصل دوسری زبانوں کے اثرات سے عربی میں داخل ہوگئی ہیں، (آخبی سراج) امیر کی ابتدائی تالیف تھی، اس لئے عام روش کے مطابق یہ بھی نامانوس ترکیبوں سے نہ بچ سکی بعض مفردات کی مسامحت بھی تھی، مثال کے طور پر بعض نمونے دیئے جاتے ہیں،

الخطر المحیق "محیق" مزید سے نہیں سنا گیا، فصیح مجرد سے آتا ہے، قرآن مجید میں (وحاق بھم ما کانوا) الآیۃ اس معنی میں اور اسی مادہ سے آیا ہے، (ولا یحیق المکر السیئ) بھی مجرد ہی سے استعمال ہوا ہے، (ص ۲۰۶)

ضجۃ مھولۃ "مھولۃ" بھی مزید سے نہیں آتا، (ھالہ الامر) صحیح اور فصیح استعمال ہے، یہ امام سید رشید رضا کی گرفت ہے، امیر البیان حاشیہ میں اس کی صحت پر جاہلی شعر پیش کرتے ہیں:-

ومھول من المناھل وحش ذی عراقیب آجن مدفان

اب مھول کے معنی (مکانٌ فیہ ھول) کے ہوں گے۔

جدید ترکیبوں کے متعلق مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے درمیان کچھ اصولی اختلافات بھی تھے، راسخ العقیدہ محافظین ادب جدید[1] افرنجی ترکیبوں کے مطلق روادار نہیں، اور معتدل حضرات مانوس اور ذوق کے مطابق ترکیبوں کا داخلہ بند کرنا نہیں چاہتے، امیر البیان اسی معتدل گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ مکتوب نگار کے اس ادبی مواخذہ سے اتفاق نہ کرسکے، بعض

---

[1] جدید عربی ترکیبوں اور ان کی صحت و عدم صحت کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے لغات جدیدہ (طبع جدید) کا مقدمہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے،

اعتراضات نحوی ہیں، اصل رسہ کشی انہی کے متعلق ہوئی ہے،

جہاں کہیں امیر کو خود اپنی توجیہ پر اطمینان نہیں ہوا ہے، وہاں اپنے اور امام مرحوم دونوں کے متفقہ استاذ محترم علامہ تقی الدین ہلالی کو حکم بنا کر ان پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے، مثال سے وضاحت ہوگی،

۱- (وما هو ذلك القصر) دراصل یہ منطقیوں کی اصطلاح سے ماخوذ ہے، اشیاء کی حقیقت کے متعلق جب انھیں سوال کرنا ہوتا ہے، تو وہ (ما ہو) سے کام لیتے ہیں، رفتہ رفتہ یہ استعمال ادبار میں رواج پا گیا، حالانکہ نہ ضمیر کی یہاں ضرورت ہے، اور نہ اس کا کوئی مرجع مذکور ہے،

(سید رشید ص ۴۰۸)

امیر شکیب قاعدہ کے اعتبار سے مکتوب نگار کا قول تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس ترکیب کی صحت میں انھیں مطلق شک نہیں، سیبویہ کی (الکتاب) اور ابن ہشام کی (مغنی اللبیب) سے متعدد شواہد بھی حاشیہ میں نقل کئے گئے ہیں،

ابن ہشام اور سیبویہ کی عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے، کہ ضمیر منفصل کبھی بلا کسی خاص ضرورت کے بھی مستعمل ہوتی ہے، اور نحوی ترکیب میں اس کی مختلف توجیہیں کی جا سکتی ہیں،

(حاشیہ ص ۹-۴۰۸)

علامہ ہلالی نے بھی امیر البیان کی تائید کی ہے، ان کے نزدیک اس ترکیب کے عدم جواز کا فتویٰ کسی طرح نہیں دیا جا سکتا، صرف عدم جواز ہی نہیں، بلکہ ہلالی صاحب (ما هو ذلك القصر

ؔ۱ ہم لوگوں کا عرصہ سے خیال تھا، کہ ہلالی صاحب اس وقت ادبائے عرب کی صف اول میں جگہ پانے کے لائق ہیں، خصوصاً لغت و نحو میں تو مشکل سے دو چار ان کی ہمسری کا ادعا کر سکتے ہیں، راقم الحروف آج سے دو سال پیشتر لغات جدیدہ (طبع دوم) کے مقدمہ میں شیخ ہلالی مدظلہ کا شمار درجہ اول کے ادبار میں کر چکا ہے، امیر البیان کی تحکیم سے ناچیز اور حقیر رائے کی بہت تقویت ہوئی،

کو خلاف بلاغت بھی نہیں مانتے، نحوی توجیہ یوں ہو سکتی ہے، ضمیر (ھو) القصر کی طرف لوٹے گی، "القصر" اگرچہ لفظاً متاخر ہے لیکن رتبہ میں متقدم ہے، اسلئے کہ "ذلک" مبتدا کا وہ بدل ہوگا، اور جملہ "ماھو" خبر ہوگا، استفہام کی وجہ سے اسکی تقدیم لازم ہوئی، (ص ۲۹۰)

۲۔ مکتوب نگار کو (نحو ثلاثمائۃ) پر بھی اعتراض ہے، "نحو" کی براہ راست اضافت کو وہ اچھا نہیں سمجھتے، فصیح استعمال (نحو من ثلاثمائۃ) ہے، (ص ۲۹۵)

امیر البیان (نحو ثلاثمائۃ) کو غلط نہیں سمجھتے لیکن (نحو من ثلاثمائۃ) کو افصح اور اولیٰ تسلیم کرتے ہیں، ہلالی صاحب کا فیصلہ بھی سید رشید کی تائید میں ہے، لیکن اتنے اضافہ کے ساتھ:۔

"لیکن سیبویہ سے لے کر آج تک تمام مصنفین اور شعراء اس ترکیب کو بکثرت استعمال کرتے آئے ہیں "نحو" کے معنی یہاں "مثل" کے ہیں، اس لئے جواز میں کوئی اشکال نہیں،

(حاشیہ ص ۲۹۵)

امیر نے تمام ادبی اختلافات میں ہلالی صاحب کی رائے کو کافی اہمیت دی ہے، اور ایک جگہ انھیں (الغایۃ البعیدۃ فی النحو واللغۃ) بھی کہا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اختلافات میں ہلالی صاحب کی رائے مکتوب نگار کی تائید میں ہے، البتہ مختلف فیہ ترکیبوں کی جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، اور نفس جواز سے مکتوب نگار کو بھی انکار نہیں معلوم ہوتا، ہلالی صاحب کے علاوہ کہیں کہیں مصطفےٰ جواد (بغداد) سے بھی، امیر نے محاکمہ کی خواہش کی ہے، اور یہ خود اپنی جگہ پر امیر البیان کی فراخ دلی اور انکسار کی دلیل ہے،

مضمون کی طوالت کے خوف سے زیادہ مثالیں نہیں دی جا سکتیں، ان لغزشوں کا اصلی سبب جیسا کہ اوپر ذکر ہوا صرف یہ ہے، کہ (آخر بنی سراج) امیر کے عہد شباب کی تالیف بلکہ

ترجمہ ہے، خود امیر لکھتے ہیں،

"ہم نے (انشا تو بریاں) کی کتاب (آخر بنی سراج) کا ترجمہ آج سے چالیس سال پہلے کیا تھا، اور ترجمہ میں فرنچ اصل سے مطابقت کی کوشش بھی کی تھی، اسلئے اس میں کچھ غلطیاں رہ گئیں جن کی تنقید میں سید رشید حق بجانب تھے، ان میں بعض واقعی غلطیاں ہیں، اور بعض کی توجیہ ہوسکتی ہے، .... اور ہم نے مرحوم کے حسب منشا رنئے اڈیشن میں صحت طلب فروگذاشتوں کی تصحیح کردی ہے"۔ (ص ۴۴۰ حاشیہ)

مکتوب نگار کی سخت گیری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، امیر البیان عام طور پر تفصیل اور شرح وبسط کیساتھ لکھنے کے عادی ہیں، کہیں تفصیل در تفصیل ہوتی چلی جاتی ہے، بعض اوقات ضمنی مسئلوں میں کچھ موضوعِ بحث سے دور بھی ہٹ جاتے ہیں، لیکن انداز بیان اس قدر دلچسپ اور دلپذیر ہوتا ہے، کہ عام طور پر گراں نہیں گذرتا، بلکہ اسکی طلب اور بڑھ جاتی ہے، امیر کی تصنیفات اور مضامین میں اس کے نمونے بہت ملتے ہیں، امیر کی بعض تحریریں بسا اوقات مولانا محمد علی مرحوم کے آخری ایام کی تحریروں سے ملتی جلتی نظر آتی ہیں، صرف طوالت اور پریشانی ہیں، انشا رمیں امیر کا پایہ بہت بلند ہے، مکتوب نگار ایک خط میں اس طوالت کے شاکی نظر آتے ہیں،:-

"یہ رسالہ بہت اطناب سے لکھا گیا ہے، اسم ظاہر کی جگہ مشکل سے کہیں ضمیر کا استعمال ہوا ہے، جزئی واقعات اور مخالفین کی تردید میں تکرار بہت ہے، کسی شخص کا تذکرہ آگیا، تو پھر اسکی سوانح عمری پر تبصرہ ہونے لگتا ہے، اس طرح کی مدافعت سے خالی الذہن انسان کے دل میں خواہ مخواہ خیال پیدا ہوگا، کہ شاید لکھنے والے کو خود اپنی صداقت کا یقین نہیں ہے، میرے خیال میں گذشتہ واقعات کی طرف اس طرح اشارہ کردینا کافی ہے، کہ پھر مخالف کیلئے حجت وتردید کی گنجائش باقی نہ رہے"۔ (ص ۳۱۱)

مکتوب نگار کا یہ تبصرہ ان مضامین سے متعلق ہے، جو امیر البیان نے (دوران جنگ میں شام کے حوادث) کے عنوان سے ۱۹۲۳ء کے آغاز میں سپرد قلم کئے تھے،

شامی سیاسیات سے متعلق ۱۹۲۲ء میں امیر نے مخالفین کی تردید میں مسلسل مضامین لکھے تھے، ان کا انداز بیان بھی وہی تھا، سید رشید لکھتے ہیں،:-

اس مسئلہ کو طول دینا بہت تکلیف دہ ہے، میں اپنے فرض سے غافل نہیں.......

.... آپ کی یادداشت پر میں بہت کچھ لکھ چکا، آج تک کسی نکتہ چیں نے آپ کی راست بازی اور اخلاص پر شک نہیں کیا، آپ کو خود اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں"۔ (ص ۳۴۱)

مکتوبات رشیدیہ کا بڑا حصہ ممالک عربیہ کی سیاسیات سے متعلق ہے، ان کے پڑھنے سے عربی سیاسیات کی جزئیات سے بہت کچھ واقفیت ہو جاتی ہے، ترک و عرب کی آویزش، ابن سعود و آل شریف کی باہمی کشمکش، امام یمن و سلطان نجد کا اختلاف اور دوسرے بیسیوں ایسے مسئلے ہیں جن کے متعلق صحیح اور باوثوق معلومات ملتی ہیں، بعض مسئلوں (جیسے اسکندرونہ پر ترکوں کا قبضہ) کے متعلق مکتوب نگار نے پیشین گوئی کی تھی، جو آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہے، لیکن اس مختصر سی صحبت میں ان کی تفصیل نہیں کیجا سکتی، اور معمولی اقتباس ناکافی ثابت ہوگا، اسلئے ہم سیاسی حصہ کو نظر انداز کرتے ہیں،

عربی سیاسیات کے علاوہ ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں اور ان کے رہنماؤں کے متعلق بھی مکتوب نگار نے اظہار خیال کیا ہے، سید رشید رضا کی مردم شناسی اور رواداری کی اس سے زیادہ مناسب کسوٹی اور نہیں مل سکتی، آئیے، دنیائے اسلام کی مختلف شخصیتوں اور متنوع مسئلوں کے متعلق انکی رائے معلوم کریں،:-

شریف حسین بن علی | "صاحب حجاز نے نئے معاہدہ سے اپنی رسوائی مول لی، دنیاے اسلام اس کی مخالف ہو چکی ہے، اور تمام اخبارات اس کے خلاف آواز بلند کر رہے ہین،.......

یہ ایسی راہ ہے جسے رب العالمین کی سرکشی کئے بغیر کوئی نہیں اختیار کر سکتا، لیکن اب بھی لوگ اُسے "زعیم عرب" ماننے سے باز نہیں آتے"

(ص ۴۴۲، مکتوب مورخہ ۱۳ ؁ھ)

"مین نے حسین اور اس کے ماننے والون کی مدارات مین کوئی کمی نہیں کی سختی کی جگہ نرمی سے کام لیا،...... لیکن اس کے باوجود میں خوب جانتا ہون کہ حسین اب تک اپنی "کسرویت" کے ایوان سے اُترنے کے لئے اور اپنی "قیصریت" کی گدی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اسے اب تک اپنی "ہاشمی" قوت یا برطانیہ عظمٰی کی امداد کے بھروسہ پر حجاز میں رہنے کی امید باقی ہے، وہ شاید حرم شریف کو عربوں کے خون سے ناپاک کرنا نہیں چاہتا، (!!) جس طرح پہلے عربوں اور ترکوں کے خون سے ملوث کر چکا ہے،........ (ص ۳۵۹، مکتوب مورخہ ۱۳۴۳ ؁ھ)

ابن سعود | سلطان ابن سعود کے قبضہ حجاز سے تین سال پیشتر ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں،

"جدید معاہدہ سے متعلق میں نے ایک مضمون (روح اسلام اور عربی قومیت کا کھلا خط انگریزی قوم اور حکومت برطانیہ کے نام) لکھا ہے، لوگ کہتے ہیں، کہ یہ تحریر آتشیں قلم (قلم من نار) کی لکھی ہوئی ہے، اس کا خاطر خواہ اثر ہوا"

"اس مضمون کی جان یہ تجویز ہے، کہ حجاز میں دنیاے اسلام کے نمایندوں کے مشورہ سے ایک جدید حکومت قائم کیجائے، اور یہ حکومت بالاتفاق غیر جانبدار تسلیم کیجائے، امید ہے کہ آپ اس خیال کی تائید کرین گے، اور عصمت[۱] پاشا نیز دوسرے ترکی سیاست دانون

---

[۱] یہ خط اسوقت کا ہے جب عصمت پاشا لوزان کانفرنس میں شریک تھے، (۱۹۲۲ و ۱۹۲۳ء) (شکیب ارسلان)

سے اس بارے میں گفتگو بھی کریں گے، میں بھی نجد و یمن سے اس تجویز کے پیش کرنے کی تحریک کرتا ہوں ...... سلطان نجد کو پیشتر لکھ چکا ہوں،

انتہائی غور و فکر کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ حجاز کی حفاظت اور حج کے امن و امان کے لئے ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں[۱]،، (ص ۳۲۵)

ایک دوسرے مکتوب مورخہ ۹ محرم ۱۳۴۲ھ (یعنی قبضۂ حجاز سے پہلے) میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کو یہ اطلاع بھی دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ سلطان ابن سعود، جو اب تک سیاست سے الگ تھے، اب اس میدان میں آنے کو تیار ہیں، ان کی خواہش ہے کہ ان کے نمایندے بھی سیاسی کانفرنسوں میں شریک ہوا کریں، اور آپ کے دوست کے تعلقات ابن سعود اور امام یمن سے بہت اچھے ہیں، مراسلات کا سلسلہ برابر جاری ہے اور طرفین کو اعتماد بھی ہے" (ص ۳۲۹)

امان اللہ خان سابق شاہ افغان اپنے تاریخی سفر یورپ کے سلسلہ میں مصر سے گذرے تھے، سید رشید بھی ان سے ملے، پر سکون صحبت کی انھیں تلاش تھی، شاہ افغان کو وہ نصیحت کرنا چاہتے تھے، لیکن شاہ کے حاشیہ نشینوں نے اس کا موقع ہی نہ آنے دیا، آخر مرحوم نے ایک مفصل مکتوب اور تفسیر قرآن کے اجزاء بھیج کر ادائے فرض سے سبکدوشی چاہی، مگر غلام جیلانی خان سفیر اور محمود طرزی کی سازش یا بے اعتنائی سے یہ بھی نہ ہوسکا، اسٹیشن سے واپسی کے بعد تمام کتابیں واپس ملیں، اور امام مرحوم کی تمنا دل ہی میں رہ گئی ...... یہ پوری داستان سید رشید نے اپنے رفیق و ہمدم امیر شکیب سے ایک خط میں دہرائی (ص ۵۰۰، ۵۱۱)

---

[۱] ابن سعود کے قبضۂ حجاز سے پیشتر ہی سید رشید کی یہ رائے تھی، (شکیب ارسلان)

اور آخر میں یہ بھی لکھا:-

"میں نے شاہ کو یہ بھی لکھا تھا، کہ میں نے آپ (امیر شکیب) سے ان کی تعریف سن کر ملنے کی خواہش کی تھی، اور ملکی اصلاح کے متعلق مبادلۂ خیال کا ارادہ ظاہر کیا تھا،

(ص ۵۱۰)

اس پر امیر کا حاشیہ سننے اور پڑھنے کے لائق ہے،

"ہاں میں نے ان کی فرنگیت اور اہلِ انقرہ کی پیروی سے پہلے تعریف کی تھی، اور میرا ارادہ تھا کہ ان کے یورپ پہونچنے پر ان کے شایانِ شان ان کی آؤ بھگت کروں، لیکن جب مصر ہی میں ان کی مغربیت کے علامات نمودار ہوئے، تو میں نے ان سے قطعِ تعلق کا عزم مصمم کر لیا، وہ سوئٹزر لینڈ اور خاص لوزان بھی آئے، جہاں میرا قیام تھا، لیکن میں ان سے نہیں ملا، سید رشید نے مجھے لکھا تھا کہ ان سے ملوں، اور کتابوں کی واپسی کا سبب دریافت کروں، میں نے انھیں جواب دیا کہ میں شاہ سے نہیں ملنا چاہتا،

البتہ تخت کھونے کے بعد وہ مونترو آئے، اور ان کے مصاحبِ خاص نے ٹیلیفون سے کہا، کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کھانے پر مدعو کیا، .... دیر تک باتیں رہیں، میں نے ان کی غلطیاں گنائیں بعض کا اعتراف کیا، اور بعض کی معذرت کی، اور اکثر الزامات کی تردید کی، .... اب غالباً امان اللہ اپنے بیوقوف مشیر کاروں کی نصیحت قبول کرنے پر نادم ہیں، .... لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ انھوں نے اپنے ملک کی آزادی کی پوری حفاظت کی تھی،

(ص ۵۱۰ حاشیہ)

مصطفٰی کمال | کمال اتاترک اور ان کی جماعت کے دوسرے اتراکِ انقرہ کے متعلق

سید رشید رضا اچھی رائے نہ رکھتے تھے، نہ صرف وہ، بلکہ امیر شکیب، امین رافعی، عبدالعزیز شاویش (مرحومین) اور شیخ شاکر جیسے آل عثمان اور ترکوں کے پرستار بھی، ترکان انگورہ کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں،

امین رافعی (ایڈیٹر "الاخبار") عبدالعزیز شاویش، شیخ شاکر اور امیر شکیب عرصہ تک ترکوں کی خاطر اپنی قوم سے جنگ کرتے رہے لیکن ان کے آخری اعمال ظاہر ہونے کے بعد یہ حامی مخالفت میں بھی سب سے آگے تھے،

(ص ۳۱۸، ۳۲۸ - ۴۴۷)

"حب فی اللہ اور بغض فی اللہ" اسی کا نام ہے، اسلامی ہند میں مولانا محمد علی مرحوم کا بھی یہی حال تھا،

ہندو زعماء ہند | ہندوستان اسلامی برادری کا اہم رکن ہے، اسلئے قدرتی طور پر دنیاے اسلام کے دو جلیل القدر رہنماؤں کی باہمی مراسلت میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے،

سید سلیمان ندوی | وفد خلافت کا ذکر کرتے ہوئے مکتوب مورخہ ۱۰ رجب ۱۳۴۴ھ میں لکھتے ہیں:

"اندنوں وفد ہندی (مقیم جدہ) یہاں آیا ہوا تھا، دو روز یہاں مقیم رہا، جسکی وجہ سے میرے تمام کام معطل ہو گئے تھے، صدیق مخلص مولانا (الشیخ) سید سلیمان ندوی، اور ان کے دونوں ساتھیوں سے ہندوستانی وفد کی صحیح اطلاعات ملیں، ان سے ...... کی "اکاذیب" کے بارے میں ہماری سابق رائے کی تصدیق ہوئی، ......" (ص ۲۷۰)

میں نے وفد خلافت سے حجاز میں جمہوری حکومت کے قیام پر گفتگو کی، میں نے ان سے کہا، یہی رائے ہم لوگوں کی بھی ہے، لیکن "مصلحت" کے خیال سے میں اس پر اصرار نہیں کرونگا، امید ہے کہ آپ کی جمعیت بھی اس پر اصرار نہیں کرے گی، رئیس وفد "السید الندوی" نے کہا، جمعیۃ خلافت اس پر اصرار نہیں کرے گی، ہمارے ان کے مقاصد ایک ہیں، "...... (ص ۲۷۰)

حکیم اجمل خان | آپ نے حکیم اجمل خان کے متعلق دریافت کیا ہے، میں انھیں پچیس سال پیشتر سے جانتا ہوں جب وہ یورپ سے واپسی میں قاہرہ اترے تھے، پھر دہلی میں ملاقات ہوئی تھی..... جب ایکی دوبارہ وہ قاہرہ آئے، تو تعلقات کی تجدید ہوئی، تمام علما رکے ساتھ ان کی دعوت کی، اور دوسری دعوتوں میں ان کے ساتھ شریک ہوا۔

حکیم اجمل خان ہندوستان کے مشہور لیڈروں میں ہیں، علم وعمل، عقل وتجربہ ہر اعتبار سے ان کا درجہ بلند ہے مشہور حنفی محدث ملا علی قاری سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔.........

وہ کانگریس اور جمعیۃ خلافت کے بارہا صدر ہو چکے ہیں۔....... وہ زعماً ہند کی صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔......... محمد علی اور شوکت علی کی شہرت سے پہلے بھی ان کا پایہ بلند تھا"........ (ص ۴۰۹-۴۱۱)

امام مرحوم نے جس محبت اور تفصیل سے مسیح الملک مرحوم کا ذکر کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ صاحب المنار کے دل میں مسیح الملک کی کتنی عزت تھی؟ پورے تین صفحوں میں ان کا تعارف کرایا گیا ہے، اور بعض اہم مسئلوں میں انکی رائے بھی درج کی ہے، اس سلسلہ میں امیر شکیب کا حاشیہ بھی قابل ذکر ہے:۔

"حکیم اجمل خان ہندوستان کے ان رہنماؤں میں تھے، جن کے علم وفضل، اخلاص وصداقت پر سب کا اتفاق تھا، افسوس کہ مرحوم سے مجھے شخصی تعارف کا موقع نہ ملا، البتہ رشید بک طلیع کا بیت المقدس سے خط آیا تھا، کہ ہندوستانی لیڈر حکیم اجمل خان .... کی سفارش کرتے ہیں، اور آپ سے خواہش کرتے ہیں، کہ ان سے مبادلۂ خیالات کریں۔..... مذکور الصدر ہندی لیڈر آئے، اور لوزان میں گفتگو رہی، موضوع سخن سیاسی تھا، اس لئے ذکر کرنا مفید نہ ہوگا، بہرحال مسلمانوں کی بھلائی کی باتیں تھیں۔........ اسی سلسلہ میں سید رشید مرحوم سے حکیم اجمل خان کے متعلق

مزید حالات دریافت کرنے کی ضرورت پڑی تھی، حکیم اجمل خان کے انتقال پر سید رشید نے امین رافعی اور امیر شکیب ارسلان کے ساتھ "المنار" کے ایک ہی نمبر میں ان کی بھی تعزیت کی تھی،

(ص ۴۰۹ حاشیہ)

محمد علی | مسئلہ حجاز میں، مولینا محمد علی اور علامہ سید رشید رضا کا باہمی اختلاف کوئی چھپا راز نہیں، مولینا نے "ہمدرد" میں اور علامہ نے المنار میں ایک دوسرے کے خلاف جی کھول کر لکھا، مکتوبات رشیدیہ میں محمد علی مرحوم کا ذکر، مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں بار بار آیا ہے، (ص ۴۱۱-۴۴۹-۴۵۶-۵۹)، لیکن موقع مدح و ستایش میں نہیں، نمونہ کے لئے ایک مکتوب کا اقتباس کافی ہوگا،

"ہندوستان کی واپسی کے بعد، محمد علی اور شوکت علی کی مخالفت (دوران قیام مکہ مکرمہ) سے بھی زیادہ تیز ہوگئی، ان کا خیال تھا کہ ابن سعود کی باگ ان کے ہاتھوں میں ہوگی، اور حجاز پر ان کا کافی اقتدار ہوگا، .... ان کے اس رویہ سے مسلمانان ہند میں ایک نئی پھوٹ پڑگئی ہے"

(ص ۴۵۶)

انصاری | حکیم اجمل خان سے تو باوجود اشتیاق و تمنا کے ملاقات کا موقع ہی نہیں ہاتھ آیا، لیکن ڈاکٹر انصاری خاص کر لوزان مجھ سے ملنے آئے تھے، انھیں غلط طور پر بتایا گیا کہ میں جنیوا منتقل ہوگیا ہوں، بیچارے پیرس لوٹ گئے، اور حسین رؤف بک (سابق وزیر اعظم ترکی) سے اس کا ذکر کیا، حسین رؤف بے نے مجھے پیرس سے اطلاع دی، اور لکھا کہ انصاری دوبارہ مجھ سے ملنے آئیں گے .... اس کے بعد پھر یورپ وہ نہیں آئے اور گذشتہ سال ان کی وفات کی خبر ملی، رحمہ اللہ"

(شکیب ارسلان، حاشیہ ص۴۱۱)

سید رشید مرحوم نے مسیح الملک کے ساتھ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا ذکر بھی بہت محبت و احترام سے کیا ہے،

مکتوبات رشیدیہ کی زبان عربی، اور وہ بھی سید رشید رضا جیسے معجز نگار صاحب قلم کی ترجمہ میں اصل کی آب و تاب بالکل نہیں آسکی ہے، کوشش صرف یہی رہی ہے، کہ اصل مفہوم ٹھیک ادا ہو جائے، پانچسو صفحات سے یہ مختصر سا اقتباس کیا کافی ہو سکتا ہے،

ایک کتاب کے تعارف میں یہ طوالت معلوم نہیں، کس حد تک مستحسن قرار دی جائے گی، بہرحال جو کچھ لکھا گیا ہے، "حکایت" کی لذت سے متاثر اور لطف اندوز ہو کر! اسلئے کسی معذرت کی ضرورت نہین معلوم ہوتی،

دار المصنفین کی نئی تالیف

تابعین رح

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اوران کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانوں کیلئے نمونۂ عمل ہوا اسلئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اسمیں حضرت عمرؓ بن عبد العزیزؒ حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریح وغیرہ چھیانوے اکابر تابعین کے سوانح ان کی علمی مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت للعہ ر

"منیجر"

احسن القصص (یوسف زلیخا)

قدیم ہندوستانی شاعر ہاشمی کی ایک اہم مثنوی

از

جناب ملک محمد باقر صاحب متعلم، لندن یونیورسٹی، لندن

سید میران مصنف احسن القصص علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۵ھ/۱۶۵۶ء - ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) کے عہد میں گذرے ہیں، وطن بیجاپور تھا، سید شاہ ہاشم علوی بیجاپوری کے مرید تھے، اس نسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے[1] ہاشمی کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں، سال وفات مختلف کتابوں میں مختلف درج ہے، تذکرۂ الشعرائے[2] دکن میں سال وفات ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء تحریر ہے، جو یقیناً غلط ہے، تمام متداول تذکروں کے بیان کے مطابق ہاشمی شاہ ہاشم اور علی عادل شاہ کے معاصر تھے، شاہ ہاشم اور علی عادل شاہ ثانی بالترتیب ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء[3] اور ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء[4] تک بقید حیات تھے، اسلئے ہاشمی کا ۱۱۹۰ھ/۱۷۸۴ء یعنی اپنے معاصرین سے ایک سو سال بعد تک زندہ رہنا، ناقابل یقین ہے، گل رعنا[5] کے مصنف نے ہاشمی کا سال وفات ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء لکھا ہے لیکن

---

[1] روضۃ الاولیاے بیجاپور ص ۹۴، بساتین السلاطین ص ۴۳۲، تذکرۂ شعراے دکن ص ۱۲۰۲، گل رعنا ص ۲۶، ص ۳۲۱

[2] ص ۱۲۰۲ [3] روضۃ الاولیاے بیجاپور ص ۹۴ [4] MOHMMADAN DYNASTIES ص ۳۱۰ ورق ۳۱۰ [5] گل رعنا ص ۲۷

بساتین السلاطین، مخطوطہ انڈیا آفس ورق ۳۱۰ [5] گل رعنا ص ۲۷

یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، ہاشمی نے اپنی تصنیف احسن القصص ۱۰۹۹ھ ۱۶۸۸ء میں ختم کی تھی، اور یقیناً وہ اس سال تک زندہ تھا، اُردوے قدیم کے مصنّف نے اعراس بزرگان کے حوالہ سے ہاشمی کے انتقال کی تاریخ ۱۱۰۹ھ ۱۶۹۷ء مقرر کی ہے، جو غالباً درست ہے، لیکن یقین سے صرف یہی کہا جا سکتا ہے، کہ وہ ۱۰۹۵ھ ۱۶۸۴ء تک ضرور زندہ تھا، کیونکہ اسی سال اس نے احسن القصص کی تکمیل کی تھی،

ہاشمی کے دوسرے سوانحِ حیات کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ علم نہیں، کہ وہ اندھا تھا، اس حقیقت کا اظہار ہاشمی نے بار بار اپنی تصنیف احسن القصص میں کیا ہے، ملاحظہ ہو،

میرے ہاتیں کچھ بی ہوتا قلم ۔۔۔ نہ اپسیں دکھاتا میں عالم سوں کم

و لے کیا کروں مجبو ہے لاعلاج ۔۔۔ ہریک کوئی عاجز ہے انکھیاں کے باج

احسن القصص ایک طویل مثنوی ہے، ہاشمی نے اسکو ذہن میں رکھنے کے بعد صفحۂ قرطاس پر منتقل کرائی تھی، یہ کام بہت دشوار ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ہاشمی کو صانعِ ازل نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا، ہاشمی نے خود اپنی صعوبت کا بیان یوں کیا ہے،

مشقت ہے میری دیکھو تنک ۔۔۔ بولوں ہیں بتیاں تو رہے یاد تنیک

تو اس سارے قصے کوں ترتیب سوں ۔۔۔ رکھوں یاد کیوں میں میری جیب سوں

خدا کا فضل مجبو تھا بیحد ۔۔۔ رکھیا یاد قصے کوں پاکر مدد،

مثنوی کی تکمیل پر شاعر خود اپنے کام پر متعجب ہے۔ اور اس کا اظہار ان اشعار میں کرتا ہے،

تعجب ہے ہو یگا تہا ر تہار ۔۔۔ انکھیاں نیں پرویا کیوں موتیاں کے ہار

ل ۵۱ و ۵۲ احسن القصہ ورق ۳۳ و ۳۴ ۵۳ بمبئی زبان (پنجابی) ۵۴ احسن القصص، ورق ۳۰۵ ۵۵ جگہ جگہ جا بجا ۵۶ نہیں

جگت یوں پڑے ناؤں کا تیری باٹ ۔۔۔ انکھیاں دو نین ہیں ہو کیا ہو کتاب[۱]

ہاشمی کی ظرافتِ طبیعت اور قوت کے متعلق بساتین السلاطین کے مصنف محمد ابراہیم زبیری نے ایک پر لطف واقعہ بیان کیا ہے، جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کیا جاتا ہے، بہت ممکن ہے کہ ہاشمی نے سید مسعود خان کے اہلِ خانہ کی ہو بہو تصویر اپنی غزل میں نہ کھینچی ہو لیکن اس تصویر کا اصل کے لگ بھگ ہونا بھی اندھے شاعر کا معجزہ ہے، افسوس ہو کہ یہ غزل محفوظ نہیں رہی ورنہ واقعات پر قیاس کرنے کا زیادہ موقع ملتا،

"وسید ی مسعود خاں با ہاشمی رابطۂ اخلاص بل اعتقادِ عظیم داشت، روزے کہ در مجلس با حرم نشستہ بود ہاشمی را اندرون محل طلبید، اہلِ حرم بہ اعتماد آنکہ بصیرت پر وانکردہ بجاے خود اقرار گرفتہ بودند، چوں ہاشمی اندرون در آمد، ہمینکہ در محل قدم گذاشت شعرے آغاز نمود، کہ دران غزل شکل وشمایل ورنگ لباس کہ حرم دراں وقت پوشیدہ بودند واقسام زیوری کہ برتن داشتہ تمامی من وعن شرح گویا دیدہ می گوید، چوں اہلِ حرم دیدند کہ حسب حال ہر یک از ما شکل وشمایل ورنگ لباس بیان می کند آں ہمی نخواہد بود بیکبارگی از جا جستہ برمیدند، ودر پردہ شدند"[۲]

کہا جاتا ہے کہ ہاشمی نے احسن القصہ کے علاوہ یوسف زلیخا ایک دیوان ریختی اور کچھ مرثیے بھی لکھے تھے[۳]، محمد ابراہیم زبیری نے اپنی تصنیف بساتین السلاطین میں ہاشمی کے ذکر میں اُسکی تصنیفات یوسف زلیخا اور دیوان کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:۔

"ونیز از جملہ ہندی گویان آنزمان یکے میان ہاشمی است کہ فیض لعاب دہن مبارک

---

[۱] احسن القصہ، ورق ۵۵، ۲ [۲] بساتین السلاطین مخطوطہ برٹش میوزیم، ورق ۲۹۰ [۳] اردو شہ پارے صلہ، اردوے قدیم ص۱۹، تاریخ ادب اردو صہ،

حضرت سید شاہ ہاشم قدس سرہٗ زبان شیریں بیان کشادہ از سخنوران گوے سبقت ربودہ قصۂ یوسف زلیخا را بہ محاورۂ آن زمان بزبان دکھنی نظم نمودہ و دیوان غزل مشتمل بر مضامین سنجیدہ و تلازمات شعریہ ہم دارد کہ مقبول طبائع افتادہ و در شعر طرزی نادر و روشنی غریب ورزیدہ کہ کسے بر وسبقت نہ کردہ باوجودیکہ بصیر مادر زاد بود، امّا بہ بصیرت چشم دلش بینا۔[۵۱]

اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی نے یوسف زلیخا اور غزلیات کا دیوان مرتب کیا تھا، یہ دونوں تصنیفات اب تک مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، یوسف زلیخا کے مخطوطے حکیم شمس[۵۲] اللہ قادری کے پاس اور کتب خانہ مخطوطات مشرقیہ مدراس، اور جرمن[۵۳] اورنٹیل سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں، ریختی کے دیوان کا ابھی تک ایک ہی مخطوطہ دستیاب ہوا ہے، جو آغا حیدر[۵۴] حسن صاحب دہلوی کے کتب خانہ میں ہے، ہاشمی کے چند مراثی اڈنبرا یونیورسٹی لائبریری کی بیاض مراثی میں شامل ہیں، ہاشمی کی ان تصنیفات کے روشنی میں آجانے سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے، کہ اس نے مندرجۂ ذیل اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی؛ اور اس کے نتائج افکار مخطوطوں کی صورت میں اب تک محفوظ ہیں۔

۱۔ مثنوی (یوسف زلیخا)

۲۔ غزلیات (دیوان ریختی)

۳۔ مراثی (جو اڈنبرا یونیورسٹی کی بیاض میں شامل ہیں)

---

[۵۱] بساتین السلاطین ص ۳۲۴، مخطوطہ انڈیا آفس، ورق ۲۱۵ - ب، [۵۲] اردوے قدیم ص ۱۳۴،
[۵۳] فہرست کتب خانہ جرمن اورنٹیل سوسائٹی جلد دوم ص ۹۶،
[۵۴] اردو شہ پارے، ص ۴۲،

سید محی الدین قادری[۱] پہلے تذکرہ نگار ہیں، جنھوں نے یہ لکھا ہے، کہ مندرجۂ بالا تین تصنیفات کے علاوہ ہاشمی نے احسن القصص کا ترجمہ بھی کیا تھا، اور یہ تصنیف یوسف زلیخا سے علحدہ تصنیف ہے، اس بیان کی تائید میں قادری صاحب نے پیرزادہ غلام محی الدین کی سند پیش کی ہے، جس کی تصنیف احوال سلاطین بیجاپور کے مخطوطہ سے راقم کو ہاشمی کے متعلق صرف مندرجۂ ذیل اندراج حاصل ہوسکا ہے، پیرزادہ غلام محی الدین کا بیان ہے:۔

"وسوائے اینان بسیار شعر فرس گویاں و ہندی گویاں بودند، چنانچہ یکے از آنہا ہاشمی است کہ بزبان ہندی احسن القصص را در سلک شعر (..... ؟) کشیدہ[۲]"

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی نے احسن القصص کو قدیم ہندوستانی (جسے اس وقت ہندی کے نام سے پکارا جاتا تھا) میں منظوم کیا، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، بساتین السلاطین کے مصنف کا بیان ہے، کہ ہاشمی نے یوسف زلیخا کے قصے کو منظوم کیا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوسف زلیخا اور احسن القصص ایک ہی تصنیف کے دو مختلف نام ہیں، یا قادری صاحب کے قول کے مطابق یہ دو مختلف تصنیفات کے نام ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے، قادری صاحب اصل تصنیف تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے اس غلط نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یوسف زلیخا اور احسن القصص ہاشمی کی دو مختلف تصنیفات ہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، ہاشمی کی یوسف زلیخا کے اب تک تین ہی مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں، اور بدقسمتی سے قادری صاحب کو ان میں سے کوئی نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، حالانکہ ان تین نسخوں کے علاوہ برٹش میوزیم میں بھی ایک نسخہ محفوظ ہے، برٹش میوزیم کے عظیم الشان کتبخانے کو دیکھ کر جہان علمی ذخائر کو جمع کرنے کی کوشش پر عجائب خانے کے کارپردازوں کو داد دینی پڑتی ہے، وہاں آدمی یہ شکایت کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا

---

[۱] اردو سے شہ پارے ص۳ [۲] احوال سلاطین بیجاپور، ورق ۳۱

کہ اب تک ان ذخائر کی تفصیلات کو مرتب کرنے کی پوری سعی نہیں کی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک بہت سی قدیم اور علمی کتابیں انبار کی صورت میں کتبخانہ میں جمع ہیں، اور چونکہ اس انبار تک پڑھنے والوں کو پہنچنے بھی نہیں دیا جاتا، اسلئے نہیں کہا سکتا، کہ اس ڈھیر میں کیا کیا جواہر نہاں ہیں،

خوش قسمتی سے راقم کو ایک ایسا مخطوطہ برٹش میوزیم میں ملا جس کے متعلق ایک دستی فہرست میں صرف اتنی تفصیل درج ہے، "یہ ایک دکنی مخطوطہ ہے" مخطوطہ نکلوا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ہاشمی کی وہی تصنیف ہے، جسے یوسف زلیخا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جس کا اور کوئی نسخہ اب تک انگلستان میں نہیں پایا جاتا، ہاشمی کی یہ طویل مثنوی ۱۱×۰ اکے ۲۳۲ اوراق پر مشتمل ہے، ایک صفحہ میں اوسطاً گیارہ سطور ہیں، برٹش میوزیم کا مذکورہ مخطوطہ محی الدین خان سکنہ نہادر کا لکھا ہوا ہے، تاریخ کتابت گیارہ شوال ۱۲۵۵ھ / ۱۹۳۹ء درج ہے، لیکن ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء کی بجائے سہواً ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۹ء لکھا گیا ہے، اس مخطوطے کے مطالعے سے راقم کو یہ پتہ چلا کہ یوسف زلیخا اور احسن القصص ہاشمی کی ایک ہی تصنیف کے دو نام ہیں، اور قادری صاحب سے ان ناموں کو دو مختلف تصانیف سے منسوب کرنے میں غلطی ہوئی ہے، نہ جانے کیوں ہاشمی نے کتاب کا نام احسن القصص کی بجائے احسن القصہ رکھا ہے، بہرحال راقم بھی اسے اسی نام سے منسوب کریگا،

مثنوی کے آغاز میں ہاشمی نے اپنی اس مثنوی کے متعلق لکھا ہے،

کہ یو قصہ توں بول عرفان سوں   کتا ہوں[1] کے اب دکھنی سن کان سوں

کہا احسن القصہ جس کوں خدا   کتا ہوں میں اس کا تجھے ابتدا[2]

مثنوی کے آخر میں ہاشمی نے مصرعۂ مثنوی کے اسی نام کا اعادہ کیا ہے:-

مصر میں کئے جیونکہ یوسف نے راج   سنہار کوں تیوں ہوا رام آج

---

[1] کہتا ہوں [2] احسن القصہ، ورق ام،

لکھن ہار کا ہوئے تازہ دماغ نز نہار کا ہوئے دل باغ باغ
رکھیا احسن القصہ رب جس کا نام تجھے کھول کر میں اد بولیا تمام[۵۱]

اس سے کچھ آگے جہاں اُس نے مثنوی کے نفس مضمون یا دوسرے نام کا ذکر کیا ہو وہاں اسے زلیخا کے قصے کے نام سے پکارا ہو،

اگر توں بی[۵۲] اپنا منگے رکھنے نام زلیخا کے قصہ کوں کر اب تمام[۵۳]

ہاشمی کے ان اشعار سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ احسن القصہ اور یوسف زلیخا اسکی ایک ہی تصنیف کے دو نام ہیں، علاوہ ازیں راقم نے جب سید شمس ا ۔ کے مملوکہ مخطوطۂ یُوسف زلیخا کے اقتباسات کا مقابلہ برٹش میوزیم کے مخطوطۂ احسن القصہ سے کیا، تو معلوم ہوا، کہ یہ اقتباسات ایک ہی کتاب کے ہیں[۵۴] اس لئے یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ احسن القصہ اور یوسف زلیخا ہاشمی کی دو مختلف تصانیف کے نام ہیں،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احسن القصہ کے متعلق جو معلومات اس کے مخطوطے سے بہم پہنچ سکی ہیں، وہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں،

ہاشمی کے سوانح حیات کے متعلق جو کچھ اس کی تصنیف احسن القصہ اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہو سکتا ہے، وہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے،

علی عادل شاہ ثانی والیٔ بیجاپور کے دربار کا شاعر، ملک الشعرا نصرتی تھا جس کا انتقال ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی کو نصرتی کا ہم عصر ہونے کے باوجود اس کی جیسی شہرت اور قبولیت نصیب نہ ہوئی، چنانچہ بساتین السلاطین اور احوال سلاطین بیجاپور کے

[۵۱] احسن القصہ، ورق ۱۵۱، [۵۲] بھی سے [۵۳] احسن القصہ ورق ۲۵۲، [۵۴] سید شمس اللہ نے اردوے قدیم کے ملحقات میں ص ۳۰ پر یوسف زلیخا کے مخطوطہ سے جو اقتباس دیا ہے وہ برٹش میوزیم کے مخطوطہ احسن القصہ کے ورق ۱۵ ۲ کے مطابق ہے،

مصنفین نے جس مدحیہ انداز میں نصرتی کا ذکر کیا ہے، اس سے کہیں کم تعریفی کلمات ہاشمی کے لئے استعمال کئے ہیں، ہاشمی خود بھی نصرتی اور اسکی شاعری کا معترف ہے، چنانچہ جہاں اُس نے یہ بیان کیا ہے کہ بقائے نام کی خواہش نے اُس سے مثنوی احسن القصص لکھوائی ہے، وہاں اُس نے فارسی کے نامور شعرا کے علاوہ نصرتی اور اسکی دو مثنویوں علی نامہ اور گلشن عشق کی بھی داد دی ہے

ہوئے ہیں جکوئی آج لک[۱] نام دار | گئے ہیں یکیک اس کو اد یادگار
رہا سد کد ستے[۲] سکندر کا نام | رہا نام جم کیا کسر کو جام
اول کوئی رستم اتھا[۳] تیغ زن | رہا نام اس کا تو م ... رو (؟) کدھن
گئے کر کر لقمان حکمت کے کام | اویتی رہیا ون کا جگیں یو نام
عدالت سون نوشیرواں کا ہے ناوں | سخاوت میں حاتم ہوا ٹھاؤں ٹھاؤں[۴]
جیسے جو سکت تھی کیا ویسے کام، | اوسیتی رہا اُن کا عالم میں نام،
سکت داروں کے ناؤں ہے ٹھاؤں ٹھاؤں | تو کیوں بے سکت کا رہے جگ میں ناؤں
جو پیچ[۵] ناؤں رکھنے کون منگتا ہے آج | تو میں یک کتا[۶] ہون تجھے کر علاج

.. ..

خدا پاس توفیق سے منگ شتاب | تیرا ناؤں ہو تو[۷] رہے جو بولے کتاب
کہیں ہیں جکوئی مرد شیریں کلام | اُنو کا بی[۸] لیتا ہون میں بعضے نام[۹]

اِن اشعار کے بعد ہاشمی نے فارسی شعرا، عنصری، سعدی، خسرو اور جامی کے نام گنوائے ہیں، اور ان کی تعریف کے بعد نصرتی کے متعلق لکھا ہے،

[۱] تک [۲] سے [۳] تھا [۴] ٹھاؤں ٹھاؤں یعنی جا بجا [۵] پیچھے [۶] کہتا، [۷] تو، [۸] ان کا [۹] بھی، [۱۰] احسن القصص، ورق ۲۵۱،

دکھن میں ہوا نصرتی پُر ہنر جو ہے شعر جس کے سکل معتبر،[۵]

علی نامہ، گلشن[۶] کا قصہ بنا دیا زیب و زینت دکھن کوں سدا[۷]

ہاشمی نے مثنوی احسن القصہ اپنے پیر و مرشد شاہ ہاشم کے ایما پر منظوم کی تھی، ہاشمی کے قول کے مطابق یہ مثنوی ۱۰۹۹ھ میں تکمیل کو پہنچی، اور اس میں کل پانچہزار ایک سو بیاسی ابیات ہیں، برٹش میوزیم کے مخطوطے میں تمام ابیات محفوظ ہین،

کہا شاہ ہاشم مجھے یوں نواز دیا واں ایمان کر سر فراز

عنایت کا جب مجھ کو کھولیا ہے باب منگیا کرنے میں تب مرتب کتاب

اگر کوئی بیتوں کا پوچھے شمار کہ یک سو بیاسی رہے پنج ہزار،

مرتب کیا میں یو قصے کوں تو ہزار برس پر تھے جو نو دو پہ نو،

میرا شعر دلسوں سنے گا جنے مرے حق میں ایمان منگیگا اونے،

کہ الحمد للہ یو قصہ تمام، ہوا سو محمد پہ ہے نت سلام[۸]،

مثنوی احسن القصہ کے مضامین جامی کی یوسف زلیخا، اور احسن القصص کی دوسری روایات کے مطابق ہیں، چونکہ ہاشمی مادرزاد اندھا تھا، اسلئے ظاہر ہے، کہ اس نے کوئی کتاب مطالعہ نہین کی، اور اسکی تصنیف احسن القصہ کسی پہلی لکھی ہوئی کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں، بلکہ اس نے سنی ہوگی، متداول روایات کی مدد سے اپنی مثنوی مکمل کی، اور اس خوبی سے تمام واقعات کو قلبند کیا، کہ مثنوی کے مطالعہ کے بعد اس کے ذہن رسا کی داد دینی پڑتی ہے، احسن القصہ کی زبان وہی قدیم ہندوستانی ہے، جو ہاشمی کے زمانے میں ہندوستان میں بولی سمجھی اور لکھی جاتی تھی، موجودہ ہندوستانی سے قدیم ہندوستانی متعدد حیثیتوں سے مختلف ہے، اسلئے

---

[۵] سب، [۶] گلشن عشق، مصنفہ نصرتی [۷] احسن القصہ ورق ۲۵۲ [۸] ورق ۲۵۵،

اس زمانے میں احسن القصہ کی زبان کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس زمانے کے شعرا مثلاً نصرتی، شاہ ملک یا امین کی تصانیف سے جب ہاشمی کی مثنوی کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ ہاشمی پُرگو ہونے کے باوجود نہایت سلیس نگار تھا، چنانچہ وہ خود بھی کہتا ہے، :-

اگر توں بی اپنا منگے رکھنے نام ۔۔۔ زلیخا کے قصہ کوں کراب تمام،
سواس شعر کیتیں توں کینے سوں بول ۔۔۔ یو معلوم ہوئے ہر کسی کوں دکھول
سلیس بول قصہ جو ہے ہوشمند ۔۔۔ سلیس کون کریں عاقلاں سب پسند
سلیس بولنا نازکی کا ہے کام ۔۔۔ سلیس کوں عزت ہے جگ میں تمام[1]

مثنوی کی ابتدا حمد و منقبت سے ہوتی ہے، اس عہد کے دوسرے شعرا کی طرح درباری شاعر ہونے کے باوجود ہاشمی نے حاکم وقت کی مبالغہ آمیز تعریف سے پرہیز کیا ہے، بلکہ اپنی تصنیف کی مقبولیت کے لئے بھی خدائے عزوجل سے دعا مانگی ہے۔ یہ دعا خلوص جذبات کا نہایت پاکیزہ نمونہ ہے، اسلئے قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کیجاتی ہے،

دُعا

جو کوئی داد گر ہور اچھیں باشعور ۔۔۔ پڑھا شعر میرا توں انکے حضور،
اوریچھیں میرے پر تجھو نہیں ہوشاد ۔۔۔ میں خشنود اچھوں ہور دیویں سواد
میرا شعر کر بادشاہاں پسند ۔۔۔ پسند کر کے راکھیں جو سب ہوشمند
میرا شعر بس علم کا دے ہنر ۔۔۔ جو عالم ہوین سنکہ خوش مجھ اوپر
میرے شعر میں دے شجاعت کا بل ۔۔۔ تو خوش ہوئے سن کر دلیران سکل

[1] احسن القصہ، ورق ۲۵ ب ۲ ۔ ورق ۲۰،

میرے شعر میں عشق ہو عیش بھر، تو عاشق رکھیں دلمیں تعویذ کر،
میرے شعر میں وے لطافت کے زیب جو عاشق ہوویں سنکہ دہن فریب
طبع کوں ادک کر میرے دن بدن جو کچھ دلمیں لا آؤں سو بولوں یقین
میرا شعر جگ کوں دیکھا با نمک لو لذت لگے ہو تمندا نکوں جک
میرا شعر جگکون دیکھا کر سری ہر یک کس کون پڑنیکیں دے اُسی
پڑہنار کا کرتوں تازہ دماغ سنہار کا کرتوں دل باغ باغ

یہ مضمون تشنہ رہے گا، اگر مثنوی احسن القصۃ کا کچھ انتخاب درج نہ کیا جائے، اسلئے قارئین کی دلچسپی کے لئے وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں ہاشمی نے کائنات میں عشق کے مظاہر اور عشق کی اہمیت کی وضاحت نہایت فلسفیانہ انداز میں کی ہے، اس نظم سے احسن القصۃ کی زبان کا اندازہ بھی قارئین کر سکین گے،

عشق

ہر یک شے میں گو یا سو مندبر[۱] فراغ ویسے عشق تسیں ہوا نور چراغ
کہ جیوں کوئی شیشہ نین[۲] بھرتا ہے رنگ ویسے عشق ہر شے میں تیوں بیدرنگ
اگر عشق میں[۳] ہے تو چندر کوں نور تو کیا واسطے نت[۴] یو دیتا ہے سُور[۵]
اگر عشق نین ہے تو دریائے آب پلاتا ہے بادل کوں کئے بحیاب[۶]
اگر عشق نیں ہے تو کے دہرتری[۷] نوئی[۸] ذتیں کرتی ہے کسوت ہری
اگر عشق نیں ہے تو کے پھوبن رہے جلوہ گر ہو کہ[۹] چاروں کدھن
اگر عشق نیں ہے تو کے تُمار تھار پریشان ہو بارا پھرے جک مجہار

۱ سمندر ۲ نہیں ۳ ہمیشہ ۴ سورج ۵ کیون ۶ زمین ۷ نئی ۸ کے

اگر عشق نیں ہے تو شبنم یو رو ۔ گگن[1] نت کے پھرتا پریشان ہو
اگر عشق نیں ہے تو کے نس[2] سنوار ۔ لے آئی سنگاتی[3] ستاریاں کا بہار[4]
اگر عشق نیں ہے تو کے باغ باغ ۔ پھریں کو لالاں جلکہ[5] ہو داغ داغ
اگر عشق نیں ہے تو کے یو چکور ۔ نین[6] میں دیا ہے سو چند رکوں شور[7]
اگر عشق نیں تو پپیا[8] ہو تند ۔ پکرتا ہے کے سوانت کا مونیں[9] وند

ہاشمی کی تصنیف احسن القصہ سے تیس سال قبل ابن نشاطی نے ۱۰۶۵ھ میں اپنی معرکۃ الآرا مثنوی پھولبن میں اسی قدیم ہندوستانی زبان میں اسی موضوع یعنی کائنات میں عشق کے وجود پر ایک نظم لکھی تھی، دونوں نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہاشمی نے ابن نشاطی کی نظم ضرور دیکھی تھی، اور اس نظم سے وہ اسقدر متاثر ہوا تھا کہ بعض مقامات پر توارد واقع ہو گیا ہے، ابن نشاطی کی نظم ملاحظہ ہو:

عجب کچھ عشق ہے کچھ عجب عشق ۔ جدھر دیکھے ادھر سب عشق ہی عشق
اگر نیں عشق تو عالم ہوا کیون ۔ مٹھی بھر خاک سوں آدم ہوا کیون
اگر نیں عشق تو یوں آگ جوشاں ۔ دریا کیا واسطے ہوتا خروشاں
اگر نیں عشق تو یوں عمر سارا ۔ پریشاں ہو کے کیے پھرتا ہے بارا
اگر نیں عشق تو کے سبز ہیں جھاڑ ۔ کھڑے کے پاؤں اپنے کاریوں پاڑ
اگر نیں عشق تو ں تن کوں لا خاک ۔ سبب کیا رات دن پھرتا ہے افلاک
اگر نیں عشق تو اسدھات تلمل ۔ ہر یک جا کیا بدل روتا ہے بادل
اگر نیں عشق تو یوں کے جلے آگ ۔ ہمیشہ کائی کوں اٹھتے ہے یوں جاگ

[1] آسمان [2] رات [3] ساتھ [4] باہر [5] جل کے [6] آنکھوں [7] جگہ [8] پپیہا [9] شور ، یہ نظم احسن القصہ کے اوراق ۲۴، ۲۵ سے نقل کی گئی ہے۔

اگر نیں عشق تو وہ برھنی دھن چلے کیوں چھوڑ اپنا مال ہور دھن[1]

اس مضمون کی ترتیب میں مندرجۂ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے،

۱۔ **فہرست کتب خانہ جرمن اورنٹیل سوسائٹی**:۔ جلد دوم مطبوعہ لائپزگ سنہ ۱۹۱۱ء

۲۔ **احسن القصہ**:۔ مصنفہ ہاشمی مخطوطہ برٹش میوزیم اورنٹیل ۱۱۲۶۸،

۳۔ **بساتین السلاطین**: مصنفہ محمد ابراہیم زبیری مطبوعہ حیدرآباد سنہ ...، مخطوطہ کتب خانہ انڈیا آفس فارسی ۳۴۰۲، مخطوطہ کتبخانہ برٹش میوزیم ایڈیشنل ۲۶۲۶۹،

۴۔ **منتخب اللباب** جلد سوم، مصنفہ محمد ہاشم خافی خاں، مطبوعہ کلکتہ، سنہ ۱۹۲۵ء

۵۔ **انوار سہیلی**:۔ مترجمہ محمد ابراہیم بیجاپوری، مطبوعہ مدراس، سنہ ۱۸۴۰ء،

۶۔ **تذکرہ شعرای دکن**، جلد دوم مصنفہ مولوی عبدالجبار، مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۳۲۹ھ

۷۔ **گل رعنا** مصنفہ مولوی عبدالحی صاحب مطبوعہ اعظم گڈھ، سنہ ۱۳۴۳ھ،

۸۔ **اردوی قدیم**، مصنفہ حکیم شمس اللہ قادری، مطبوعہ لکھنو، سنہ ۱۹۳۰ء،

۹۔ **اردو شہ پارے** مصنفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری، مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۹۲۹ء،

۱۰۔ **تاریخ ادب اردو**، مصنفہ ڈاکٹر گرہیم بیلی مطبوعہ کلکتہ، سنہ ۱۹۳۲ء،

۱۱۔ **روضۃ الاولیاے بیجاپور**، مصنفہ محمد ابراہیم زبیری مطبوعہ رائچور سنہ ۱۳۰۳ھ،

۱۲۔ *Mohammadan Dynasties* مصنفہ لین پول مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۲۵ء

۱۳۔ **بیاض مراثی** ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری،

۱۴۔ **احوال سلاطین بیجاپور**، مصنفہ پیرزادہ غلام محی الدین مخطوطہ کتبخانہ برٹش میوزیم ایڈیشنل ۲۶۲۴۰،

۱۵۔ **پھول بن**:۔ مصنفہ ابن نشاطی مخطوطہ کتبخانہ انڈیا آفس، فارسی، ۱۴۱

[1] پھول بن، ورق ۴۳

افکارِ مضطر

از

جناب مولینا بدر الدین صاحب علوی، استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈہ

"کلام لطف" کے عنوان سے میرا ایک مضمون معارف نومبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا، جس میں استاذ العلماء حضرت مفتی محمد لطف اللہ صاحبؒ کے والد مولوی اسد اللہ صاحب کا ضمنی تذکرہ آگیا تھا، اس کو دو سال ہوئے طبیعت بیچین ہے، کہ پھر حضرت کے سلسلہ سے کسی موضوع پر قلم کو جنبش ہو ع

بازگو از نجد و از یارانِ نجد

اس وقت اور تو کچھ نہ ہو سکا، مولوی اسد اللہ صاحب ہی کے چند نتائجِ افکار حوالۂ قلم ہیں،

مولوی اسد اللہ صاحب کو خدا نے دو نعمتیں دیں، سب سے بڑی جو رحمتِ الٰہی کہی جا سکتی ہے، یہ تھی کہ استاذ العلماء جیسا فرزند عطا فرمایا، جن کے فیض[1] نے ایک عالم کو عالم بنا دیا، تین بھائیوں کے بیچ میں خدا نے یہ فرزند دیا، باپ نے بجا طور پر "چراغم" تاریخ کہی، جو چراغ من بھی ہے، اور چرا غم پڑھیے، تو اس میں (چرا استفہام انکاری ہو کر) غم کی نفی بھی، بیٹے کی سعادتمندی دیکھئے، کہ باپ کے آخر وقت میں ایسی تیمارداری کی جسکی نظیر شاید نہ ملے گی، دوا لینے کے لئے بلکنہ سے کول چودہ میل پیادہ پا جانا، اور دن کے دن واپس آنا مدتوں تک روزانہ معمول رہا،

---

[1] ندوۃ العلماء کا اجلاس تھا، استاذ العلماء صدر شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا جم غفیر شریک تھا، ایک شاگرد رشید کی زبان سے بیساختہ یہ جملہ نکلا، میرے استاد نے ایک عالم کو عالم بنا دیا،

دوسری نعمت ذکاوت تھی، جس کے لئے وہ مشہور تھے، اسی ذکاوت کا نتیجہ تھا، کہ سنین عیسوی کا ایسا قاعدہ دریافت کیا، جس سے غیر متناہی زمانہ کی تاریخوں کے دن معلوم کرسکتے ہیں،

اس قاعدہ کے استخراج کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں، منشی نبی بخش سالک اکبرآبادی نے ازراہ تعجب ایک جنتری کا ذکر کیا جس سے بارہ سال کی تاریخیں معلوم ہوسکتی تھیں، مولوی اسد اللہ صاحب نے فرمایا، کہ عیسوی سنین کی ایسی جنتریاں بن سکتی ہیں، کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، مگر منشی جی تعجب پر قائم رہے، اور طنزاً کہا آپ تو بڑے ذہین مشہور ہیں، آپ ہی نے کوئی ایسی جنتری بنائی ہوتی، مولوی صاحب نے اس وقت خاموشی اختیار کی لیکن جلد ہی یہ قاعدہ تیار کرکے منشی جی کا تعجب دور کردیا، بلکہ اور تعجب بڑھا دیا،

اس[1] قاعدہ کے ذریعہ ہر عیسوی سنہ کے ہر مہینہ کی یکم تاریخ کا دن معلوم کرسکتے ہیں، اس کے بعد مہینے کے پورے دن معلوم ہو جاتے ہیں،

۱۔ مہینوں کا تعلق دنوں سے قرارِ دیگر اشعار ذیل میں بیان کر دیا ہے،

اکتوبر و جنوری بہ یک شنبہ بدان — دوشنبہ پی منی بگوئیم عیان
سہ شنبہ اگست پنجشنبہ درجون — جولائی و اپریل بہ شنبہ مقرون
بے شبہہ چہار شنبہ مارچ خوانی — ہم فروری و نومبر او را دانی
در جمعہ ستمبر و دسمبر باشد — این نکتہ بہ از ہزار گوہر باشد

۲۔ جس سنہ کے کسی مہینہ کی یکم کا دن معلوم کرنا ہے، اسکو سوایا کریں، سوایا کرنے میں کبھی کسر آئے گی، ایسی حالت میں اسکو کامل کرکے ایک پورا عدد بڑھالیں اور مجموعہ کو سات پر تقسیم کریں،

---

[1] اس قاعدہ کو منشی رحمت اللہ رعد مرحوم نے اپنی بڑی جنتری سنہ ۱۸۹۱ عیسوی میں ص ۴۰ پر بہت خوبی سے چھاپا تھا،

جو باقی رہے اسکو ذہن میں محفوظ رکھیں، اگر تقسیم سے کچھ باقی نہ بچے، تو سات ہی کو ذہن میں رکھیں
اب دیکھیں کہ اشعار میں اس مہینہ کا تعلق کس دن سے ظاہر کیا گیا ہے، اسی دن سے ایام ہفتہ کو بقدر
اعداد محفوظ شمار کریں جس دن پر شمار پورا ہو، اسی دن مطلوبہ مہینہ کی پہلی تاریخ ہوگی، اگر سنہ
کا سوایا کرنے میں کسر نہ آئے، اور اعداد صحیح حاصل ہوں تو صرف جنوری اور فروری کے لئے مذکورہ
طریقہ پر عمل کریں، اور باقی مہینوں کے لئے سوائے پر ایک عدد بڑھادیں، اسکے بعد تقسیم اور بقیہ
عمل حسب سابق کریں،

مثالیں:-

۱- یکم جون ۱۸۹۱ء: سوایا ۲۳۶۳ ہوا کسر کی تکمیل کے بعد ۲۳۶۴ ہوئے سات سے تقسیم کیا
پانچ باقی بچے، ذہن میں رکھا، اشعار میں دیکھا، تو جون پنجشنبہ سے متعلق ہے، اسلئے پنجشنبہ سے پانچ
دن شمار کئے، دوشنبہ پر شمار پورا ہوا، معلوم ہوگیا، کہ دوشنبہ کو پہلی تاریخ جون کی تھی،

۲- یکم اکتوبر ۱۸۶۰ء؛ سوایا ۲۳۲۵ صحیح ہے، ایک بڑھایا ۲۳۲۶ ہوئے تقسیم کیا، دو باقی
رہے، اکتوبر کا دن یکشنبہ ہے، شمار دوشنبہ پر پورا ہوا، اسلئے یکم دوشنبہ کو ہوئی،

مولوی اسد اللہ صاحب کا شغل قصبہ کول میں وکالت تھا، شعر گوئی کا اچھا ذوق رکھتے
تھے، مضطر تخلص تھا، معاصر شعرا کے کلام میں بھی دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ان کے مکان پر اکثر مشاعرے
ہوا کرتے، اخیر عمر میں ضیق النفس کا عارضہ ہوگیا، جسکی وجہ سے وکالت چھوڑ کر خانہ نشینی اختیار کی،
لیکن شعر گوئی کا ذوق اس قدر بڑھا ہوا تھا، کہ دوروں کی شدید تکلیف میں بھی یہ مشغلہ جاری رہتا،
افسوس ہے کہ ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ موجود نہیں، جو کچھ اشعار دستیاب ہوئے وہ درج ذیل
ہیں، مولوی صاحب کا کلام اپنے زمانہ کی مروجہ روش کا پورا نمونہ ہے، زبان، محاورات اور
بندشیں ہر ایک چیز اسکی شاہد ہے،

مخمس ناتمام

ہمیشہ رہتے تھے آپ ہم پرہ عنایت سے (لطف فرما)　　کمی نہ ہم سے تھی بندگی میں نہ آپ سے تھا عتاب بیجا
یہ کیا غضب ہے خلاف عادت مزاج برہم ہوا (تمھارا)　　چہ شد چہ کردم چہ دیدی ازمن چہ گفت باتو رقیب (رسوا)
چرا چنیں رنجہ گشتی ازمن کجا شد آں لطف واں مدارا

یہ رات آدھی یہ پچھلا پہرا جہاں میں تیرگی ہی بید　　اور آپ نکلے ہیں گھر سے باہر کہاں (کوتے) جا ہو کیا ہے (مقصد)
جو واقعی ہم سے پوچھتے ہو تو ہم کو تم سے گمان بد ہے　　ترا دریں تیرہ شب بخانہ برآمدن بے سبب باشد
ہمہ زراز تو آگہم من بہانہ دیگر مکن خدا را

غزل[۵۲] ناتمام

لے اڑی طرز فغان بلبل نالاں ہم سے　　گل نے سیکھی روش چاک گریباں ہم سے
لاکھ روکا نہ رکا دیدۂ گریان ہم سے　　لوہوا چاہتا ہے نوح کا طوفان ہم سے
پاؤں پھیلائے تو ہی رہنا یہاں اے بلبل　　چھوٹتا ہے کوئی دم میں یہ گلستان ہم سے

---

[۵۱] یہ شتر گربہ ضرور ہے، مگر اس زمانہ کے اساتذہ اس سے گریز نہیں کرتے تھے، یہ ناتمام مخمس میں نے حضرت کی زبان سے سن کر لکھ لیا تھا [۵۲] یہ غزل کسی نے مرزا غالب کو سنائی تھی، مرزا نے بہت پسند کی، اور پوچھا کس کی ہے، سنانے والے نے کہا کول میں ایک مولوی اسد اللہ ہیں، مرزا نے کہا، کیوں نہ ہو، نام کا کمال ہے، (مرزا کا نام بھی اسد اللہ تھا) یہ واقعہ اور اوپر والے دو شعر مجکو حضرت نے سنائے تھے، تیسرا شعر لکھا ہوا ملا ہے،

غزل

جب تلک جلوہ نہ ہو اس غیرت پرچیں کا — کیا خوشی ہو عید کی گو چاند ہو اُنتیس کا

بڑیاں مجکو پنھائیں اور تماشہ کے لئے — اوس نے دروازہ لگایا اپنا مقناطیس کا

میکدے میں جائیو بنت العنب کے خواستگار — دیکھ لو سب شیخ جی کا زہد تھا تلبیس کا

خاکساری اور تکبر کا نتیجہ دیکھ لو — کیا ہوا آدم کا انجام اور کیا ابلیس کا

خط ہمارا لے اڑا مرغ سلیمان باندھ کر — جب ہوا تحریر نام اوس غیرت بلقیس کا

بل بے واژونی ہماری طالع منکوس کی — شکل لحیان بھی عمل کرتی ہی یاں تنکیس کا

کون کہتا ہے اساس زندگی قائم رہی — قافیہ باندھو نہ جس میں صرف ہو تاسیس کا

واہ سودا ہو تو ایسا ہو کہ مضطر اندنون
ہو رہا ہے مشتری اک غیرت پرچیں کا

مسدس

افسوس ہم تو آپ پہ جی تک فدا کریں — اور آپ جا کے غیر کی بزمیں بپا کریں

اب چاہیئے کہ ہم بھی نہ تم سے وفا کریں — پر یہ خیال آتا ہے ہر لحظہ کیا کریں

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

کہنے سے غیر کے ہوے تم ہم پہ گر خفا — اور چھوڑا التفات کو کرنے لگے جفا

بہتر ہے اس سے اور زیادہ ہو بیوفا — ہے اپنا سینہ صورت آئینہ با صفا

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

بہتر ہے آج غیر کی مجلس میں جائیں آپ اور واں ہمارے قتل کا بیڑا اٹھائیں آپ
ہر چند لاکھ طرح سے ہم کو ستائیں آپ پر دخل کیا جو بغض کی بو ہم سے پائیں آپ
کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

اب تک جو میرے حال پہ تھی کم توجہی واللہ تب بھی بندہ کو رنجش ذرا نہ تھی،
اور اب جو مہربان ہوئے ہو یہی سہی تب بھی یہی تھا قول مرا اب بھی ہے یہی
کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

بہکا رہے ہیں تم کو جو اغیار بے حیا تم جانتے ہو مجھ کو کہ یہ بھی ہوا خفا
کیا پوچھتے ہو پیارے کدورت کو دخل کیا مضطر کی قبر سے بھی اُٹھے گی یہی صدا
کفراست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

خطِ منظوم

اٹھ قلم لکھ مرا یہ حال تباہ جانب نورِ چشم لطف اللہ
کہ یہاں سے گئے ہو تم جب سے چین مجکو ملا نہیں تب سے
وہی شدت مرض کی ہے تا حال درد کا اشتداد ہے یکساں

درد ہے یا کہ اک قیامت ہے ۔۔۔ درد ہے یا کہ جی کی آفت ہے
درد سے ایک پل نہیں آرام ۔۔۔ درد سے ہے ہمارا کام تمام
بل بے اس درد کی جفا کاری ۔۔۔ پہروں رہتی ہے بیخودی طاری
درد کے مارے جان جاتی ہے ۔۔۔ بوٹی اک ایک تھرتھراتی ہے
رات دن درد سے ہے دل جینی ۔۔۔ اب تو مشکل ہے سانس بھی لینی
درد کے مارے حال ہے ابتر ۔۔۔ اس سے مرجاؤں میں تو ہی بہتر
رات بھر سر پٹکتے جاتی ہے ۔۔۔ نیند آتی نہ موت آتی ہے
دن کو بھی پھر وہی ہے درد کا دور ۔۔۔ جس نے پہنچا دیا ہے تا لب گور
گر یہی درد ہے تو مرتا ہوں ۔۔۔ جان سے اپنی میں گذرتا ہوں
کاشکے درد میرا ٹل جائے ۔۔۔ ورنہ بہتر ہے جی نکل جائے
سو یہ دونوں نظر نہیں آتے ۔۔۔ اپنے حیراں ہیں غیر گھبراتے

خیر جو کچھ کہ مرضیِ مولیٰ،
از ہمہ بہتر از ہمہ اولیٰ،

مقالاتِ شبلی جلد ہشتم

مولانا شبلی مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ ان کے متفرق مضامین مختلف تجاویز اور منصوبوں پر مشتمل ہے، اس مجموعہ پر سرسری نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑ جاتی ہے، ضخامت ۱۵ صفحے قیمت :۔ ؎

"مینجر"

تلخیص و تبصرہ

قدیم مشرقی طب

از جناب ڈاکٹر اسلم عمر صاحب،

اگست ۱۹۳۸ء کے "انڈین میڈیکل گزٹ" میں انگلستان کے ایک محقق طبیب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں، کہ موجودہ تحقیق کے مطابق یونان اپنے طبی علوم کے لئے فینشیا (ساحلی علاقہ شام)، بابل، سومیر اور مصر کا ممنون ہے، جہاں پانچہزار سال پیشتر تہذیب و تمدن اوج کمال پر تھے، وادی سندھ سے بھی یونان نے طب میں استفادہ کیا ہے، مصر نے تہذیب و تمدن کی تعلیم سمرانیوں سے حاصل کی ہو سومیر بابل کے دو حصوں میں سے ایک کا نام تھا، بابل و کلدانیہ میں آج سے چھ ہزار سال پیشتر تعلیم و تہذیب اعلیٰ درجہ پر تھی، یونانیوں کا عروج اسکے تین ہزار سال بعد ہوا یعنی دنیا کے جس خطہ پر انسانی آبادی کی ابتدا ہوئی تھی، (جو تقریباً دو ہزار سال کے بعد آدمؑ کی دسویں پشت نوحؑ کے زمانہ میں ایک مرتبہ قریب قریب ختم بھی ہو گئی تھی لیکن اسکی نشأۃ ثانیہ بھی پھر وہیں ہوئی) وہیں سے تہذیب و تمدن، تعلیم وغیرہ کا بھی آغاز ہوا، اور اس نے اتنی ترقی کی، کہ ٹوائیلٹ یعنی سنگار کے موجودہ تکلفات بھی سمرانیوں میں موجود تھے،

اسلامی آرین نسل بحیرۂ خضر کے مشرق سے نکلی، اس کی ایک شاخ ایران و قاف میں آباد ہوئی اور دوسری جنوب و مشرق کی طرف حملہ آور ہو کر دریائے سندھ کے پورب میں قیام پذیر ہوئی، قدیم

ایرانی زبان زنل میں "س" اور "ہ" ایک دوسرے سے بدل جاسکتے ہیں، اس لئے یہ لوگ ہندو کہلائے،

اس موقع پر ایک یہ بات قابل ذکر ہے، کہ یہ آرین نسل حضرت نوح کے لڑکے یافث کے بڑے بیٹے ماجوج کی اولاد سے تھے، جو منگولیا میں آباد تھے، (ماجوج معرب ہے میگوگ کا، میگوگ منگول) یہ عجیب بات ہے، کہ تمام مذاہب اور تمام قدیم تہذیبیں عرض البلد درجہ ۵۳ کے آس پاس ظاہر ہوئیں، آریوں کی ویدوں کو برہمانے پندرہ سو سال قبل مسیح لکھا جنین سب سے بڑی اتھرو وید ہے، اور امراض کو دور کرنے والے گنڈوں، منتروں تعویذوں کی کتاب ہے، پھر ایر وید کو لکھا، اور دھنونتری کو پیدا کیا، اس کا شاگرد سسرت ایک بہت بڑا سرجن اور چرک بہت بڑا طبیب تھا، آنکھ کے موتیا کا سیتوں والا علاج سسرت ہی کی ایجاد ہے، وہ ڈوتیری (علم القابلہ) کا بھی عالم اور جنین کی مختلف حالتوں سے واقف تھا، اس نے حاملہ عورتوں کی موت کے بعد پیٹ چاک کرکے بچوں کو نکالا ہے، اگرچہ یہ آپریشن اس سے بھی قدیم زمانہ کا ہے، اس کے زمانہ میں آپریشن روم مخصوص ادویہ کے بخور سے معطر کیا جاتا تھا، سرجن کو سر اور چہرہ کے بال چھوٹے رکھنے پڑتے تھے، آپریشن کے وقت وہ بخور سے بسایا ہوا لباس پہنتا تھا، آپریشن سے پہلے مریض کو "سموہنی" سنگھائی جاتی تھی، چرک کی شان بقراطی سی تھی، سب سے پہلے معدنی ادویہ سے اسی نے کام لیا، بھپارہ ضیق النفس کے لئے دستورے کے سگریٹ، دانتوں کے لئے برش اور متعدد منجن اُس نے ایجاد کئے تھے، ہندوستان کے علم طب کا زوال برہمنوں کی تنگ دلی اور تنگ نظری سے ہوا، ان لوگوں نے اس علم کو بھی صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص و محفوظ کرکے سرجری کو ممنوع کر دیا، اور علاج میں منتروں تعویذوں کو داخل کیا، سرجری کی بربادی میں رہی سہی کسر کو بدھ مت نے پورا کر دیا، لیکن انھوں نے طب کی دوسری شاخ کی بڑی آبیاری کی، حفظان صحت پر خاص توجہ کی، انسانوں اور جانوروں کے لئے اسپتال قائم کئے، شاہراہوں

پر ہر دس موضعوں کے لئے ایک طبیب و دواخانہ کا اہتمام تھا، اشیاء خورد و نوش میں آمیزش کو جرم قرار دیا، جڑی بوٹی کے باغات لگائے،

یونان کی طب کو جب شمالی حملہ آوروں نے اس کی تمام دوسری اچھی چیزوں کے ساتھ برباد کر دیا، تو قدرت کی مرضی سے گویا ایک ... یہ پھر مصر و شام میں قائم ہوا، اندلس کے اسلامی دور میں قرطبہ نے کتنے مشہور طبیب پیدا کئے، الزہراوی، ابن زہر (Elne - ... Baja -) کا کیا مرتبہ تھا،

خلفاے عباسیہ کی توجہ نے اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا، رازی، علی عباس، اور ابن سینا اس دور کے آسمان طب کے درخشان ستارے تھے، ابن سینا کی ذات دسوین سے پندرہوین صدی تک کے دور میں عدیم النظیر تھی، جو بقراط کے بعد سب سے بڑا درجہ رکھتی ہے، عربوں نے مغرب کو ایک ہزار سال تک طب و دیگر علوم میں درس دیا ہے،

سعودی حکومت مین تعلیم کی رفتار

ہفتہ وار اخبار المدینۃ المنورہ نے وزیر تعلیم کی اطلاع کی بنا پر لکھا ہے، کہ حجاز میں سرکاری مدرسوں کی تعداد ۴۶ ہے، جن میں پانچ ہزار سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں، غیر سرکاری درسگاہین ۱۰ ہیں، جن میں پڑھنے والوں کی تعداد تین ہزار نو سو ستر سے زیادہ ہے، جدہ، مدینہ، طائف، اور ینبع کے سوا باقی تمام ملحق مدرسوں میں شروع سے پانچ سال تک کی تعلیم دی جاتی ہے، تمام ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں دینی علوم کے ساتھ جدید علوم بھی اسی طریقہ پر پڑھائے جاتے ہیں، جس طریقہ پر تمام ترقی یافتہ ملکوں میں پڑھایا جاتا ہے، حکومت عربوں سے جہالت کو دور کرنے کیلئے فوقانی تعلیم کو پھیلانے کی پوری جد و جہد کر رہی ہے،

سرکاری مدرسے | پایۂ تخت میں اس قسم کے بارہ مدرسے ہیں، (۱) مدرسہ تحضیر البعثات، (۲) معہد علمی سعودی، (۳) مدرسہ عزیزیہ ابتدائی، (۴) مدرسہ عزیزیہ فوقانی (۵) مدرسہ سعودیہ ابتدائی (۶) مدرسہ سعودیہ فوقانی، (۷) مدرسہ فیصلیہ ابتدائی (۸) مدرسہ فیصلیہ فوقانی (۹) مدرسہ رحمانیہ ابتدائی، (۱۰) مدرسہ رحمانیہ فوقانی، (۱۱) مدرسہ محمدیہ فوقانی، (۱۲) مدرسہ خالدیہ فوقانی،

ان سے ملحق مدرسے کل ۲۴ ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے، جدہ میں تین، دو فوقانی اور ایک ابتدائی، مدینہ میں تین دو فوقانی اور ایک ابتدائی، طائف میں دو، ایک فوقانی اور ایک ابتدائی، ینبع میں دو ایک فوقانی، دوسرا ابتدائی، وجہ، ضبا، املج، علا، تبوک، تنفذہ، جیزان، ینبع النخل، ابہا، صبیا، ابی عریش، بیشہ، ظفیرہ، رانغ میں ایک ایک فوقانی مدرسہ، نجد اور احسار میں نو مدرسے ہیں، جو کل کے کل فوقانی ہیں،

غیر سرکاری مدرسے | مدینہ میں اس قسم کے آٹھ مدرسے ہیں جن کے نام یہ ہیں، (۱) مدرسۃ العلوم الشرعیہ (۲) دار الایتام (۳) مدرسۃ النجاح (۴) مدرسۃ الترتبیۃ والتعلیم (۵) مدرسۃ الخیریہ، (۶) دار الحدیث (۷) مدرسۃ التہذیب، (۸) مدرسۃ القراۃ والتجوید، ان مدرسوں میں نو سو سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں،

مکہ میں دس مدرسے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:-

۱- مدرسۃ **الفلاح**، یہاں ابتدائی، ثانوی، فوقانی، تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے، طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ ہے،

۲- **مدرسۂ صولیتہ**، یہاں بھی تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ ہے،

۳- مدرسۃ **الفخریہ**، یہاں صرف ابتدائی اور فوقانی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد

چار سو سے کچھ زیادہ ہے،

۴- مدرستہ الترقی یہان بھی صرف ابتدائی اور فوقانی تعلیم ہوتی ہے، مگر طلبہ کی تعداد ایک سو بیس سے کچھ زیادہ ہے،

۵- مدرستہ الفائزین، صرف فوقانی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد دو سو سے کچھ اوپر ہے،

۶- مدرستہ العلوم الدینیہ، تعلیم فوقانی اور ابتدائی ہے، اور پانچسو سے کچھ زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں،

۷- مدرستہ النجاح، }
۸- مدرستہ التعاون } یہ دونون شبینہ مدرسے ہیں، جو ان پڑھ لوگوں کی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے ہیں، پہلے کی تعداد سو اور دوسرے کی پچاس ہے،

۹- مدرستہ الماحی، تعلیم فوقانی ہے، اور طلبہ کی تعداد سو ہے،

۱۰- مدرستہ الفلاح، یہ مدرسہ جدہ میں ہے، ابتدائی، ثانوی، فوقانی، تینون طرح کی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد چار سو ہے، "می"

معارف: اوپر جن غیر سرکاری مدرسوں کے نام لئے گئے ہیں، ان میں ایک خاص لحاظ سے قابل ذکر مکہ معظمہ کا مدرسہ صولتیہ اور مدرسہ فخریہ اور مدینہ منورہ کا مدرسہ شرعیہ ہے، یہ وہ مدرسے ہیں، جو ہندوستانی مسلمانوں کے چندوں سے قائم ہیں، اور اس سرزمین اقدس میں علم دین کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، مدرسہ صولتیہ پرانا مدرسہ ہے، جو بنگال کی صولت النساء بیگم کی یادگار اور مولینا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی کی ذات بابرکات کا فیض ہے، اور مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ میں شریف حسین کے آخر زمانہ میں مولینا سید احمد صاحب فیض آبادی کی مخلصانہ سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، اور بہت کچھ ہماری اعانتون کا محتاج ہے، صولتیہ اور مدرسہ شرعیہ کی اپنی پختہ سنگی عمارتیں ہیں،

موجودہ تمدن کے آثار کی حفاظت کا انتظام

جارجیا کے سائنس دانون کے سامنے آج کل ایک دلچسپ مسئلہ زیر غور ہے، وہ یہ کہ فرض کیجئے کہ ۸۱۱۳ء کا زمانہ ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ بیسوین صدی کے تمام تہذیب و نابود ہو جائینگے موٹر کار، ریل گاڑی، اور ہوائی جہاز کے موجودہ کل پرزون کا پتہ نہ رہے گا، آلات اوزار، ظروف کتب، رسائل اور اخبارات جو اس وقت موجود ہیں، ان کا نشان باقی نہ ہوگا، موجودہ انسانی معلومات کے تمام ذخیرے معدوم ہو جائیں گے، اس خیال کے پیش نظر جارجیا کے ماہرین آثار قدیمہ اور سائنسدانوں کی یہ کوشش ہے کہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے، کہ ۱۹۳۰ء کے علم و تمدن کی چیزین اس زمانہ میں بالکل صحیح و سالم اور مکمل ملیں، اس غرض کے حصول کے لئے اوگ لوتھوپ یونیورسٹی (جارجیا) میں ایک زمین دوز پتھر کا کمرہ بنایا گیا ہے، جس کی دیوارین کرومیم کی بنائی گئی ہین، اس کمرہ میں انسائیکلوپیڈیا، اسکول اور کالج کے نصاب کی کتابیں، ادب و تاریخ کے شاہکار، فلسفہ کے افکار عالیہ، سائنس کے تجربے، صنعت و حرفت کے نمونے، انجنیرنگ کے کمالات، سینما کے فلم، اور صنعتی مشینیں وغیرہ وغیرہ، رکھدی جائیں گی، تاکہ ۸۱۱۳ء کے مورخون کو ۱۹۳۰ء کے تمدن کا صحیح اندازہ ہو، ان چیزوں کو محفوظ کرنے کے بعد کمرہ کو نائٹروجن گیس سے بھر کر بند کر دیا جائے گا،

ان میں سے بعض چیزین عجیب و غریب طریقہ سے رکھی جائیں گی، مثلاً کتابون کے نسخے لوہے، تانبے اور نکل کے فلم پر اُتار لئے جائیں گے، اور ان پر پلاٹینم کی تہ لگادی جائے گی جس سے وہ خراب ہونے سے بالکل محفوظ ہو جائیں گے، سینما کے فلم شیشے کی ایک نلکی مین

بندکردو جائینگے جنمیں گیس بھری ہوگی، یہ شیشے کی نلکی ہزاروں من کے بوجھ سے دب کر بھی نہ ٹوٹ سکے گی، ممکن ہے اس وقت تک انگریزی زبان انقلابات عالم کے سبب سے بھلا دیجائے، اسلئے اس زبان کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک فلم پر انگریزی حروف لکھدیئے جائیں گے، اور اسی کے ساتھ ایک فونوگراف منسلک کر دیا جائے گا، تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگ انگریزی الفاظ کے تلفظ معلوم کرسکیں،

ممکن ہے کہ اتنی مدت کے بعد اس دفینہ کی صحیح جگہ کا پتہ چلانا مشکل ہوجائے، اس لئے اس مقام کی تفصیلات دنیا کے تمام بڑے بڑے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں محفوظ کردی جائینگی، چین، تبت اور ہندوستان کی خانقاہوں اور پرستش گاہوں میں بھی اس کی تفصیلات موجود رہیں گی، تاکہ لوگ اگر واقعی اس دفینہ کو بھول جائیں، تو دنیا کے کسی ایک گوشہ سے بھی اسکی جائے وقوع معلوم ہوسکے۔ "ص ع"

اخبار علمیہ

بوس انسٹیوٹ کے کارنامے

سرجے سی بوس ریسرچ انسٹیٹوٹ کے اکیسوین سالانہ کے جلسہ میں جو اسی مہینہ کلکتہ میں منعقد ہوا ہے، انسٹیٹوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی ایم بوس نے اس کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب تک اس ادارہ میں تحقیقات اس کے بانی ہی کے بتائے ہوئے اصولون پر ہوتی رہی ہیں یعنی زندگی کے مظاہر کا مطالعہ طبیعیاتی کیمیا کی جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اور اس کے نتائج کی عملی تطبیق زراعت اور طب کیساتھ کیجاتی ہے، پودون کے عضویات کا مطالعہ بھی حسب معمول جاری ہے، اور اس سلسلہ میں وہی آلات استعمال کئے جاتے ہین، جو اس ادارہ میں تیار کئے گئے ہیں، ان آلات سے بھی مدلیجاتی ہے، جو پودون کے عضویات کے ماہرین نے وقتاً فوقتاً ایجاد کئے ہیں، ایک نیا کام یہ شروع کیا گیا ہے، کہ پودون کے ہارمون کے اثرات ان کے نشوونما پر کیا ہوتے ہیں، (ہارمون وہ اندرونی افراز ہے، جو خون میں مل کر تحریک اعضاء کا باعث ہوتا ہے،) اس سلسلہ میں بعض دلچسپ معلومات حاصل ہو چکے ہین،

زراعتی مسائل کی بھی تحقیقات جاری ہے، چنانچہ گذشتہ چند سال کے اندر مختلف غذاؤں کی تِ نمو اور حیاتین سے متعلق بہت سی مفید باتین معلوم ہوئی ہیں، اس سال مٹی کی مختلف قسمون

کے حیاتیات جز تومی (Mohammad Zoology) پر بھی کام شروع کیا گیا ہے، علم الحیوانات کے شعبہ میں مختلف قسم کے مکڑوں اور چیونٹیوں کے عادات وخصائل پر مشاہدات ہوئے ہیں، بنگال کی مچھیوں کی تاریخ اور انکی خصوصیات پر بھی مطالعہ جاری ہے مچھلیوں کی نسلیں تیار کرنے کیلئے فانا کے بہت سے تالاب مصرف میں لائے جا رہے ہیں، اگر ممکن ہوا تو بڑے بڑے دریا کی مچھلیوں کا مطالعہ بھی جلد شروع کیا جائے گا،

علم الانسانیات کا بھی ایک چھوٹا سا شعبہ ہے، جہاں خون کی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اس شعبہ کے ایک رکن کو اس موضوع پر تحقیق کرنے کے لئے جرمنی سے ایک وظیفہ ملا ہے، چنانچہ وہ آج کل برلن میں پروفیسر ابوجن فشر کے معل میں اس تحقیق میں مصروف ہے،

ترکی زبان کی رفتار تجدید

گذشتہ چند سال کے اندر ترکی زبان میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے، وہ اس ملک کی کلچرل فتح وکامرانی کا ایک بہت بڑا ثبوت" بتایا جاتا ہے، اب سے چھ سال پہلے مصطفےٰ کمال نے زبان کو صاف اور پاکیزہ بنانے کا عزم کیا، اس وقت سے اب تک برابر اسکی کوششیں جاری ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ قومی کلچر کے دو ستون یعنی زبان اور تاریخ غیر ملکی عناصر کی آلائشون سے بالکل صاف ہو گئے ہیں، یونیورسٹی کے اساتذہ کی تحقیقات سے ترکی زبان کی بہت قدیم مخفی دولت کا اکتشاف ہوا ہے، اور وہاں کے ماہرین لسانیات کا دعویٰ ہے، کہ یہ دنیا کی تمام کلچرل زبانون کی ماں ہے،

زبان کے تمام اصلی اور ملکی الفاظ کی تلاش اور جستجو جاری ہے، غیر ملکی الفاظ خارج کئے جا رہے ہین، الفاظ کے تصنع اور نامناسب استعمال کو دور کیا جا رہا ہے، تحریر اور بول چال کی زبان کے فرق

کو مٹایا جارہا ہے، اسکول اور کالج کی کتابوں میں وہی اصطلاحات استعمال کیجاتی ہیں، جو خالصۃ ترکی اور ملکی ہیں، گذشتہ سال ریاضی، طبعیات، کیمیا، صنعت و حرفت، علم الحیات، علم الحیوانات اور معدنیات کے لئے چار ہزار اصطلاحات وضع کرکے کالجوں میں رائج کی گئی ہیں، امید کیجاتی ہے کہ آیندہ سال سائنس کی تمام اصطلاحات خالص ترکی زبان میں وضع کر لیجائیں گی، ایک ترکی ماہر زبان نے کہا ہے کہ ہم اپنی زبان کی تاریخ میں صرف وہی چیز تلاش کرتے ہیں، جو ہماری ہے، اور ہم کو اس کا احساس ہے کہ ترکی قومی زبان ہماری قوم کی تاریخ کا ایک غیر فانی نقش ہے۔"

کائناتی شعاعوں کا مطالعہ

واشنگٹن کے ماہرین طبعیات مسلسل چار مہینے سے اوپر ہوا کی بلندی میں غبارے بھیج رہے ہیں تاکہ کائناتی شعاعوں سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں، غباروں میں بازگار (Bazzoq zazhh) اور خود سے آواز دینے والا ریڈیو منسلک کردیتے ہیں جس سے ہر پندرہ سکنڈ پر آواز آتی رہتی ہے، اس آواز سے کائنات کی بلندی اور سختی کا اندازہ ہوتا ہے، چھ غبارے ... فٹ میل تک (۱۲۰،۰۰۰ فٹ) اوپر گئے اب تک اس سے اونچا کوئی اور غبارہ نہیں جاسکا ہے، زیادہ سے زیادہ ۹۰،۰۰۰ فیٹ اوپر تک غبارے جا سکے ہیں،

اس تحقیقات سے یہ پتہ چلا ہے، کہ ۱۲ میل اوپر کائنات کی شعاعیں دبیز ہوتی ہیں، اور اسکی سختی سمندر کی سطح کی سختی سے ۲۰۰ زیادہ ہوتی ہے، بارہ میل اوپر ابتدائی شعاعیں ہوا کے سالمے سے متصادم ہوکر ثانوی شعاعوں سے ملجاتی ہیں، اس کے اوپر ہوا کی دبازت اس قدر کم ہوجاتی ہے کہ ثانوی شعاعیں اس سے علحدہ ہوجاتی ہیں، بارہویں میل سے نیچے ہوا کی دبازت کم ہوتی جاتی ہے کیونکہ ابتدائی شعاعیں فضا کی مقاومت میں جذب ہوتی رہتی ہیں،

"ص،ع"

ادبیات

ماتمِ کمال

از یحییٰ اعظمی

اے ترک اے مجاہدِ اسلام اے کمال — ماتم میں سرنگوں ہے ترے پرچمِ ہلال
مرنا ترا قیامتِ کبریٰ سے کم نہیں — لیکر عرب سے تا بہ عجم غم سے ہے نڈھال
سارے جہاں میں ہے صفِ ماتم بچھی ہوئی — سب کو کمال غم ہے کہ یہ ہے "غمِ کمال"
ہستی تری تھی شرق کی وہ تیغِ آبدار — حملوں سے جس کے عرصۂ مغرب تھا پایمال
بازو ترے تھے حاملِ سیف ید اللّٰہی — زندہ تھی تجھ سے خالدِ جانباز کی مثال
دی جس میں شاطرانِ زمانہ کو تو نے مات — دنیا کو یاد ہے وہ تری بازیٔ قتال
پرشور تجھ سے مشرق و مغرب کی وادیاں — پہنچا تھا چار سو ترا آوازۂ جلال
کھینچا ہے تیری تیغ نے جو نقشِ زندگی — اس کو مٹا سکے یہ زمانہ کی کیا مجال
وہ قوم جس پہ ملتِ مردہ کا تھا گماں — بخشی ترے نفس نے اسے روحِ لازوال
اللہ ری بہار کی معجز نمائیاں — اجڑے چمن کو از سرِ نو کر دیا نہال
سچ یہ ہے تیرے عہد نے پھر تازہ کر دیا — ترکوں کی سلطنت کی جوانی کا وہ جمال

اے غازیِ یگانۂ دیں اے فقیدِ شرق
دیکھے گی اب نہ چشمِ زمانہ تری مثال

قطعہ تاریخ وفات مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک مرحوم صدر جمہوریہ ٹرکی

از مولینا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب اختر مدرس اعلیٰ مدرسہ مفتاح العلوم ، مئو،

مرحوم مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کی وفات کی تاریخیں اخباروں میں بہت سی چھپی ہیں، اور چھپینگی، مگر حسب ذیل قطعہ اپنی جگہ پر خاص حیثیت رکھتا ہے، "معارف"

صدر جمہوریۂ سلطنت ترکیہ   کہ درین دور بسے بود ز اعیانِ رجال
اختر غمزدہ تاریخ وفاتش می جست   آمد از غیب ندا، مُرد اتاترک کمال
۱۳۵۷ھ

فضائے عرفانی

از مرزا عزیز فیضانی

پیر میخانہ کو ہے کام سے کام اے ساقی   بزم رندان کا ہے اب کام تمام اے ساقی
میکدہ کا ہے پراگندہ نظام اے ساقی   صف رندان کا نہیں کوئی امام اے ساقی
بندۂ حق ہے زمانہ کا غلام اے ساقی   بھول بیٹھا ہے وہ خود اپنا مقام اے ساقی
عشق کی خیر عجب حال ہے اب کیا کہئے   دل ہے سینے میں کہ بے بادہ ہی جام اے ساقی
وقت آیا ہے کہ پینا تو رہا ایک طرف   ہوگیا مست پہ جینا بھی حرام اے ساقی
کچھ غرض کیف سے ہے مجھکو نہ جام مے سے   میکدے میں ہے مجھے تجھ سے ہی کام اے ساقی
جلوہ دکھلا نہ بجھایا ہے چراغ دل کو   اس زمانہ کی ہوا نے سرِ شام اے ساقی
مدعی یوں تو ہیں محفل میں ہزار وں تجھ بن   یہ مگر اور کسی کا نہیں کام اے ساقی
خود فراموشی و خاموشی و راحت کوشی   یہی رندی ہے تو رندی کو سلام اے ساقی
وہ پلا جس میں ہو مستی کے عوض جوشِ عمل   شورِ قلقل بھی عمل کا ہو پیام اے ساقی

باب التقریظ والانتقاد

فہرست مخطوطات عربی جلد دوم

کتبخانہ انڈیا آفس لنڈن

انڈیا آفس لنڈن کی قلمی عربی کتابون کی یہ دوسری جلد ۱۹۳۶ء میں چھپ کر نکلی ہے، اسمیں صرف اخلاق اور تصوف کی کتابوں کا ذکر ہے، بڑے سائز کے سو صفحوں میں ص، ۹ سے شروع ہو کر ۱۹۸ پر ختم ہوئی ہے، نمبر ۱۲۱۸ سے شروع ہوتی ہے، اور نمبر ۱۴۲۱ پر ختم ہوتی ہے یعنی اس میں تصوف واخلاق کی ۳۰۰ کتابوں اور رسالوں کا بیان ہے، اس ذخیرہ کا بڑا حصہ ہندوستان سے گیا ہوا معلوم ہوتا ہے، ان کتابوں اور رسالوں میں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصنیفات کی تعداد بہت اچھی خاصی ہے، ہندوستان کے صوفیوں کی لکھی ہوئی چند کتابیں ہیں، خصوصاً شیخ وجیہ الدین گجراتی، مخدوم مہائمی اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کی ایک کتاب پھلواری (بہار) کے ایک بزرگ مولینا امر اللہ کی بھی ہے، جو بارہویں صدی ہجری میں تھے،

اس فہرست کے مؤلف کتبخانہ مذکور کے نائب ناظم مسٹر اے، جے، آربری ایم اے (ڈی. لٹ) ([illegible]) ہیں موصوف نے یہ فہرست محنت اور کوشش سے تیار کی ہے، نامعلوم مصنفون کی تلاش اور کتابوں کی تطبیق میں پوری جد وجہد کی ہے، اور پیش نظر معلومات سے ہر طرح فائدہ اٹھایا ہے،

اس فہرست میں بعض نایاب کتابوں اور رسالوں کے نام ملتے ہیں، ابن تیمیہ کا ایک رسالہ

"قرب العبد الی الرب و قرب الرب الی العبد" ہے جسمیں اس مشکل کو حل کیا ہی کہ "استوا علی العرش" کے ساتھ قرب عبد کی گتھی کیسے سلجھ سکتی ہی، یہ رسالہ چھپا نہیں اور نہ کسی اور کتبخانہ کی فہرست میں نظر آتا ہی، شیخ اکبر کے جو رسائل اسمیں ہیں انکی فہرست یہ ہے،

۱- العبادلہ ۱۲۶۱ (نمبر کتبخانہ) (۲) ایام الشان ۱۲۶۲، (۳) الامر المحکم المربوط فیما یلزم اہل طریق اللہ من الشروط ۱۲۶۳، (۴) عنقاء مغرب فی معرفۃ ختم الاولیاء و شمس المغرب ۱۲۶۴، (۵) اسرار الخلوۃ ۱۲۶۶، (۶) الفناء فی المشاہدہ ۱۲۶۹، (۷) فی الازل ۱۲۷۰، (۸) فیما لا یعول علیہ فیما یعول علیہ ۱۲۷۱، (۹) فصوص الحکم فی خصوص الکلم ۱۲۷۲، (۱۰) النصف الاول من الفتوحات المکیۃ ۱۲۸۰، (۱۱) حلیۃ الابدال ۱۲۸۹، (۱۲) الاعلام باشارات اہل الالہام ۱۲۹۰، (۱۳) انشاء الدوائر ۱۲۹۱، (۱۴) الاسرار الی مقام الاسرار ۱۲۹۲، (۱۵) الجلال والجمال ۱۲۹۳، (۱۶) رسالہ کنہ ما لا بد منہ ۱۲۹۴، (۱۷) ماہیۃ القلب ۱۲۹۵، (۱۸) مقام القربۃ ۱۲۹۶، (۱۹) المعرفۃ ۱۲۹۷، (۲۰) مواقع النجوم ۱۲۹۸، (۲۱) المیم والواو والنون ۱۲۹۹، (۲۲) نسبۃ الخرقۃ ۱۳۰۰، (۲۳) الرسالۃ البرزخیہ ۱۳۰۱، (۲۴) رسالۃ الغوثیہ ۱۳۰۲، (۲۵) اسرار الشجرۃ النعمانیہ ۱۳۰۳، (۲۶) شفاء العلیل ۱۳۱۰، (۲۷) شجون المشجون ۱۳۱۱، (۲۸) التدبیرات الالہیہ ۱۳۱۳، (۲۹) تذکرۃ الخواص وعقیدۃ اہل الاختصاص ۱۳۱۴، (۳۰) التجلیات الالہیہ ۱۳۱۶، (۳۱) عقلۃ المستوفز ۱۳۱۷، (۳۲) وصیۃ ۱۳۱۸، (۳۳) الیاء وہو کتاب الھو ۱۳۱۹، (۳۴) کتاب نامعلوم الاسم ۱۳۲۰، (۳۵) لطائف الاعلام فی اشارات اہل الالہام ۱۳۲۱،

نمبر ۲۷ پر جو رسالہ شجون المشجون نام کا ہی اسمیں تین کتابوں کے حوالے آئے ہیں الملخص منظفر بن سنان فی الرد علی الفلاسفہ، رسائل اخوان الصفا، اور املاء شیخ علاء الدین الوراق، پہلے سے کتاب الرد علی الفلاسفہ کی فہرست میں ایک نئے نام کا اضافہ ہوا، دوسری یہ معلوم ہوا کہ شیخ کے مطالعہ میں رسائل اخوان الصفا رہی ہیں اسکا نسخہ آصفیہ میں بھی ہی،

شیخ وجیہ الدین گجراتی کی الحقیقۃ المحمدیہ کی ایک شرح الافاضات الاحمدیہ فی شرح الحقیقۃ المحمدیہ ہی، آربری صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب کسی اور کتب خانہ کی فہرست میں درج نہیں حالانکہ یہ کتبخانہ آصفیہ کی فہرست میں درج ہے، (جلد اول صفحہ ۴۶۰ نمبر ۹ تصوف عربی) کتاب میں اسکے مصنف کا نام محمد دائم بن سید مرزا بن کریم اللہ الحسینی ہی،

آربری صاحب کو اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکا، مگر کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں بتایا گیا ہے، کہ یہ مانڈو کے رہنے والے تھے، جو ہندوستان میں صوبہ مالوہ کا مشہور شہر تھا،

صفہ ۱۹۱ پر شیخ حسن محمد بن میانجیو کے دو رسالوں کا ذکر ہے، ایک من عرف اللہ کل لسانہ اور دوسرا رسالہ فی بیان الجہاد الاکبر شیخ حسن محمد بن میانجیو بن شیخ نصیر الدین بن شیخ سراج الدین بن علامہ کمال الدین ۔۔۔ یہ شیخ جمال الدین مشہور بہ شیخ جمن کے تھے اور وہ شیخ محمود مشہور بہ شیخ راجن کے، اور وہ شیخ علم الدین کے اور وہ حضرت شیخ محمود نصیر الدین چراغ دہلی اودھی متوفی ۷۵۷ھ کے تھے، شیخ حسن محمد نے ۹۸۲ھ میں وفات پائی، احمد آباد میں مزار ہے، (خزینۃ الاصفیاء ص ۴۴۳)

پہلے رسالہ میں جس کا آغاز مؤلف فہرست نے نقل کیا ہے یہ عبارت ہے، فیقول العبد۔۔۔۔ محمد بن قطب الاولیاء شیخ الاتقیاء۔۔۔۔ محمد بن نصر المعروف بشیخ حسن بن محمد بن میانجیو۔۔۔۔ المستفیض المستفیض ظاھرا و باطنا من شیخہ و خالہ الشیخ نصر الحق والدین محمود الاودھی چراغ دھلی ۔۔۔۔انی کنت عند شیخی رضی اللہ عنہ،

مؤلف فہرست کی عبارت میں کئی سقم ہیں، ایک تو نصیر کو اصل عربی اور انگریزی دونوں میں "نصر" لکھا اور نقل کیا ہے، دوسرے یہ کہ شیخ حسن کو حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کا مرید عربی کی عبارت بالا سے سمجھا اور لکھا ہے، حالانکہ ان دونوں کے زمانوں میں صدیوں کا فصل ہے "المستفیض" صفت اس آخری نام کی ہوگی، جہاں نقطے دیئے گئے ہیں، نہ کہ شیخ حسن کی، وہ نام غالباً علامہ کمال الدین کا ہے، جو حضرت نصیر چراغ دہلی کے بھانجے اور مرید تھے، ۷۵۶ھ میں وفات پائی، (خزینۃ الاصفیاء ص ۳۵۳) جسکی تائید اس رسالہ کے دیباچۂ مذکور سے بھی ہوتی ہے، مؤلف فہرست نے الورڈٹ (AHLWARDT) سے شیخ حسن کا زمانہ ۱۰۰۰ھ نقل کیا ہے، اور بروکلمن سے ۱۱۰۰ھ اور صحیح طور سے بروکلمن کے بیان کو اس لئے غلط کہا گیا ہے، کہ شیخ حسن کا دوسرا رسالہ

جو کتب خانہ میں موجود ہے، ۱۲۰۰ھ کا نقل کیا ہوا ہے، ہمارے بیان سے معلوم ہو چکا کہ شیخ حسن کی وفات ۸۹۰ھ میں ہوئی ہے،

فہرست کے نمبر ۱۴۱۴ و نمبر ۱۴۱۵ کے بیان میں ایک تعجب انگیز غلطی ہے، نمبر ۱۴۱۴ الارشاد فی سلوک الطریق والوصول الی علم السداد کے مصنف کا نام و نشان اس کے بالائی صفحہ پر شاہ عبد الرسول انبالوی لکھا ہوا ہے، مؤلف فہرست نے اس کو نمبر ۱۴۱۵ "تبصرۃ" نام کتاب کے مصنف عبد الرسول بن محمد خان البیجاپوری سے مطابق کیا ہے، اور دونوں کو ایک بتانا چاہا ہے، حالانکہ ایک کا وطن انبالہ صوبہ پنجاب ہے، اور دوسرا اپنا وطن بیجاپور دکن (بمبئی) بتاتا ہے، ان دونوں کے بیچ میں ہزار میل کے قریب کا فصل ہے،

نمبر ۱۴۲۳ پر کتاب تحلیل معضلات ابن العربی کا نام ہے، اس کے مصنف کا نام امر اللہ بن منیر اللہ محمد الطیّار ی[1] بطناً پھلواری البہاری وطناً ہے، بہاری کو جو صوبہ بہار (بالکسر) کی طرف منسوب ہے، مؤلف فہرست نے بَہاری (بالفتح) Bahar پڑھا اور لکھا ہے، جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں، پھلواری صوبہ بہار کا مشہور علمی و مذہبی قصبہ ہے، جہاں کی خاک سے بہت سے اہل فضل اور اہل دل اٹھے ہیں، ملا امراللہ بن منیر اللہ حضرات سجادہ نشینان خانقاہ مجیبی پھلواری کے مورث اعلیٰ حضرت تاج العارفین مولانا مجیب اللہ المتوفی ۱۱۹۱ھ کے چچازاد بھائی تھے، دہلی میں تعلیم پائی، وہیں رہے، وہیں ۲۰ محرم ۱۱۳۳ھ میں وفات پائی، شاہ ولی اللہ صاحب کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیم صاحب کے معاصر تھے، شاہ عبد الرحیم صاحب نے اپنے ملفوظات میں ان کا ذکر کیا ہے،

"س"

---

[1] جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت، س

مطبوعاتِ جدیدہ

اسلام اور موجودہ تمدنی مسائل، از مولینا ابو البرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری تقطیع بڑی، ضخامت ۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :۔ ۸/

پتہ :۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

مولینا نے عنوانِ بالا سے جامعہ ملیہ میں ایک توسیعی خطبہ دیا تھا، جس میں اسلامی عقائد، عبادات، معاملات اور دوسری اسلامی تعلیمات پر متکلمانہ تبصرہ کرکے دکھایا ہے، کہ موجودہ تمدنی نظام کے مقابلہ میں ان کا کیا درجہ ہے، اس میں ایک اصولی بحث یہ کی گئی ہے، کہ انسانی عقل اور عقلی علوم جن کو انکشافِ حقائق کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، وہ خود ناقص ہیں، اور ان کے نتائج کی صحت یقینی نہیں ہے، اور وہ باہم مختلف اور متناقض ہوتے ہیں، پھر انسانی عقلیں باہم متفاوت ہیں، اور ان کا ادراک محسوسات و مادیات تک محدود ہے، وہ مذہب کی مابعدالطبعی تعلیمات اور روحانی حقائق کا ادراک نہیں کرسکتیں، اسلئے مذہبی حقائق میں انھیں معیار نہیں بنایا جاسکتا، اس کے رمزشناس صرف انبیاء علیہم السلام ہیں، انکی تعلیمات کے ادراک وعرفان کا وسیلہ روحانی قوی اور ایمان کا ذوق ووجدان ہے، معجزہ دلیل نبوت ہے، اس میں کوئی عقلی استحالہ نہیں، غیر نبی سے خرقِ عادت کا ظہور نہیں ہوسکتا، شعبدہ صرف بازیگری ہے، اسکے بعد مطلق مذہب کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات اور ان کے فلسفہ کو پیش کرکے ان کے احکام وعبادات کے اختلاف کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے، پھر معاملات میں اسلامی نظامِ حکومت انسانی حقوق و فرائض، اقتصادیات، سرمایہ داری، غربت اور غلامی وغیرہ کے متعلق اسلامی تعلیمات

کا موجودہ نظام سے موازنہ کرکے دکھایا گیا ہے، کہ دنیا کی فلاح کے لئے اسلامی تعلیمات ہی مفید ہیں، آخر میں شرعی علوم کی تاریخ پر تبصرہ ہے، کہ انھیں کس طرح صحابہ کرام نے رسول اللہ صلعم سے حاصل کیا، کس احتیاط کیساتھ تابعینؓ کو اور انھوں نے تبع تابعینؒ کو پہنچایا، مدینہ اور کوفہ کے علما نے مذہبی علوم کی کیا خدمت کی، سلف صالحین اور محدثین نے اسکے تحفظ میں کتنی احتیاط برتی، محدثین اور فقہا میں کس طرح اختلاف کا آغاز ہوا، اس اختلاف کی حیثیت کیا ہے، پھر کس طرح عقائد میں موشگافیاں پیدا ہوئیں، اور انھوں نے معتزلہ خوارج قدریہ اور جبریہ وغیرہ مختلف فرقے پیدا کئے، اس ضمن میں تیسری صدی ہجری تک کے بعض بڑے اسلامی فرقوں، ان کے بانیوں، ان کے عقائد، اور اس سلسلہ کے پیش آمدہ واقعات کے اجمالی حالات ہیں، یہ کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، اس کے وہ مباحث جن کا تعلق اسلام کے مادی نظام سے ہے دلنشیں ہیں، لیکن مذہب کی مابعد الطبعی تعلیمات اور فلسفیانہ مسائل کی بحثیں آجکل کے ذوق کی تشفی کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ ان کی بنیاد تمامتر پرانے فلسفہ پر ہے جسکی اس زمانہ میں کوئی قیمت نہیں،

بغداد عہدِ عباسیہ میں، مولفہ جناب عثمان علی مرزا صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۴ صفحے۔ کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت ۸؍ غلام دستگیر تاجر کتب گلزار حوض حیدرآباد دکن،

جیسا کہ اس رسالہ کے نام سے ظاہر ہے، اس میں عباسی عہد کے بغداد کی علمی، تعلیمی، تعمیری، صنعتی، تجارتی، جملہ تمدنی ترقیوں کے مختصر حالات دکھائے گئے ہیں، یہ حالات اردو کی بہت سی تصانیف اور ترجمہ شدہ کتابوں میں ہیں، لائق مرتب نے ان کو حسن کر سلیقہ کیساتھ اس کتاب میں جمع کردیا ہے، اردو کتابوں کے علاوہ بعض انگریزی اور عربی کتابوں سے بھی مدد لیگئی ہے، رسالہ دلچسپ اور مفید ہے،

جامِ طہور، جناب اثر صہبائی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۱ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ تاج کمپنی لیمٹڈ، لاہور،

جناب اثر صہبائی کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں، ان کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ارباب ذوق ان سے آشنا ہیں "جام طہور" ان کی رباعیات کا تازہ مجموعہ ہے، گو صہبائی صاحب ہر صنف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن حقیقۃً اور فطرۃً وہ رباعی گو ہیں، اور اس میں بہت زیادہ کامیاب ہیں، ان کی شاعری پر اردو فارسی اور انگریزی کے مختلف شعراء کا اثر پڑا ہے، اسلئے ان کے خیالات میں تنوع اور رنگا رنگی زیادہ ہے، رباعیات میں بھی یہ تنوع نمایاں ہے، ان میں عرفان و حکمت کے موتی بھی ہیں، اخلاق و موعظت کے درس بھی، باغ و بہار کی رنگینی بھی ہے، اور بادہ و ساغر کی مستی بھی، غرض اس جام طہور میں ہر رنگ اور ہر مزہ کی شراب موجود ہے، ابتدا میں وہ زبان کی صحت کا اہتمام نہیں کرتے تھے اس لئے [illegible] سے ان کے کلام میں بعض فروگذاشتیں نظر آتی تھیں لیکن مشق و مہارت کے ساتھ ساتھ زبان میں سادگی اور صفائی آتی جاتی ہے، یہ مجموعہ ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے مزین ہے، ارباب ذوق کو اس سے لطف اٹھانا چاہئے،

یادگار محشر، عبید اللہ محشر تیمی مرحوم، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت اور پتہ مرقوم نہیں۔

عبید اللہ تیمی مرحوم بستی کے ایک نوخیز اور ہونہار شاعر تھے، ابھی وہ اتنے نوعمر تھے کہ لوگ اُن سے واقف بھی نہ تھے لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شاعری کی فطری صلاحیت تھی، اگر وہ زندہ رہتے، تو ایک دن یقیناً ان کا شمار اچھے شعراء میں ہوتا لیکن افسوس ہے کہ موت نے اس ہونہار شاعر کو اس کا موقع نہ دیا، یادگار محشر مرحوم کے کلام کا مختصر مجموعہ ہے، ابتدا میں ان سے اور ان کی شاعری سے متعلق ان کے احباب بزرگوں اور جاننے والوں کی تحریریں ہیں، جن میں بعض ادیبوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔

"م"

سیر الصحابہ

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانون کیلئے جن مقدس ہستیون کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدین احادیث و سیر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کین، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفون کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی مین چلین، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدون کی علحدہ علحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ ۲۷ عہ؍ ہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف ۲۰ عنہ؍ میں یہ دس جلدیں کامل نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول	خلفاے راشدینؓ	سے؍	جلد ششم	سیر الصحابہؓ ششم	عہ؍
جلد دوم	مہاجرینؓ، اول	سہ؍	جلد ہفتم	سیر الصحابہؓ ہفتم	عہ؍
جلد سوم	مہاجرینؓ دوم	سے؍	جلد ہشتم	سیر الصحابیاتؓ	عہ؍
جلد چہارم	سیر الانصارؓ اول	سے؍	جلد نہم	اسوۂ صحابہؓ اول	عہ؍
جلد پنجم	سیر الانصارؓ دوم	عہ؍	جلد دہم	اسوۂ صحابہؓ دوم	سہ؍

منیجر

دار المصنفین اعظم گڈھ

(مطبع معارف میں محمد اویس وارثی نے چھاپکر شایع کیا)